آپ نے پوچھا

سوالنامے، انٹرویوز، مراسلے

ابو عمار زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آپ نے پوچھا

سوالنامے، انٹرویوز، مراسلے

ابو عمار زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی
گوجرانوالہ، پاکستان
www.alsharia.org

جملہ حقوق محفوظ!

عنوان	:	آپ نے پوچھا (سوالنامے،انٹرویوز،مراسلے)
تالیف	:	ابوعمار زاہد الراشدی
مرتب	:	ناصرالدین خان عامر
ناشر	:	الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ
اشاعت	:	جولائی ۲۰۲۳ء

فہرست

پیش لفظ		۱۳
جمعیت علماء اسلام اور قومی سیاست	(مئی ۱۹۷۹ء)	۱۵
- تعارف از جناب الطاف حسین		۱۵
- سوالات و جوابات		۱۶
ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور	(نومبر ۱۹۸۳ء)	۲۴
- وحی الٰہی کی قسمیں		۲۴
- اجتہاد کی حدود و شرائط		۲۵
- عقیدۂ توحید و تقدیر		۲۵
- نماز، روزہ، زکوٰۃ		۲۸
- اسلام اور جمہوریت		۳۰
- اسلام اور علاقائی ثقافتیں		۳۲
- نجی ملکیت اور معاشی مساوات		۳۴
قادیانیت اور ''انٹرنیشنل تحفظ ختم نبوت مشن''	(اکتوبر ۱۹۸۵ء)	۳۶
''شریعت بل'' کے حوالے سے چند سوالات	(نومبر ۱۹۸۶ء)	۴۴
ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ	(جنوری ۱۹۹۰ء)	۵۲
- عالیجاہ محمد کون تھا؟		۵۲
- اسلامی نظام میں نمائندگی کا تصور کیا ہے؟		۵۳
- جمعیۃ العلماء ہند کب وجود میں آئی؟		۵۴
- بنیاد پرست مسلمان کون ہیں؟		۵۵
ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ	(فروری ۱۹۹۰ء)	۵۶

- اشتراکیت کا فلسفہ کیا ہے؟ ۵۶
- ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ اور معراجِ جسمانی ۵۶
- ربوہ کا معنٰی کیا ہے؟ ۵۷
- قیامِ پاکستان اور جمعیت علماء اسلام ۵۸

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ (مارچ ۱۹۹۰ء) ۵۹
- اسلام میں معاشی مساوات کا تصور ۵۹
- دینی مدارس کا نصاب اور اکابر کا طرزِ عمل ۶۱

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ (اپریل ۱۹۹۰ء) ۶۳
- شرعی مہر ۳۲ روپے؟ ۶۳
- تیتو میر کون تھے؟ ۶۴
- فئی اور غنیمت کا فرق؟ ۶۵

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ (مئی ۱۹۹۰ء) ۶۶
- مروجہ جمہوریت اور اسلام ۶۶
- نواب سراج الدولہؒ کون تھے؟ ۶۷
- حجِ بدل کون کرے؟ ۶۸

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ (جون ۱۹۹۰ء) ۶۹
- حضرت سعد بن عبادہؓ اور بیعت سیدنا صدیق اکبرؓ ۶۹
- سر سید احمد خان اور جہادِ آزادی ۷۰
- نشہ کی حالت میں مرنے والے کا جنازہ ۷۱

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ (جولائی ۱۹۹۰ء) ۷۳
- قادیانی اور مسئلہ کشمیر ۷۳
- خارجی گروہ کب پیدا ہوا؟ ۷۴
- متعہ کا مسئلہ اور امام مالکؒ ۷۵

- بے نماز کی قربانی ۷۵

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ (اگست ۱۹۹۰ء) ۷۶

- کیا امام اعظم ابوحنیفہؒ کا تعلق مرجئہ سے تھا؟ ۷۶
- معرکہ ۱۸۵۷ء اور بہادر شاہ ظفرؒ ۷۷
- کیا علماء دیوبند نے انگریزی سیکھنے کو حرام قرار دیا تھا؟ ۷۸

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ (ستمبر ۱۹۹۰ء) ۷۹

- کیا حضرت عمرؓ نے احادیث بیان کرنے سے منع فرمایا تھا؟ ۷۹
- امام ابن حجرؒ کون تھے؟ ۸۰
- جاحظیہ کون تھے؟ ۸۱
- لفظ ''فارقلیط'' کیا ہے؟ ۸۲

قومی تعلیمی کمیشن کا سوالنامہ (جنوری ۱۹۹۲ء) ۸۳

- سوالنامہ ۸۳
- جوابات ۸۴

مائیکل اسکاٹ سے چند باتیں (اپریل ۱۹۹۹ء) ۸۹

- عالم اسلام اور مغرب کی کشمکش کے محرکات ۸۹
- عالمی تہذیبی کشمکش میں کمی کے امکانات ۹۱
- کوسووو کے معاملے میں امریکی کردار ۹۲
- اسامہ بن لادن کی جدوجہد ۹۳
- نفاذِ اسلام کی اسلامی تحریکات ۹۴
- عالمی ذرائع ابلاغ کا جانبدارانہ طرز عمل ۹۶

جہادِ افغانستان میں امریکہ کا کردار (جنوری ۲۰۰۱ء) ۹۷

سانحہ گیارہ ستمبر اور افغانستان کی صورتحال (نومبر ۲۰۰۱ء) ۱۰۱

- اے آر وائی ڈیجیٹل کا پینل انٹرویو ۱۰۱

اسامہ بن لادن اور ان کی جدوجہد	(جنوری ۲۰۰۲ء)	۱۰۵
- گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کا سانحہ		۱۰۵
- طالبان حکومت کا خاتمہ		۱۰۸
- افغانستان کا متوقع مستقبل		۱۱۰
- مسلم حکومتوں کا کردار		۱۱۱
- اسلامی تحریکات کے لیے لائحہ عمل		۱۱۱
- فدائی حملے		۱۱۳
- مسئلہ کشمیر اور فلسطین		۱۱۳
''دہشت گردی'': اسلامی نظریاتی کونسل کا سوالنامہ	(اکتوبر ۲۰۰۲ء)	۱۱۴
- سوالنامہ		۱۱۴
- جواب		۱۱۵
- اسلامی نقطۂ نظر سے دہشت گردی کی تعریف		۱۲۰
- ریاستی ظلم وجبر		۱۲۱
- مظلوم رعایا کی جدوجہد		۱۲۱
- غیر متعلقہ لوگوں پر ظلم		۱۲۲
- غیر مسلموں کی شہری آزادی		۱۲۳
- انسدادِ دہشت گردی کے لیے اسلامی ہدایات		۱۲۴
- جان ومال وآبرو کے تحفظ کی شرعی حیثیت		۱۲۵
متحدہ مجلس عمل کی الیکشن ۲۰۰۲ء میں کامیابی	(دسمبر ۲۰۰۲ء)	۱۲۷
- آپ کے تاثرات؟		۱۲۷
- قومی سیاست کے حوالے سے توقعات		۱۲۷
صدر پرویز مشرف کے دس سوالات کا جائزہ		۱۳۰
- افغانستان کی جنگوں میں پاکستانیوں کی شرکت		۱۳۰

- پاکستان بطور ایک نظریاتی ریاست ۱۳۱
- مذہبی تعلیم اور حکومتی نظام ۱۳۲
- پاکستان بطور ایک ترقی پسند رفاہی ریاست ۱۳۲
- انتہا پسند اور افغانستان کی تعمیر نو ۱۳۳
- اسلام نفرتیں سکھاتا ہے؟ ۱۳۳
- تبلیغِ اسلام بذریعہ کردار ۱۳۳
- جہالت، پسماندگی اور بھوک کے خلاف جہاد ۱۳۴

جدید معاشرے میں مذہبی طبقات کا کردار (جولائی ۲۰۰۴ء) ۱۳۵
- ولادت و تعلیم ۱۳۵
- دینی وسیاسی و معاشرتی مصروفیات ۱۳۶
- دینی مدارس کا نظامِ تعلیم ۱۳۶
- دینی مدارس اور بین المسالک معاملات ۱۳۸
- بیرونی امداد کا کردار ۱۳۸
- شیعہ کی تکفیر کا معاملہ ۱۳۹
- غیر مسلموں سے تعلقات اور بین المذاہب مکالمہ ۱۳۹

ماہنامہ آبِ حیات، لاہور (جنوری ۲۰۰۵ء) ۱۴۱
- خاندانی پس منظر ۱۴۱
- دینی و دنیاوی تعلیم ۱۴۱
- عملی زندگی کا آغاز ۱۴۲
- دینی و معاشرتی مصروفیات ۱۴۲
- جماعتوں اور تحریکوں میں کردار ۱۴۴
- پاکستان شریعت کونسل کے اغراض و مقاصد ۱۴۵
- قید و بند کے مراحل ۱۴۶

- دینی مدارس کا نظامِ تعلیم ۱۴۶
- عصری نظامِ تعلیم کا رُخ ۱۴۷
- پاکستان کی سیاسی صورتحال ۱۴۷
- امریکہ کا سانحہ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء ۱۴۸
- تہذیبی جنگ اور اقوامِ متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر ۱۴۹
- مسلمانوں کے زوال کے اسباب ۱۵۰
- پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ ۱۵۱
- موجودہ دور کی تحدّیات اور علماء کرام ۱۵۱
- ذرائع ابلاغ کی ضرورت واہمیت ۱۵۲
- ''آبِ حیات'': رائے اور پیغام ۱۵۲

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ، لاہور (دسمبر ۲۰۰۷ء) ۱۵۴
- پیش لفظ از پروفیسر خالد ہمایوں ۱۵۴
- خاندانی پس منظر ۱۵۴
- تعلیمی وتربیتی مرحلہ ۱۵۸
- صحافت اور تدریس کا آغاز ۱۶۲
- عالمی نظام پر نقطۂ نظر ۱۶۷
- قومی سیاست اور تحریکات میں کردار ۱۷۲
- علمی وفکری اور تعلیمی ونظریاتی جدوجہد ۱۸۴

اسلام اور شہری حقوق وفرائض: ۱۹۳
غیر مسلم معاشرے کے تناظر میں (جولائی ۲۰۰۸ء)
- جمہوریت اور انصاف ۱۹۳
- حقوق اور فرائض ۲۰۴
- تشخص اور تنوع ۲۰۶

- جستجو، تنقیدی غور و فکر اور اختلاف رائے ۲۱۵
- درست معلومات پر مبنی اور ذمہ دارانہ عملی اقدام ۲۱۸
خودکش حملے: کیپیٹل ٹاک کے سوالات (نومبر ۲۰۰۸ء) ۲۱۹
مذہبی طبقات، دہشت گردی، طالبان (نومبر ۲۰۰۹ء) ۲۲۲
- طالبان طرز کے گروپ اور موجودہ کشمکش کا پس منظر ۲۲۲
- دینی مدارس اور انتہا پسند تنظیمیں ۲۳۰
- دینی مدارس اور بین المسالک کشمکش ۲۳۱
- قومی وملی مسائل اور اغیار کی سازشیں ۲۳۲
- کیا تمام غیر مسلم اسلام دشمن ہیں؟ ۲۳۴
- دعوت کا فریضہ: دہشت گردی اور تنفر کی فضا میں ۲۳۵
- نفاذِ شریعت بذریعہ حکومت کے مسائل ۲۳۸
- منصوص شرعی احکام اور فقہی اجتہادات ۲۴۲
- اقلیتوں کی حیثیت دستورِ پاکستان کی رو سے ۲۴۳
- افغان طالبان اور پاکستانی طالبان: اہداف ومقاصد ۲۴۴
  - افغان طالبان ۲۴۴
  - پاکستانی طالبان ۲۴۵
- دینی مدارس اور مذہبی گروہوں کا جہادِ افغانستان میں کردار ۲۴۶
اسلامی نظام اور مذہبی جماعتیں (دسمبر ۲۰۱۰ء) ۲۵۲
- جماعتی زندگی سے علیحدگی کیوں؟ ۲۵۲
- اسلام کا نظامِ خلافت ۲۵۵
- شریعت اور خلافت میں فرق ۲۵۶
- حکومت کے قیام کا طریقہ کار ۲۵۶
- حکومتی نظام کا ڈھانچہ ۲۵۷

- جمہوریت کا تصور ۲۵۸
- سیاسی جماعتوں کی حیثیت ۲۵۹
- خواتین کے حقوق ۲۶۰
- غیر مسلموں کے حقوق ۲۶۰
- آج کی مسلم دنیا اور اسلامی نظام ۲۶۱
- انسانیت کو درپیش مسائل اور اسلامی نظام ۲۶۳
- مذہبی جماعتیں اور احیائے اسلام کا سفر ۲۶۵
- ذرائع ابلاغ کی ضرورت واہمیت ۲۶۹

پاک بھارت تعلقات: ایک جائزہ (اپریل ۲۰۱۱ء) ۲۷۱
- پُرامن پاک بھارت تعلقات کا امکان ۲۷۱
- مسئلہ کشمیر اور اس کا قابلِ قبول حل ۲۷۲
- شدت پسند گروہوں کا طرزِ عمل اور اس کے نتائج ۲۷۳

میری علمی ومطالعاتی زندگی (اکتوبر ۲۰۱۱ء) ۲۷۸
- حالاتِ زندگی ۲۷۸
- ذوقِ مطالعہ، خاندانی تربیت اور ابتدائی سرگرمیاں ۲۸۲
- راہنما شخصیات اور مطالعہ کے ادوار ۲۸۶
- مطالعہ کی زبانیں ۲۹۱
- پسندیدہ مصنفین اور تصانیف ۲۹۱
- مطالعہ کا دائرہ اور ذوق ۲۹۲
- ذاتی لائبریری کا حدود اربعہ ۲۹۵
- فکروذہن کے ارتقا کا تجربہ ۲۹۹
- مطالعہ کے حوالے سے ناگوار احساس ۳۰۱

دنیا سنڈے میگزین (جولائی ۲۰۱۶ء) ۳۰۲

- پیش لفظ از رانا محمد آصف		۳۰۲
- جناب جاوید احمد غامدی اور اسلام کی تعبیرِ نو		۳۰۲
- اسلامی ریاست اور معاشرہ		۳۰۳
- دینی مدارس کا نظامِ تعلیم		۳۰۶
- جماعتِ اسلامی سے اختلاف		۳۰۷
- اتحادِ امت اور فرقہ واریت		۳۰۹
- قومی و دینی سیاست اور تحریکات		۳۰۹
- جہادِ افغانستان اور افغان طالبان		۳۱۲
- مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال		۳۱۴
- دعوت و تبلیغ		۳۱۵
- ذرائع ابلاغ کی اہمیت وضرورت		۳۱۶
جمعیت طلباء اسلام اور جمعیت علماء اسلام سے میرا تعلق	(اکتوبر ۲۰۱۶ء)	۳۱۷
تحریکِ آزادی، قائداعظم اور علماء کرام		۳۲۹
''خبر واحد'': ایک نوجوان کا سوال	(فروری ۲۰۱۸ء)	۳۳۳

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

مختلف دینی وملی مسائل پر اظہارِ خیال تحریری اور تقریری صورت میں گذشتہ چھ عشروں سے میرا معمول چلا آ رہا ہے جو مضامین، تقاریر، سوال و جواب، انٹرویوز اور اخباری بیانات کے ساتھ ساتھ اب ٹویٹس کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔ میرے چھوٹے فرزند حافظ ناصر الدین خان عامر سلّمہٗ نے ۲۰۱۶ء سے zahidrashdi.org کے عنوان سے ویب سائیٹ قائم کر رکھی ہے جس پر وہ اب تک ۴۳۰۰ سے زائد تحریریں جمع کر چکا ہے اور مزید کا سلسلہ جاری ہے۔ اب عزیز موصوف نے مختلف عنوانات پر ان تحریروں کے کتابی مجموعے مرتب کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے جیسا کہ زیر نظر مجموعہ ان سوالات و جوابات اور انٹرویوز پر مشتمل ہے جو مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ قارئین سے دعا کی التماس ہے کہ اللہ رب العزت اس محنت کو قبول فرمائیں، زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے نفع بخش بنائیں، اور عزیز موصوف کو سعادتِ دارین سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

ابوعمار زاہد الراشدی
ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ
یکم جولائی ۲۰۲۳ء

جمعیت علماء اسلام اور قومی سیاست

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور۔ ۱۱ مئی ۱۹۷۹ء)

(جمعیت علماء اسلام کے مرکزی ناظم نشر و اشاعت اور پی این اے (پاکستان نیشنل الائنس/ پاکستان قومی اتحاد) کے جنرل سیکرٹری مولانا زاہد الراشدی سے جمعیت علماء اسلام کی تنظیم نو اور ملکی صورتحال کے سلسلہ میں خصوصی انٹرویو قارئین کی نذر ہے۔ انٹرویو نگار: الطاف حسین۔ بی اے، ایل ایل بی)

تعارف از جناب الطاف حسین

مولانا زاہد الراشدی جمعیت علماء اسلام پاکستان کے مرکزی ناظم نشر و اشاعت، پاکستان قومی اتحاد پنجاب کے جنرل سیکرٹری، اور جمعیت کی مرکزی ٹیم کے جواں سال و فعال رہنما ہیں۔ یوں تو آپ گزشتہ کئی سالوں سے جمعیت علماء اسلام کو ملک کی ایک منظّم و منضبط جماعت بنانے کے لیے سرگرم عمل ہیں لیکن گزشتہ تین سالوں میں آپ نے جماعت کی تنظیم نو کے سلسلہ میں بڑی تیزی سے ملک کو کھنگال کر رکھ دیا، ملک کے بڑے بڑے شہروں سے لے کر دیہاتوں کے ابتدائی یونٹ تک کے جماعتی کارکنوں سے فرداً فرداً رابطہ قائم کیا۔

مولانا زاہد الراشدی ۱۹۴۸ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گکھڑ ہی میں حاصل کی، درس نظامی سے دورۂ حدیث تک نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں فیضیاب ہوئے۔ آپ کے والد گرامی ملک کے نامور اسلامی اسکالر مولانا محمد سرفراز خان صفدر اسلام پر جدید تقاضوں کے ماحول میں لکھی گئی بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، آپ مانسہرہ کے نواح میں آباد سواتی برادری سے تعلق رکھتے ہیں لیکن تشفی علوم اسلامیہ آپ کو دیوبند لے گئی، آپ حضرت مدنیؒ کے خصوصی شاگردوں میں سے ہیں۔ مولانا سرفراز دیوبند سے واپسی پر گکھڑ میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، بعدازاں یہی سلسلہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں شروع کر دیا، اب آپ گوجرانوالہ کی اس معروف دینی درسگاہ کے شیخ

الحدیث وصدر مدرس ہیں۔

مولانا زاہد الراشدی نے ۱۹۶۹ء میں اپنی عملی سیاسی زندگی کا آغاز کیا جبکہ ۱۹۶۲ء میں سیاسی جماعتوں پر پابندی اٹھنے کے بعد ۱۴ سال کی عمر میں آپ نے گکھڑ میں چند نوجوانوں سے مل کر جمعیت طلباء اسلام کی بنیاد رکھی، بعدازاں یہی سلسلہ گوجرانوالہ میں شروع کیا، اسی تگ و دو کی وجہ سے ساتھیوں کی نظر میں آ گئے اور ۱۹۶۵ء میں گوجرانوالہ جمعیۃ کے ناظم نشر و اشاعت مقرر ہوئے۔ اور پھر دو سال بعد ضلع گوجرانوالہ اور ایک سال بعد لاہور ڈویژن کے سیکرٹری بنا دیے گئے۔ اس طرح ۱۹۷۳ء تک مختلف عہدوں پر کام کرتے ہوئے جمعیت علماء اسلام پنجاب کے ناظم نشر و اشاعت منتخب ہوئے۔ اس عہدہ پر آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو ۱۹۷۵ء میں مرکزی اکابر نے جمعیت علماء اسلام کے مرکزی ناظم نشر و اشاعت مقرر کیا اور آج تک اس عہدہ پر بہ احسن طریق سرگرم عمل ہیں۔

میں نے مرکزی راہنماؤں کے انٹرویوز کا دوبارہ سلسلہ شروع کرنے کی ابتدا کے طور پر مولانا زاہد الراشدی صاحب سے سوال و جواب کا سلسلہ جماعتی احباب کے سامنے رکھنے کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلہ میں جب گکھڑ میں آپ کی رہائش پر پہنچا تو بہت سے سائلین آپ کو گھیرے ہوئے تھے، ان سے خاطر خواہ نپٹ کر ہم جمعیۃ گکھڑ کے دفتر آ گئے اور میں نے اپنا سب سے پہلا سوال جمعیۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں کر دیا۔

سوال و جواب

سوال: مولانا آپ نے جمعیۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں ملک میں ابتدائی یونٹ لے کر مرکزی سطح تک کئی بار دورہ کیا ہے، کیا آپ جمعیۃ کی تنظیم سے مطمئن ہیں؟

جواب: الطاف صاحب! جمعیۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں کچھ پیشرفت ہوئی ہے لیکن میں اس سے مطمئن بالکل نہیں۔ میرے نزدیک اس کی وجہ مزاج کی تبدیلی ہے، جب تک یہ نہیں ہوگا اس وقت تک جدید تقاضوں کے مطابق ہماری تنظیم لگا نہیں کھا سکتی۔ ہمارے جماعتی حلقہ کو ولی اللہی حلقہ کہنا زیادہ مناسب ہے، اس حلقہ کا مزاج تنظیمی نہیں جذباتی اور ہنگامی ہے، ہمارے کارکنوں کے ایثار

اور خلوص میں کوئی شبہ نہیں، کسی بھی تحریک یا با مقصد ہنگامہ میں جان و مال کی قربانی دینا ان کا شعار ہے، لیکن تنظیمی معاملات میں وقت اور جان و مال کی قربانی ان کے نزدیک بے وقعت سی چیز سمجھی جاتی ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر کئی پشتوں تک ہم نے تحریکوں اور ہنگاموں ہی کا سامنا کیا ہے۔ یہ چیز ہمارے رگ و ریشہ میں رچ بس گئی ہے جبکہ اب وقت کے تقاضے بدل گئے ہیں، جذباتیت اور ہنگاموں کا دور چلا گیا، اب نظم و ضبط کا دور ہے، ہم اس تبدیلی کی طرف بتدریج بڑھ رہے ہیں لیکن رفتار سست ہے، نئے علماء بالخصوص جمعیت طلباء اسلام سے آنے والے نوجوانوں میں مسائل کا ادراک، نئے تقاضوں کا شعور اور کام کی جدید تکنیک سے واقفیت نسبتاً زیادہ ہے، یہ ایک تسلی بخش امر ہے۔ ہمیں وقت کا ساتھ دینا ہے، اس لیے ہمیں اپنی رفتار میں تیزی پیدا کر کے تنظیم کو انتہائی مضبوط و فعال بنانا ہے۔

سوال: جمعیت علماء اسلام ایک سیاسی جماعت ہے اور اس کا لوگوں کے مسائل و مشکلات کے حل میں دلچسپی لینا قدرتی امر ہے۔ اس سے نپٹنے کے لیے مرکزی سطح پر سیکرٹریٹ کا وجود اور اس میں ہمہ وقت ایک ٹیم کا سرگرم عمل رہنا ناگزیر ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: مرکزی سطح پر سیکرٹریٹ کے سلسلہ میں بار بار سوچا گیا ہے اور اب اس میں خاصی سنجیدگی پیدا ہو چکی ہے، ان شاء اللہ جمعیۃ کے نئے انتخابات کے بعد اس سلسلہ میں ٹھوس اقدامات اٹھائے جائیں گے۔

سوال: آپ نے جمعیۃ کے پروگرام کو اس انداز میں پیش کرنے پر غور فرمایا ہے جس سے ایک طرف مزدور اور کسان اور دوسری طرف تعلیم یافتہ طبقہ بھی جمعیۃ سے متاثر ہو اور اس کا رخ کرے؟

جواب: برادرم! ہماری سیاست ہمیشہ عوام کی سیاست رہی ہے اور اس میں یہ تمام طبقے آ جاتے ہیں۔ ہمارے اکابر نے ہر دور میں وڈیروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں کی بجائے نچلے طبقہ کے مفادات کی بات کی ہے اور ان کی مشکلات و تکالیف کے حل کے لیے صرف سیاست کے طور پر نہیں بلکہ اپنے مشن اور فرض کے طور پر ہمیشہ علم بلند کیا۔ پاکستان میں بھی ہماری سیاست کی بنیاد یہی رہی

اور اس ملک میں بھی انگریز دور کے پیدا کردہ جاگیردار، سرمایہ دار مفاد یافتہ طبقہ جن کا مقصد عیاشی، لوٹ کھسوٹ اور غریبوں کا معاشی استحصال چلا آ رہا ہے، کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔ ہم نے ولی اللہی فکر کے مطابق اس نظام کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کی، یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کے دوران ان مظالم کے خلاف عوام کے غم وغصہ کا لاوا پھٹ پڑا تو کچھ ناعاقبت اندیش جماعتوں نے اسے اسلام اور کفر کا سوال بنانے کی کوشش کی۔ اس پر کچھ علماء نے فتویٰ بھی صادر فرمایا لیکن جمعیت علماء اسلام نے اسے اسلام اور کفر کا معرکہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جمعیۃ کی سیاست دائیں اور بائیں بازو کی مروجہ گروپ بندی سے ہٹ کر اعتدال اور توازن کی سیاست ہے، ہم نے یہاں بھی خالص اسلامی نظام کی بات کی اور مزدور اور کسان کو اسلام کے مطابق ان کا حق دینے پر زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری جماعت کی دوسری اسلامی جماعتوں سے کہیں زیادہ مزدور اور کسان حلقوں میں جڑیں مضبوط ہیں۔ اب بھی یکم مئی کو ہماری قیادت نے کسان مزدور کے ساتھ مل کر ان کے جائز اسلامی حقوق کی بات کی۔ رہا یہ سوال کہ پڑھے لکھے طبقہ میں ہماری جماعت کا اثر، تو آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ملک بھر میں وکلاء، صحافی، دانشوروں کی بھاری تعداد ہماری جدوجہد میں ہمارے ہم قدم ہے۔

سوال: راشدی صاحب! یہ حقیقت ہے کہ جمعیت علماء اسلام کا نشر و اشاعت کا شعبہ جدید تقاضوں کے مطابق نہیں۔ ملکی سطح پر لٹریچر، جماعتی رسائل و اخبارات کا فقدان اور جماعتی آرگن ترجمان اسلام کی محدود اشاعت بھی اتنی بڑی پارٹی کے شایان شان نہیں۔ یہ شعبہ آپ سے متعلق بھی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کس قسم کی اصلاحی تجاویز ذہن میں رکھتے ہیں؟

جواب: اس سوال کے تین پہلو ہیں، سب سے پہلا سوال یہ کہ نشر واشاعت کا شعبہ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے، میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ میں نے ۱۹۷۵ء میں مرکزی ناظم نشر و اشاعت کا شعبہ سنبھالنے کے بعد کچھ پمفلٹوں، پوسٹروں کے ساتھ اس کی نظم نو کا آغاز کیا تھا لیکن وسائل کی کمی اور اس سے بھی زیادہ ہمارے حلقہ میں تنظیمی مزاج کا فقدان حائل ہوا اور بات آگے نہ چل سکی۔ اس قسم کا سلسلہ باہمی رابطے اور تعاون سے چلتا ہے البتہ آج میں ۱۹۷۵ء سے کچھ بہتر

پوزیشن محسوس کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ مرکزی انتخابات کے بعد اس پر مزید توجہ دی جائے گی۔

دوسرا پہلو لٹریچر کا مسئلہ ہے، بدقسمتی سے ہمارے دوست لٹریچر کے معاملہ میں ایک ایسی سیاسی جماعت سے مقابلہ کرتے ہیں جہاں فکر و نظر کے تمام دائرے ایک شخصیت کے گرد گھومتے ہیں اور ایک ہی شخص کے قلم سے نکلا ہوا مختلف موضوعات پر لٹریچر اس جماعت کا طرۂ امتیاز ہے۔ لٹریچر کی ہمارے ہاں بھی کوئی کمی نہیں لیکن ہمارے ہاں لٹریچر شخصی نہیں، نہ ہم قیادت اور لٹریچر کے معاملہ میں شخصیت پرستی کو پسند کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں شروع سے قیادت میں بھی اجتماعیت رہی ہے اور اس طرح لٹریچر کے معاملہ میں بھی ہم نے اپنے فکر و نظر کو ایک شخصیت سے منسلک نہیں کیا۔ آج جدید مسائل پر، اقتصادیات و اخلاق پر آپ کو بیش بہا کتابیں مل جائیں گی جو ہمارے مسلک کے نامور اسکالر مولانا حفظ الرحمان سہارویؒ، مولانا حامد انصاری، مولانا قاری محمد طیب مدظلہ اور مولانا سید محمد میاں نے لکھی ہیں۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ اس لٹریچر کی منظّم اشاعت اور تقسیم کی جائے۔ اس سلسلہ میں بھی مکتبہ رشیدیہ لاہور ایسے ادارے آگے بڑھ کر اپنی خدمات کا اعتراف کرا چکے ہیں۔

آخری پہلو رسائل و اخبارات کا ہے، جماعتی سطح پر اخبار نکالنا مشکل ہے۔ جماعت اسلامی جیسی منظّم اور باوسائل جماعت بھی روزنامہ تسنیم، وفاق، اور جسارت کو پارٹی آرگن کی حیثیت میں چلا کرنا کامی کے بعد اب یہ راستہ چھوڑ چکی ہے۔ کیونکہ آج مارکیٹ میں کوئی ایسا پرچہ کامیاب نہیں ہو سکتا ہے جس پر پارٹی لیبل ہو، اس کی بجائے آج کی تکنیک یہ ہے کہ کامیاب اخبارات کے ساتھ رابطہ رکھا جائے، خبروں کی بروقت ترسیل، متعلقہ اخباری شعبوں سے مسلسل تعلق رکھا جائے، ہمیں اس سلسلہ میں کافی کوشش کی ضرورت ہے۔

اب رہا مسئلہ پارٹی آرگن ترجمان اسلام کا تو یہ بحیثیت پارٹی ترجمان کے ایک باوقار اور کامیاب ہفت روزہ ہے۔ دراصل ہمارے ساتھی جب اس کا مارکیٹ کے ہفت روزوں سے موازنہ کرتے ہیں تو انہیں اس میں ایک خلا محسوس ہوتا ہے، وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ترجمان اسلام ایک جماعتی آرگن ہے، کمرشل مارکیٹ کا جریدہ نہیں۔

سوال: کافی عرصہ سے کارکن مرکزی اکابر کے دوروں کے منتظر ہیں اور اس کے علاوہ قیادت کی دوسری صف کا فقدان شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔

جواب: مرکزی اکابر تمام اکٹھے مل کر ملکی دورہ کرنے سے تو قاصر ہیں لیکن ہر مرکزی رہنما کسی نہ کسی شکل میں ملکی سطح پر دورے ترتیب دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ملکی حالات، قومی اتحاد کی صورتحال کی وجہ سے تسلی بخش دورے نہ ہو سکے۔

دوسری سطح کی قیادت کا جو فقدان محسوس کیا جا رہا ہے وہ دراصل تین دھچکوں کا نتیجہ ہے جو گزشتہ دس سال کے دوران ہمیں برداشت کرنا پڑے۔ ۱۹۶۸ء و ۱۹۷۰ء میں مولانا مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی کے بعد مولانا محمد اکرم مرحوم کا نام سامنے آیا تھا، انہوں نے بہت جلد اپنی قیادت اور صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا لیکن جلد وہ ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۷۳ء میں دوسری صف کی اچھی خاصی ٹیم بھٹو کی محبت کا شکار ہوئی، ہم سے رخصت ہوئے اور قیادت کی دوسری صف خالی نظر آنے لگی۔ اس کے بعد بہت جلد بلوچستان کے مرد حر مولانا شمس الدین شہیدؒ اپنی خداداد صلاحیتوں، جرأت و ہمت کے ساتھ سامنے آئے اور ملک بھر کے جماعتی کارکنوں کی نظر ان پر ٹھہری، لیکن وہ بھی بھٹو کے ظلم و جبر کا لقمہ بن گئے۔ دوسری صف کے اس طرح خالی ہونے سے اس خلا کا احساس شدید ہوتا چلا گیا، اس کی شدت میں اب کچھ کمی نظر آنے لگی ہے۔ جمعیت علماء اسلام کی طرف سے جنرل ضیاء الحق کی کابینہ میں بالخصوص الحاج محمد زمان خان اچکزئی، حاجی فقیر محمد خان کی بے لوث خدمات، انتھک جدوجہد اور جاندار کارکردگی نے جمعیۃ کے کارکنوں کی توجہات اپنی طرف مبذول کرا لی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ حضرات (اللہ تعالیٰ انہیں نظر بد سے محفوظ رکھے) دوسری صف کی قیادت کے خلا کو پر کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے۔

سوال: ملک میں ایک اور سیاسی جماعت اور اس کا لیڈر فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلانے میں مصروف ہیں، آپ اس کے تدارک کے سلسلہ میں کیا تجاویز رکھتے ہیں؟

جواب: فرقہ وارانہ عصبیتوں کو ابھار کر مسلمانوں کی اجتماعی قوتوں کو کمزور کرنے کی تکنیک دراصل انگریز کے فرنگی ذہن کی ایجاد ہے جو کہ انہوں نے جنگ آزادی کو ناکام بنانے کے لیے کی تھی، اور برصغیر کے روایتی رسم پرست اور غیر سیاسی علماء کو فرقہ وارانہ مسائل کی بنیاد پر آزادی پسند

علماء کے مقابل لا کھڑا کیا تھا، لیکن اس دور میں یہ چال ناکام رہی اور آزادی پسند علماء کامیاب ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد بھی یہی صورتحال رہی۔ جب بھی اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلہ میں کوئی مؤثر اقدام کا مرحلہ پیش آیا تو فرقہ واریت کے خوگر علماء نے اپنی روایت کو زندہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو نقصان پہنچایا۔ اور آج بھی جب ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ عمل میں آ چکا ہے اور اس پر عملدرآمد کی تکمیل کے لیے گزشتہ دو صدیوں کے دوران اتحاد اور اتفاق کی سب سے زیادہ اب ضرورت ہے۔ ایسے نازک مرحلہ پر یہی رسوم پرست علماء مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو تقویت پہنچانے کی بجائے فرقہ واریت کو ہوا دے رہے ہیں جو ہمارے نزدیک نہ صرف ملکی سالمیت کے نقطۂ نظر سے نقصان دہ ہے بلکہ اسلامی نظام کی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کے مترادف ہے۔

جمعیت علماء اسلام نے کبھی فرقہ وارانہ بات نہیں کی، نہ ہی ہمارے دستور میں کوئی ایسی شق ہے جو کسی عقیدہ کے فرد کو ہمارا رکن بننے سے روکے۔ ہم صدر پاکستان سے ملک وقوم کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ اس جماعت اور لیڈر کو اپنے مکروہ عزائم میں کامیاب ہونے سے روکے اور ضابطۂ اعلان کا پابند بنائیں۔

سوال: جمعیۃ کی طرف سے ’’کل پاکستان نفاذ نظام مصطفٰی کانفرنس‘‘ کے انعقاد کے کیا مقاصد ہیں؟

جواب: اکتوبر ۱۹۷۵ء میں گوجرانوالہ میں ’’نظام شریعت کنونشن‘‘ منعقد ہوا تھا، اس کے بعد سے اب تک ملک گیر سطح پر جمعیۃ کے کارکنوں کا کوئی ایسا اجتماع نہیں ہو سکا جس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ گزشتہ کچھ عرصہ سے مختلف مکاتب فکر نے فرقہ وارانہ بنیادوں پر کانفرنسیں منعقد کیں جس کے منفی اثرات سامنے آئے۔ ہم جمعیۃ کی اس کانفرنس میں تمام مکاتب فکر کے سربرآوردہ علماء کرام کو دعوت دے کر اس تاثر کو زائل کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی اسلام دشمن عناصر کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے فرقہ وارانہ عصبیتوں کے حوالہ سے اسلامی نظام کو ناکام بنانے کا جو خواب دیکھا ہے وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

سوال: این ڈی پی سے انتہا پسند گروپ نکل جانے کے بعد اعتدال پسند گروپ کا پی این اے میں واپسی کا امکان ہے؟

جواب: این ڈی پی سے انتہا پسند عناصر کے جدا ہونے کے بعد اس جماعت کا قومی اتحاد سے الگ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔ اور اب تو این ڈی پی کا پی این اے پر حکومت میں شامل ہونے والا واحد اعتراض بھی ختم ہو گیا ہے۔

سوال: اب میرا ذہن بلوچستان کی صورتحال کی طرف لوٹ گیا اور میں نے اسی مناسبت سے سوال کیا۔ مولانا! آپ نے ملک کے ہر صوبہ کا تفصیلی دورہ کیا ہے، آپ کو کہیں علیحدگی پسندوں کا وجود بھی نظر آیا؟

جواب: ملک میں علیحدگی پسندوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ (مولانا زاہد الراشدی نے یہ مختصر جواب اتنے سکون اور اطمینان سے دیا کہ میں اس پر مزید سوال نہ کر سکا۔)

سوال: کیا بھٹو کو پھانسی کے بعد پیپلز پارٹی ختم ہوگئی؟

جواب: یہ انتہائی غلط سوچ ہے، پیپلز پارٹی ملک میں موجود ہے، اس لیے کہ بھٹو ایک شخص کا نام نہیں تھا، ایک فکر اور نظریہ کا نام تھا جو آج بھی زندہ ہے۔ اور اس فکر اور نظریہ کا جواب گالی گلوچ اور جذبات سے نہیں بلکہ نظریہ اور فکر ہی سے دیا جا سکتا ہے۔ ہمیں پیپلز پارٹی کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے پسے ہوئے طبقہ میں جانا ہوگا اور بھٹو ازم کی ان کمین گاہوں کو ختم کرنا ہوگا جہاں آج بھی بھٹو ازم کے بچے کھچے جراثیم پناہ گزین ہیں۔

سوال: کیا قومی اتحاد کا حکومت سے علیحدگی دانشمندانہ اقدام ہے؟

جواب: پی این اے کی حکومت سے علیحدگی درست فیصلہ ہے کیونکہ اتحاد نے دو واضح مقاصد کے لیے حکومت میں شمولیت کی تھی۔ وہ اصولی طور پر پورے ہو گئے ہیں۔ قومی اتحاد اس سلسلہ میں سرخرو ہے۔ ان کے علاوہ ایک ثانوی مقصد لوگوں کے الجھے ہوئے مسائل کا حل اور عوام کی مشکلات میں کمی کرنا تھا جس کے لیے بھی اتحادی وزراء نے انتھک محنت کی، لیکن صوبوں میں سول حکومتیں نہ بننے سے انتظامیہ کی طرف سے مطلوبہ تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ ایسے حالات میں دو مقاصد کے پورے ہونے کے بعد حکومت سے علیحدگی دانشمندانہ اقدام ہے۔

سوال: کیا آپ موجودہ رکنیت سازی سے مطمئن ہیں؟

جواب: یہ درست ہے کہ اس دفعہ رکنیت سازی پہلے کی نسبت زیادہ ہوئی ہے لیکن جتنی ہونی

چاہیے تھی اتنی نہیں ہوئی۔ اوراس کی وجہ بھی باہمی رابطہ اور دلچسپی کا فقدان ہے اوراس سلسلہ میں رکنیت کی میعاد میں توسیع ہوئی ہے، جماعتی احباب کواس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

سوال: کیا موجودہ حالت میں بھی قومی اتحاد الیکشن جیتنے کی پوزیشن میں ہے؟

جواب: قومی اتحاد کے سلسلہ میں ذہنوں میں کمزوری کے جواحساسات جنم لے رہے ہیں وہ صرف عوامی رابطہ کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ گزشتہ دنوں پی این اے کے قائدین نے ملک کے کچھ حصوں کا دورہ کیا تو عوام نے بڑی گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کیا جس سے اتحاد کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیاں کم ہوگئیں۔ مجھے یقین ہے کہ قومی اتحاد کی قیادت اور کارکنوں نے اسی طرح ٹیم ورک کے جذبہ سے الیکشن مہم چلائی تو الیکشن میں کامیابی حاصل کرے گا۔

ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور

(۱۸ نومبر ۱۹۸۳ء)

(ایک صاحب نے گزشتہ دنوں کچھ سوالات بھجوائے اور فوری جواب کا تقاضا کیا، عجلت کے باعث کسی مناسب تیاری کے بغیر جوابات قلمبند کرنا پڑے۔ سوالات کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً کسی امتحانی پرچے کے ہیں لیکن اہم موضوعات سے متعلق ہیں اس لیے ان کے جوابات نذرِ قارئین ہیں۔ راشدی)

وحی الٰہی کی قسمیں

سوال: حدیث نبویؐ بھی وحی کی ایک قسم ہے، بحث کیجئے۔

جواب: جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی بنیادی طور پر تین قسم کی ہے:

(۱) پہلی قسم کلام الٰہی ہے جو قرآن کریم کی صورت میں نازل ہوئی۔ یہ خالصتاً باری تعالیٰ کا کلام ہے اور اسی شکل میں نازل ہو کر اب تک محفوظ ہے۔

(۲) دوسری قسم ان احکام پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے مختلف معاملات میں جناب رسول اللہؐ پر نازل فرمائے اور آنحضرتؐ نے انہیں اپنے الفاظ میں بیان فرما دیا۔

(۳) اور تیسری قسم ان احکام اور فیصلوں کی صورت میں ہے جو متعدد معاملات وامور میں جناب نبی اکرمؐ نے از خود ارشاد فرمائے اور وحی جاری ہونے کے باوجود ان پر کوئی روک ٹوک نہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عملاً ان کی تصدیق فرما دی گئی۔ اسے وحی حکمی کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں متعدد ایسے امور کا ذکر ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فیصلہ فرما دیا لیکن اللہ

تبارک وتعالیٰ نے اس پر ٹوک دیا کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ قرآن کریم کا یہ طرز اس بات پر دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کے وہ تمام فیصلے اور احکام جن پر قرآن کریم میں یا وحی کے دیگر طریقوں میں کوئی ٹوک نہیں ہوئی، عملاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے تصدیق شدہ ہیں۔ اگر یہ فیصلے مصدقہ نہ ہوتے یا درست نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر ٹوک دیا جاتا جیسا کہ بعض امور میں ایسا ہوا بھی ہے۔ اسی کا نام ''وحی حکمی'' ہے اور وحی کی یہ تینوں صورتیں حجت ہیں۔

اجتہاد کی حدود وشرائط

سوال: اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا تھا، تو اب اسے کھولنا ضروری ہے، بحث کیجئے۔

جواب: اجتہاد کا دروازہ کسی دور میں بند نہیں ہوا۔ صرف اتنی بات ہے کہ جن اجتہادی امور پر خیر القرون میں اجتہاد ہو چکا ہے اور ان کے اسباب ومحرکات اور وجوہ وعلل بھی جوں کے توں ہیں، ان میں خیر القرون کے اجتہاد کو ہی بنیاد بنانا ضروری ہے۔ ورنہ اگر اجتہاد علی الاجتہاد کا دروازہ اسی طرح کھلا چھوڑ دیا گیا تو اس سے فقہی انارکی پیدا ہوگی اور اجتہادات کو کسی دائرہ اور ضابطہ کا پابند نہیں رکھا جا سکے گا۔

باقی رہے وہ معاملات جن پر اجتہاد کی ضرورت ہے، یا خیر القرون کے وہ اجتہادات جن کے اسباب وعلل حالات کے تغیر کی وجہ سے تبدیل ہو چکے ہیں، ان میں اجتہاد کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ البتہ اجتہاد حق ہے اہلِ اجتہاد کا، ہر کس وناکس کا نہیں۔ جو حضرات قرآن وحدیث اور دیگر متعلقہ علوم پر اس قدر عبور رکھتے ہیں جو اجتہاد کے لیے ضروری ہیں، ان کے اجتہاد کا حق مسلم ہے اور اس اجتہاد کے موجود ونافذ ہونے میں بھی کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔

عقیدۂ توحید وتقدیر

سوال: اسلام کے عقیدۂ توحید کے تہذیبی اثرات بیان کیجئے۔

جواب: عقیدۂ توحید کی بنیاد دو باتوں پر ہے:

(۱) کائنات کا خالق خداوند تعالیٰ ہے اور اس نے نسلِ انسانی کو اپنا نائب بنا کر اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کائنات پر احکامِ الٰہی کے مطابق حکمرانی کرے۔ اور یہ اس لحاظ سے دکھائی بھی دے رہی ہے کہ کرۂ ارض میں زمین، فضا اور سمندر پر تصرف کا نظام انسان کے ہاتھ میں ہے۔

(۲) اطاعت حکم برداری اور بندگی کے لائق صرف خدا کی ذات ہے۔ خوف اور لالچ کے تمام امور اسی سے متعلق ہیں، نفع و نقصان کا مالک صرف وہ ہے اور موت و حیات، عزت و ذلت، رزق و اقتدار، آزادی و غلامی صرف اس کے قبضے میں ہے۔

عقیدۂ توحید کا وہ پہلو جس کا ہم نے نمبر (۱) کے طور پر ذکر کیا ہے ایک مسلمان میں مقصدِ زندگی کا احساس پیدا کر کے اسے بے مقصد زندگی گزارنے سے روکتا ہے، اور زندگی برائے زندگی کی بجائے اسے زندگی برائے مقصد کی شاہراہ پر گامزن کرتا ہے۔ اور عقیدۂ توحید کا پہلو نمبر (۲) ایک مسلمان کو خدا کے سوا باقی سب کے خوف سے بے نیاز کر کے اس کے اندر وہ جرأت اور حوصلہ پیدا کرتا ہے جو اسے ہر حالت میں حق گوئی اور حق پرستی پر آمادہ کرتا ہے۔

ایک ایسا معاشرہ جس کے افراد زندگی کو بامقصد سمجھیں اور ہر حالت میں حق کو قبول کرنے اور اسے لاگو کرنے میں خدا کے سوا ہر طاقت کے ڈر سے بے نیاز ہو جائیں، صرف وہی معاشرہ دنیا میں امن و انصاف کا ضامن ہو سکتا ہے اور لوگوں کو ظلم و جبر اور استحصال و غلامی سے نجات دلا سکتا ہے۔ اسلام کا عقیدۂ توحید مسلم معاشرہ میں یہ اوصاف پیدا کرتا ہے اور انہی اوصاف پر اسلامی معاشرہ کی بنیاد رکھ کر اسے خیرِ امت کے طور پر دنیا میں صحت مندانہ معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی انقلاب کا داعی بناتا ہے۔

سوال: اسلام کا عقیدۂ تقدیر ’’توکل‘‘ کے نام پر بے عملی کو فروغ دیتا ہے؟

جواب: یہ اسلام پر الزام ہے، اسلام نے کہیں تقدیر اور توکل کی ایسی تعبیر نہیں کی جسے بے عملی کا نام دیا جا سکے۔ بلکہ اسلام جہد مسلسل اور عمل پیہم کا نام ہے اور ہر بات میں عمل اور حتی الوسع عمل کو ضروری قرار دیتا ہے۔ تقدیر اور توکل انسان کو اس کے عمل اور جدوجہد کے بے نتیجہ ہونے کی

صورت میں اس کے منفی ردعمل سے بچاتے ہیں اور اس کے حوصلہ کو قائم رکھتے ہوئے عمل اور جدوجہد پر دوبارہ آمادہ کرتے ہیں۔ تقدیر اور توکل کے نام سے اسلام صرف یہ کہتا ہے کہ اپنے مقاصد کے لیے عمل کرو اور جو کچھ تمہارے بس میں ہے کر گزرو لیکن نتائج تمہارے اختیار میں نہیں ہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہیں اور ان کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ لیکن تمہارے ثواب وعقاب اور ذمہ داری کا تعلق اس فیصلے سے نہیں بلکہ تمہارے عمل سے ہے، جو عمل کرو گے اس کے نتائج تمہیں بھگتنا ہوں گے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جہاں ایمان کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ عمل صالح کا بھی ذکر کیا ہے اور سورۃ العصر میں نجات اور کامیابی کا مدار بیان کرتے ہوئے ایمان اور عمل صالح کو ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

اور یہ الزام اسلام کے عملی کردار کے لحاظ سے بھی خلافِ واقعہ ہے۔ اگر اسلام تقدیر اور توکل کے نام پر بے عملی کا داعی ہوتا تو اس کے اولین پیروکار صحابہ کرامؓ جہدِ مسلسل کے پیکر نہ ہوتے، اس بے عملی کا اثر سب سے زیادہ ان پر ہوتا جبکہ وہ اس کے برعکس رات کو جائے نماز پر خدا کی عبادت کرنے والے اور دن کو جہاد اور مشقت کرنے والے تھے۔ اسلام اگر تقدیر اور توکل کے نام پر بے عملی کو فروغ دیتا تو خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدر و احد کے محاذوں پر بے سروسامانی کے باوجود کفار کے مقابلہ میں صف آراء نہ ہوتے بلکہ مدینہ منورہ میں بیٹھ کر تقدیر، توکل اور دعاؤں کے ساتھ ان جنگوں کو جیتنے کی راہ اختیار کرتے۔

اس لیے یہ کہنا خلافِ واقعہ ہے کہ اسلام نے تقدیر اور توکل کے نام پر بے عملی کو فروغ دیا ہے۔ بلکہ اسلام نے تقدیر اور توکل کے ذریعے مسلمانوں کے جوشِ عمل میں اضافہ کیا ہے اور جہد وعمل کے نتائج سامنے نہ آنے پر اسے خدا کے حوالے کرنے کا جذبہ اجاگر کر کے منفی ردعمل سے بچایا ہے اور جہدِ عمل کی اس سپرٹ کو قائم رکھا ہے جو نتائج سامنے نہ آنے پر عموماً کمزور پڑ جایا کرتی ہے۔

حتیٰ کہ توکل کے نام پر بے عملی کی خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل کے ساتھ نفی فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ دیکھ لیجئے۔ ایک صحابی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، دور سے آئے تھے، آپؐ نے دریافت فرمایا تمہارا اونٹ کہاں ہے؟ جواب دیا کہ خدا کے توکل پر کھلا چھوڑ آیا ہوں۔ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ توکل اس کا نام نہیں ہے، پہلے اونٹ

کے پاؤں کو رسی کے ساتھ باندھو پھر خدا پر توکل کرو۔ گویا آپؐ نے توکل کا معنیٰ واضح فرما دیا کہ توکل خدا کے بھروسے پر بیکار بیٹھ جانے کا نام نہیں بلکہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اپنے مقصد کے لیے وسائل اور محنت کو مکمل طور پر اختیار کرو اور پھر اس کے نتائج خدا پر چھوڑ دو۔

اسلام کی اس قدر واضح تعلیمات، عمل اور معاشرہ پر اس کے اثرات کو دیکھتے ہوئے بھی یہ الزام عائد کر دینا کس قدر ناانصافی ہے کہ اسلام کا عقیدۂ تقدیر توکل کے نام پر بے عملی کو فروغ دیتا ہے۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ

سوال: نماز کے تہذیبی اثرات پر روشنی ڈالیے۔

جواب: نماز انسان میں طہارت و پاکیزگی کی عادات پیدا کرتی ہے، اس کے ذہن و فکر کو یکسوئی عطا کرتی ہے، وقت کی پابندی اور ذمہ داری کے احساس کا خوگر بناتی ہے، جوابدہی کا تصور اس کے ذہن میں زندہ رکھتی ہے اور اس طرح معاشرہ کو ایسے تربیت یافتہ افراد فراہم کرتی ہے جو اس کی صحت مندانہ تشکیل میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ پھر باجماعت نماز، جمعہ کی نماز اور عید کی نماز کے ذریعے ہر سطح پر مسلمانوں کی اجتماعیت ابھرتی ہے، باہمی میل جول اور افہام و تفہیم کے مواقع مسلسل فراہم ہوتے ہیں اور وحدت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

سوال: روزہ ایک انفرادی عبادت ہے لہٰذا اس سے معاشرتی اصلاح کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

جواب: بنیادی طور پر یہ تصور ہی غلط ہے کہ جو چیز صرف انفرادی اصلاح کا ذریعہ ہو اس کے اثرات معاشرہ پر نہیں ہوتے۔ کیونکہ معاشرہ افراد ہی کا مجموعہ ہے اور ایک فرد اصلاح کے عمل سے جس قدر بہرہ ور ہوگا معاشرہ اتنے ہی اس کے اثرات قبول کرے گا بلکہ فرد کی اصلاح کے بغیر تو معاشرہ کی اصلاح کا تصور بھی ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد کو نظرانداز کر کے اصلاح کے عمل کو معاشرہ پر اوپر سے مسلط کرنے کی ہر کوشش دنیا میں ناکامی سے دوچار ہوئی ہے۔

روزہ اگرچہ بظاہر انفرادی عمل ہے اور ایک مسلمان کی ذات کا معاملہ ہے لیکن یہ عمل مسلمان کو صبر و استقامت، تقویٰ، پرہیزگاری اور دیگر اوصافِ حمیدہ سے موصوف کر کے ایک اچھے معاشرہ کی تشکیل کے لیے تیار کرتا ہے۔

سوال: زکوٰۃ مال کا تزکیہ بھی کرتی ہے اور صاحبِ مال کا بھی، قرآن و سنت کے حوالے سے واضح کریں۔

جواب: صاحبِ مال کے مال پر اجتماعیت اور معاشرہ کے مسلمہ حقوق ہیں، ان حقوق کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور ان کا تعین بھی کرتا ہے، جبکہ حقوق وصول کرنے والوں کی عزت نفس کی پاسداری کے لیے اسلام اسے خدا کا حق قرار دیتا ہے۔ اب ایک شخص اگر اپنے مال میں سے خدا تعالیٰ اور معاشرہ کا حق ادا نہیں کرتا تو اس کا مال اس کے اپنے حق اور دوسروں کے حقوق کے ساتھ مخلوط ہے، اور جب وہ تمام حقوق ادا کر دے گا تو اس کا مال اس کا اپنا ہوگا اور دوسروں کے حقوق سے پاک ہو جائے گا۔ مال کے تزکیہ کا یہی معنیٰ ہے کہ اس کا مال اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حق سے پاک ہو گیا ہے۔

صاحبِ مال کے ذہن میں یہ تصور ہر وقت اجاگر رہے گا کہ یہ مال اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے اور اس میں سے اللہ رب العزت کے حقوق کے حوالے سے معاشرہ کے حقوق اس کے ذمہ ہیں۔ اور یہ احساس اس میں خدا ترسی، جواب دہی اور حق کی ادائیگی کے اوصاف پیدا کر دے گا۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

> ”آپ ان کے مال سے صدقہ وصول کریں تا کہ آپ ان کو پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں۔“ (التوبہ)

دوسرے مقام پر متقی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ”وہ اپنے مال کو خرچ کر کے پاکیزگی حاصل کرتا ہے۔“

ام المؤمنین سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ جس ”کنز“ کی قرآن کریم میں مذمت کی گئی ہے وہ کونسا ہے؟ تو جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

> ”جب تم اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دو تو وہ کنز نہیں رہتا۔“ (ابوداؤد)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں:

> ”زکوٰۃ لوگوں کے مال کو پاک کرنے کے لیے فرض کی گئی ہے۔“ (بخاری)

اسلام اور جمہوریت

سوال: جمہوریت میں عوام کی حاکمیت کا تصور پایا جاتا ہے جو سراسر الحاد کے مترادف ہے، لہٰذا اسلامی نظامِ سیاست میں جمہوریت کی کوئی گنجائش نہیں ہے؟

جواب: یہ مسئلہ قدرے تفصیل طلب ہے۔ جمہوریت کو اگر اس معنیٰ میں لیا جائے کہ اس کی بنیاد عوام کی حاکمیت پر ہے اور عوام یا ان کے نمائندے جو فیصلہ بھی کر لیں وہ حتمی اور آخری ہے، یہ جمہوریت اسلام کے قطعی منافی اور اس کے بنیادی عقائد واحکام سے متصادم ہے اور اس کے الحاد و کفر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اگر جمہوریت سے یہ مراد لی جائے کہ خدا کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کر کے احکام وقوانین کو اس کے فرامین کے تابع رکھتے ہوئے نظم مملکت میں عوام کو شریک کیا جائے اور ان پر حکومت کرنے کے لیے ان کی رائے سے حکمران کا انتخاب کیا جائے تو اسلام اس کی نفی نہیں کرتا بلکہ خود اس کا علمبردار ہے۔

یہ بات طے ہے کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے اور ایک مسلمان حکومت اپنے ہر فیصلہ میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی پابند ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پابندی کے اس دائرے میں رہنے والی اس حکومت کی تشکیل کیسے ہوگی؟ اسلام نے قیامت تک کے حکمرانوں کی کوئی فہرست جاری نہیں کی جبکہ وحی کا دروازہ بند ہے، اس لیے کسی حکمران کی خدا کی طرف سے تقرری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے حکمران کے لیے شرائط وحدود اور اوصاف واہلیت کا معیار بتایا ہے اور ان تمام امور کے ساتھ حکمران کے تعین اور حکومت کی عملی تشکیل کا راستہ کھلا رکھا ہے۔ اس کے لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ کے اولین تعامل کو مثال ومعیار بنانا زیادہ بہتر ہوگا جنہوں نے عمومی رائے کے ساتھ اپنے میں سے بہترین شخصیت حضرت صدیق اکبرؓ کو خلیفہ چن لیا۔ اور جناب رسول اللہؐ نے بھی اچھے اور برے حکمران کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے یہی ارشاد فرمایا ہے:

’’تمہارے اچھے حکمران وہ ہیں جو تم سے محبت کریں تم ان سے محبت کرو، وہ تمہارے لیے رحمت کی دعا کریں تم ان کے لیے رحمت کی دعا کرو، اور تمہارے

برے حکمران وہ ہیں جو تم سے بغض رکھیں تم ان سے بغض رکھو، وہ تم پر لعنت بھیجیں تم ان پر لعنت بھیجو۔" (مسلم شریف)

گویا اچھے اور صحیح حکمران کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی رعایا اور اس کے درمیان محبت و اعتماد کا تعلق ہو بغض و نفرت کا نہ ہو۔ اور اس محبت و اعتماد کے اظہار کے لیے کسی زمانہ میں جو بھی طریق کار اس دور کے تقاضوں کے مطابق ضروری ہوگا اسے بہر حال اپنانا پڑے گا۔ اس لیے حکومت اور اقتدار کو احکامِ الٰہی کے دائرہ میں پابند رکھتے ہوئے حکومت کی تشکیل میں عوام کی محبت و اعتماد حاصل کرنے اور انہیں تشکیلِ حکومت میں شریک کرنے کے لیے جو بھی قابلِ عمل طریقہ اختیار کیا جا سکے اسلام اس کی نفی نہیں کرتا۔ اور آج کے دور میں انتخاب اور ووٹ کے طریق کار کو قبول کرنا اس لیے ضروری ہے کہ موجودہ حالات میں اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں جس کے ذریعے عوام اور حکومت کے درمیان اعتماد کا اظہار ہو سکے۔

اس کے علاوہ جمہوریت کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھنا پڑے گا اور وہ ہے ایک اسلامی مملکت کے شہریوں کے بنیادی حقوق کی عملداری اور بحالی کا مسئلہ۔ اسلام اپنے ملک کے باشندوں کو جو بنیادی حقوق غیر مشروط طور پر دیتا ہے ان میں (۱) اظہارِ رائے کا حق (۲) حکومت پر تنقید اور معاملات حکومت میں مشاورت کا حق (۳) خوراک (۴) رہائش (۵) لباس (۶) تعلیم (۷) اور علاج وغیرہ کو اولین اہمیت حاصل ہے اور یہ حقوق تمام شہریوں کو کسی امتیاز کے بغیر حاصل ہیں۔ اب کوئی فرد یا طبقہ ملک کے باشندوں کو ان حقوق یا ان میں سے کسی حق سے طاقت کے بل پر محروم کرتا ہے تو ان حقوق کی بازیابی اور عملداری کی جدوجہد اور جمہور کو ان کے حقوق دلوانے کی ہر کوشش بلاشبہ اسلامی تعلیمات کے مطابق بلکہ اسلامی احکام کا تقاضہ ہے۔

الغرض عوام کی مطلق حاکمیت کی نفی کر کے خدا کی حاکمیت کے تابع رہتے ہوئے تشکیلِ حکومت میں عوام کی شرکت، حکمرانوں پر عوام کے اعتماد کے اظہار اور شہریوں کے بنیادی حقوق کی عملداری کے لیے اگر کوئی نظام وضع کیا جاتا ہے تو اس کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اسے اسلام کے علاوہ اور کوئی عنوان دینے کی ضرورت نہیں، لیکن اسے مغربی جمہوریت پر قیاس کر کے نہ تو اس کی مکمل نفی کی جا سکتی ہے اور نہ اسے اسلامی احکام و تعلیمات کے منافی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسلام اور علاقائی ثقافتیں

سوال: کیا یہ درست ہے کہ اسلامک کلچر نام کی کوئی چیز سرے سے موجود نہیں ہے کیونکہ مسلمان جہاں بھی گئے انہوں نے وہیں کا کلچر اپنا لیا؟

جواب: اس سلسلہ میں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ کلچر کہتے کس کو ہیں؟ عام طور پر کلچر کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کلچر کسی قوم کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رچ بس جانے والی ان روایات اور اعمال سے عبارت ہوتا ہے جن سے اس قوم کا تشخص اور امتیاز دوسری اقوام سے ظاہر ہو۔ اگر واقعی کلچر اسی چیز کا نام ہے تو تاریخ عالم کی یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلامک کلچر سے زیادہ مضبوط اور مستحکم کلچر کوئی اور قوم پیش نہیں کر سکی اور اسلام جس علاقہ میں گیا ہے اس نے وہاں کے کلچر کو قبول کرنے کی بجائے اس کی بنیادی ہیئت کو تبدیل کر دیا ہے۔

اسلام سب سے پہلے اس کلچر پر اثر انداز ہوا جو ڈیڑھ ہزار سال قبل کے جزیرۂ نمائے عرب کا علامتی کلچر کہلاتا ہے۔ اور اس نے عربوں کے نہ صرف عقائد کو بدل دیا بلکہ ان کی معاشرتی زندگی میں بھی انقلاب پیدا کیا، حلال و حرام کے تصورات بدل گئے، باہمی تعلقات و روابط کی بنیادیں تبدیل ہو گئیں، خوشی و غمی کی تقریبات اور طریق کار نے نیا رخ اختیار کر لیا، طبقات، رنگ و نسل اور زبان کا امتیاز مٹ گیا اور زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب پیدا کر کے اسلام نے عربوں کی اجتماعی زندگی کو ایک نئی ہیئت دے دی۔ عرب اقوام کی قبل از اسلام زندگی اور بعد از اسلام زندگی پر ایک نظر ڈال لیجئے آپ کو جو محسوس فرق اور تبدیلی نظر آئے گی وہی اسلام کا امتیاز اور تشخص ہے اور اسی کا نام ''اسلامک کلچر'' ہے۔

یہ بات درست ہے کہ اسلام نے مختلف اقوام میں پہنچنے کے بعد وہاں کی ثقافت پر اثر انداز ہونے کے لیے اکھاڑ پچھاڑ کی بجائے ایڈجسٹمنٹ کی حکمت عملی اختیار کی ہے اور وہاں کے کلچر کے صرف اس حصہ کی نفی کی ہے جو اس کے عقائد اور بنیادی احکام سے متصادم ہوا ہے۔ اور ایسی روایات و اقدار کو اپنے اندر سمونے میں بخل سے کام نہیں لیا جو اس کے احکام و عقائد کے منافی نہیں تھیں، حتیٰ کہ عرب جاہلیت کی تمام کلچرل روایات و اقدار کو بھی اسلام نے کلیۃً رد نہیں کیا بلکہ زندگی

کے مختلف شعبوں میں آج بھی اسلام ایسی روایات و اقدار کا حامل ہے جو جاہلی کلچر کا اہم حصہ رہی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں مختلف اوقات میں ثقافتوں نے اقوام عالم پر اپنا سکہ جمانے کی کوشش کی ہے اور اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا ہے اسلام کا طریق کار اس سے مختلف رہا ہے۔ ان ثقافتوں اور تہذیبوں کا طریق کار یہ رہا ہے کہ وہ جہاں گئی ہیں وہاں کی مقامی تہذیبوں کو کلیۃً تاخت و تاراج کر کے ان کی مکمل نفی کر کے ڈنڈے اور طاقت کے زور پر ان کی جگہ لینے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ اسلام نے پہلے سے موجود تہذیبوں کی نہ تو مکمل طور پر نفی کی ہے اور نہ تصادم کے ذریعے ان سے جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام نے ان تہذیبوں کی ایسی باتوں کو فراخدلی کے ساتھ قبول کر لیا ہے جو اس کے عقائد و روایات کے منافی نہیں تھیں اور صرف ان روایات و اقدار کو رد کیا ہے جن سے اس کے عقائد و احکام پر زد پڑتی ہو اور پھر اس رد کرنے میں بھی طاقت اور ڈنڈے کی بجائے افہام و تفہیم اور اخلاق و محبت کے ہتھیار سے کام لیا ہے۔

تاریخ اسلام کے ابتدائی ادوار کو دیکھیے، مجاہدینِ اسلام جس خطۂ زمین میں گئے ہیں وہاں تسلط قائم ہونے کے بعد ڈنڈے اور تلوار کو ایک طرف رکھ دیا ہے اور اخلاق و محبت کے ہتھیاروں سے قوموں کی زندگیاں بدل دی ہیں۔ برصغیر پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش کو ہی لے لیجئے، یہاں اسلام کے آنے سے پہلے اجتماعی زندگی میں جو اقدار و روایات اور مجموعی ہیئت تھی کیا اسلام کے آنے کے بعد بھی زندگی اسی نہج پر قائم رہی ہے جس رخ پر پہلے تھی؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے کیونکہ مسلمانان ہند کی قبل از اسلام زندگی اور بعد از اسلام زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور یہ فرق عقائد و احکام سے لے کر شادی و غمی، تجارت، اخلاق اور روزمرہ معمولات تک ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے۔ تو پھر اسلامک کلچر کے وجود سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟

قصہ صرف یہ ہے کہ اسلام نے تہذیبی تبدیلیوں اور ثقافتی انقلاب کے لیے وہ ہتھکنڈے اختیار نہیں کیے جن سے دوسری تہذیبیں استفادہ کرتی رہی ہیں اور اپنے عقائد و احکام اور تہذیب و ثقافت کو اخلاق و محبت اور افہام و تفہیم کے ذریعے دوسری اقوام پر حاوی کیا ہے۔ اس لیے ظاہر بین حضرات بھولپن کے ساتھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام کا تو اپنا کوئی کلچر ہی نہیں۔ ہمارے ہاں بھی

اسلام نے ہندو تہذیب و کلچر کی ایسی تمام روایات واقدار کو رد کیا ہے جو اسلام سے متصادم تھیں اور ایسی روایات واقدار سے تعرض نہیں کیا جن سے ان کے بنیادی احکام متاثر نہیں ہوتے تھے۔ زندگی کے کسی شعبے کو مثال بنا کر دیکھ لیجئے ہندو طرز زندگی اور مسلم طرز زندگی میں آپ کو فرق محسوس ہوگا اور تبدیلی نظر آئے گی، اسی کا نام کلچر ہے اور کسی قوم کا یہی امتیاز و تشخص اس کی تہذیب کہلاتا ہے۔ البتہ اس تہذیب وثقافت کو یہاں کی تہذیب وثقافت پر حاوی کرنے کے لیے اسلام نے خواجہ معین الدین اجمیریؒ، سید علی ہجویریؒ اور دوسرے اولیاء کرامؒ کے کردار اور اخلاق کو ہتھیار بنایا ہے جنہوں نے اپنی سچائی، بلندیٔ کردار، اخلاق اور محبت کے ذریعے لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کے رخ موڑ دیے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کرسکتا۔

نجی ملکیت اور معاشی مساوات

سوال: نجی ملکیت معاشی مساوات میں خلل ڈالنے کا باعث ہے اور مساوات اسلامی نظامِ معاشرت میں بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا اسلام میں نجی ملکیت کی کوئی گنجائش نہیں۔

جواب: بنیادی طور پر یہ تصور ہی اب غلط ثابت ہوگیا ہے کہ نجی ملکیت معاشی مساوات میں خلل ڈالنے کا باعث ہے۔ کیونکہ روس اور چین جیسے ممالک جو کمیونزم کے عالمی پرچارک ہیں اپنے اپنے ملک میں نجی ملکیت بحال کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں اور اپنے اس تجربے کے مثبت اثرات کو محسوس کرتے ہوئے ان کا برملا اظہار بھی کر رہے ہیں۔ اور اس طرح نجی ملکیت کی نفی کرنے والے اس عالمی فلسفہ اور نظام کو ہی ”ریورس گیئر“ لگ گیا ہے جو نجی ملکیت کو معاشی مساوات کے منافی قرار دے کر اس کی نفی پر اپنے اقتصادی نظام کی بنیاد رکھتا تھا۔

اسلام نظامِ فطرت ہے، وہ فرد اور اجتماعیت کی اہمیت کو یکساں طور پر تسلیم کر کے ان کے مابین فطری اور قابل عمل توازن قائم کرتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی نفی کر کے معاشرہ کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اجتماعیت افراد سے عبارت ہے، اگر فرد کا وجود نہ ہو اور اس کی انفرادیت کو تسلیم نہ کیا جائے تو اجتماعیت کیسے ہوگی؟ جبکہ اجتماعیت افراد کے

مجموعے کا نام ہے، اگر اجتماعیت کی نفی کر دی جائے تو افراد ایک معاشرہ کی شکل کیسے اختیار کریں گے؟ اسلام ان دونوں حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہوئے دونوں کے درمیان فطری توازن قائم کرتا ہے اور معاشرہ کے ہر فرد کے ہر اس حق کو تسلیم کرتا ہے جس کی زد اجتماعیت کے تقاضوں پر نہ پڑتی ہو۔

نجی ملکیت کا مسئلہ بھی یہی ہے۔ اسلام نجی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، اس کا احترام کرتا ہے اور اس کی ترغیب دیتا ہے لیکن اسے اجتماعیت کے تقاضوں کا پابند بناتا ہے۔ اسلام فرد کی نجی ملکیت میں معاشرہ کے حقوق متعین کرتا ہے، ان حقوق کی ادائیگی کا نظام پیش کرتا ہے اور اجتماعیت کی نمائندہ ریاست اور حکومت کو ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ مملکت کے تمام شہریوں کے معاشی حقوق کی ضمانت دے۔ اسلام حقوق کی مساوات کا علمبردار ہے، ریاست کے وسائل پر اس کے تمام شہریوں کے یکساں حقوق کا اصول پیش کرتا ہے، خوراک، رہائش، لباس، علاج اور تعلیم کو ہر شہری کا بنیادی حق قرار دے کر ایک اسلامی حکومت کو ان حقوق کی فراہمی کا ضامن قرار دیتا ہے اور ہر مالدار کو پابند کرتا ہے کہ وہ اپنی ملکیت کا ایک متعین حصہ ان اجتماعی معاشی حقوق کی عملداری کے لیے ریاست کو فراہم کرے۔ اسلام ہر شہری کو حق دیتا ہے کہ وہ سرِ عام کھڑا ہو کر حاکمِ وقت سے اپنے حق کا تقاضہ کرے اور سربراہ مملکت کو اس احساس کا خوگر بناتا ہے کہ اگر کسی دریا کے کنارے پر ایک کتا بھی بھوک سے مر جائے تو سربراہِ مملکت خود کو اس کا ذمہ دار سمجھے۔

اس دائرہ میں اسلام نجی ملکیت کا قائل ہے اور اجتماعیت کے حقوق ادا کرتے ہوئے نجی ملکیت کو ہر فرد کا فطری حق قرار دیتا ہے جس کی نفی نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اس فطری حق کی نفی کرنے والے اپنے اس موقف اور عمل پر عملاً قائم رہ سکے ہیں۔

قادیانیت اور ’’انٹرنیشنل تحفظِ ختم نبوت مشن‘‘

(ہفت روزہ خدام الدین، لاہور ۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

(جمعیت علماء اسلام کے ممتاز راہنما اور مرکزی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے سیکرٹری اطلاعات مولانا زاہدالراشدی گزشتہ دنوں برطانیہ کے تبلیغی دورے اور انٹرنیشنل ختم نبوت کانفرنس لندن میں شرکت کے بعد حج بیت اللہ ادا کرتے ہوئے گوجرانوالہ واپس پہنچے اور ہمارے نمائندہ کے ساتھ گفتگو کے دوران انہوں نے اپنے بیرونی دورہ کے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس گفتگو کی رپورٹ درج ذیل ہے ہفت روزہ خدام الدین، لاہور)

سوال: مولانا! آپ کا شمار تحریک ختم نبوت کے ذمہ دار راہنماؤں میں ہوتا ہے اور آپ نے اگست میں لندن میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی ختم نبوت کانفرنس میں شرکت بھی کی ہے، کیا آپ اس کانفرنس کی ضرورت پر روشنی ڈالیں گے؟

جواب: قادیانیت کا مسئلہ بنیادی طور پر پاکستان اور ہندوستان کا مسئلہ ہے لیکن چونکہ اس فتنہ کی تخم ریزی اور آبیاری برطانوی استعمار نے اپنے دور اقتدار میں نوآبادیاتی مقاصد کے لیے کی تھی، اور دنیا میں جہاں برطانوی اقتدار اور اثرات رہے ہیں وہاں اس فتنہ کے قدم بھی پہنچے ہیں۔ بالخصوص پاکستان کے اولین وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان نے اپنے دور وزارت میں وزارت خارجہ کو قادیانیت کی تبلیغ وتوسیع کے لیے پوری طرح استعمال کیا ہے۔ اس لیے دنیا کے مختلف حصوں میں قادیانیت کے اثرات اور مراکز موجود ہیں اس لیے ایک عرصہ سے اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ عالمی سطح پر قادیانیوں کی سرگرمیوں کا تعاقب منظّم طور پر کیا جائے۔ پھر پاکستان میں امتناع قادیانیت آرڈیننس کے نفاذ کے بعد مرزا طاہر احمد نے ملک سے فرار اختیار کر کے لندن کو اپنی سرگرمیوں کا ہیڈکوارٹر بنالیا اور وہاں قادیانی جماعت کا مرکز قائم کر کے پاکستان اور اسلام کے

خلاف پراپیگنڈا کی مہم تیز کر دی تو اس ضرورت کا احساس دو چند ہو گیا۔

چنانچہ گزشتہ سال مکہ مکرمہ میں چند سرکردہ علماء نے جن میں مکہ مکرمہ کے الشیخ مولانا عبدالحفیظ المکی اور مولانا محمد مکی حجازی اور پاکستان سے مولانا منظور احمد چنیوٹی اور مولانا محمد ضیاء القاسمی سرفہرست ہیں۔ باہمی مشورہ کے بعد ''انٹرنیشنل ختم نبوت مشن'' کے قیام اور لندن میں بین الاقوامی ختم نبوت کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عالمی سطح پر قادیانیوں کے یکطرفہ پراپیگنڈا کا مؤثر جواب دیا جائے اور مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو اس کانفرنس کے بارے میں بیدار کیا جائے۔

سوال: برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کا اس کانفرنس کے بارے میں کیا طرز عمل رہا؟

جواب: برطانیہ میں مقیم بہت سے مسلمان پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور دیگر مختلف ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے کام کا میدان ان تین ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلمان تھے، اور ان مسلمانوں نے اگست ۱۹۸۵ء کے دوران لندن میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ کانفرنس سے قبل برطانیہ کے مختلف شہروں میں ختم نبوت کے عنوان پر اجتماعات رکھے گئے تھے جن میں مسلمانوں نے بھاری تعداد میں پورے جوش وخروش کے ساتھ شرکت کی اور برطانیہ میں مقیم علماء کی ایک بڑی تنظیم ''جمعیت علماء برطانیہ'' نے باقاعدہ تنظیمی حیثیت سے کانفرنس کی کامیابی کے لیے ملک کے طول وعرض میں محنت کی۔

سوال: ختم نبوت کا مسئلہ عام مسلمانوں کا مشترکہ مسئلہ ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ اس کانفرنس میں دیوبندی مکتب فکر کے سوا دوسرے مکاتب فکر کو شریک نہیں کیا گیا؟

جواب: ہم یہاں سے اسی جذبہ کے ساتھ گئے تھے کہ پاکستان کی طرح یورپ میں بھی تمام مکاتب فکر کے اشتراک کے ساتھ قادیانیت کے خلاف مشترکہ محاذ قائم کیا جائے لیکن وہاں پہنچنے کے بعد فرقہ وارانہ کشیدگی کی ایسی افسوسناک صورتحال سامنے آئی کہ فوری طور پر تمام مکاتب فکر کے ذمہ دار حضرات کو ایک جگہ جمع کرنا بظاہر مشکل نظر آ رہا تھا۔ یہ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ یورپ کا

معاشرہ جو گھریلو زندگی کے تصور اور قلبی سکون سے یکسر محروم ہونے کے باعث اسلام کی تبلیغ کا سب سے بڑا میدان بن سکتا ہے، وہاں فرقہ وارانہ کشمکش کی شدت اسلام کی تبلیغ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے بلکہ اسلام سے نفرت کا سبب بن رہی ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے اور مساجد کے جھگڑے اس قدر سنگین ہیں کہ الامان والحفیظ۔

اس صورتحال کو دیکھ کر ہم نے محسوس کیا کہ پہلی ''بین الاقوامی ختم نبوت کانفرنس'' کے موقع پر ایسا کوئی رسک نہیں لینا چاہیے جو کانفرنس کے بنیادی مقاصد میں ہی نقصان کا باعث بن جائے۔ چنانچہ ہم نے طے کیا کہ کانفرنس اور اس سے قبل ملک گیر دوروں میں فرقہ وارانہ اختلافات کو مثبت یا منفی کسی طور پر بھی چھیڑے بغیر اپنی ساری توجہ کانفرنس کے بنیادی مقاصد پر مرکوز رکھیں گے۔

اس حکمت عملی کا یہ فائدہ ہوا کہ بالآخر دوسرے مکاتب فکر کے راہنماؤں کو بھی کانفرنس کے مقاصد کی اہمیت اور منتظمین کے خلوص کا احساس ہو گیا اور کانفرنس سے قبل بریلوی مکتب فکر کی نمائندہ تنظیم ''ورلڈ اسلامک مشن برطانیہ'' اور اہل حدیث مکتب فکر کی تنظیم ''جمعیت اہل حدیث برطانیہ'' نے اخبارات میں باقاعدہ اشتہارات اور قراردادوں کے ذریعے بین الاقوامی ختم نبوت کانفرنس کی مکمل حمایت کا اعلان کر دیا جس کے بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے اور مشترکہ جدوجہد کے سلسلہ میں محسوس کیے جانے والے خدشات کے ازالہ کے ساتھ آئندہ کے لیے تمام مکاتب فکر کے مشترکہ اجتماعات کی راہ ہموار ہو گئی۔

سوال: کانفرنس میں کن ممالک سے علماء شریک ہوئے؟

جواب: کانفرنس میں شرکت اور خطاب کرنے والے علماء میں بھارت سے جمعیت علماء ہند کے صدر مولانا سید اسعد مدنی، بنگلہ دیش کے بزرگ دینی وسیاسی راہنما حافظ جی حضور، رابطہ عالم اسلام کے نمائندہ ڈاکٹر حسن الاہدل، سعودی سفارت خانہ کے نمائندہ الشیخ ناجی صادق المفتی، مصر کے الشیخ زاہران، متحدہ عرب امارات کے الشیخ خلیل اور الشیخ اشتیاق حسین عثمانی، کینیڈا سے مولانا مظہر عالم اور پاکستان سے تحریک ختم نبوت کے سربراہ حضرت مولانا خان محمد کے علاوہ علامہ خالد محمود، مولانا منظور احمد چنیوٹی، مولانا محمد ضیاء القاسمی، مولانا محمد زکریا ایم پی اے کراچی، مولانا مفتی احمد الرحمان، مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مولانا محمد حنیف جالندھری، مولانا سید عبدالقادر آزاد، مولانا

محمد یوسف خان آزاد کشمیر، مولانا میاں محمد اجمل قادری، مولانا قاری عبد الحئی عابد، مولانا عبد الرؤف ربانی اور دیگر حضرات بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

سوال: کانفرنس کی صدارت کس نے کی اور تقاریر کن زبانوں میں ہوئیں؟

جواب: کانفرنس کی دو نشستیں ہوئیں۔ پہلی نشست کی صدارت مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے امیر حضرت مولانا خان محمد نے اور دوسری نشست کی صدارت جمعیت علماء ہند کے سربراہ حضرت مولانا سید اسعد مدنی نے کی۔ جبکہ انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کے سربراہ الشیخ عبد الحفیظ المکی دونوں نشستوں میں اور مصر کے الشیخ زہران اور سعودی عرب کے الشیخ صادق ناجی المفتی ایک نشست میں معاون صدر رہے۔ کانفرنس میں مجموعی طور پر پچاس سے زائد تقریریں ہوئیں اور یہ تقاریر تین زبانوں، اردو، عربی اور انگریزی میں ہوئیں۔

سوال: مرزا طاہر احمد نے گزشتہ دنوں اس کانفرنس کے بارے میں کہا ہے کہ حاضری کم تھی اور مقررین نے گالیاں دی ہیں اور عام لوگوں نے اس میں دلچسپی نہیں لی۔

جواب: مرزا صاحب نے یہ کہہ کر اپنے حواریوں کو تسلی دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ کانفرنس کی حاضری کی صورتحال یہ تھی کہ بڑے ہال میں ۲۷ باقاعدہ نشستوں کے علاوہ ۵۰۰ زائد کرسیاں لگوائی گئی تھیں اور اس کے ساتھ ایک اور فرشی نشست والا ہال نماز کے لیے الگ حاصل کیا گیا تھا۔ کانفرنس کا آغاز صبح دس بجے ہوا اور ساڑھے گیارہ بجے تک تمام نشستیں، سیڑھیاں اور راستے پر ہو کر لوگ نماز والے خالی ہال میں جانا شروع ہو گئے تھے، اور پھر یہ کیفیت شام سات بجے تک اسی طرح رہی۔ لندن کے اخبارات کی رپورٹ کے مطابق لندن میں مسلمانوں کی اب تک منعقد ہونے والی عوامی کانفرنسوں میں یہ سب سے بڑی کانفرنس تھی۔

جہاں تک گالیوں اور بدزبانی کا تعلق ہے اس کا قصہ بھی سن لیں۔ ہمارے وہاں پہنچنے کے بعد قادیانیوں نے مختلف ذرائع سے یہ پراپیگنڈا کیا کہ مولوی حضرات بدزبانی کرتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں ہم نے قادیانیوں کو آئینہ دکھانے کے لیے کانفرنس کے ایک مقرر مولانا اللہ وسایا کے ذمہ یہ موضوع لگایا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی اپنی کتابوں سے وہ اقتباسات

پڑھ کر سنائیں جن میں مرزا صاحب آنجہانی نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور دوسرے اکابر علماء کو گالیاں دی ہیں۔ تاکہ تہذیب و شرافت کا شب و روز ڈھنڈورا پیٹنے والوں کے اپنے پیشوا کی زبان کا لوگوں کو علم ہو۔ اگر ان گالیوں کے سنانے سے مرزا طاہر احمد کو دکھ ہوا ہے تو اس کا شکوہ کانفرنس کے مقررین سے کرنے کی بجائے انہیں اپنے آنجہانی دادا مرزا غلام احمد قادیانی کی قبر پر کرنا چاہیے۔

سوال: کیا آپ کانفرنس کی کامیابی اور اس کے نتائج سے پوری طرح مطمئن ہیں؟

جواب: بحمد اللہ تعالیٰ کانفرنس پوری طرح کامیاب ہوئی ہے اور اس کے اثرات بھی ہماری توقعات سے بڑھ کر ہوئے ہیں۔ کامیابی کے بارے میں تو پہلے بتا چکا ہوں، نتائج اور ثمرات کے بارے میں آپ دو باتوں سے اندازہ کر لیں۔

ایک یہ کہ کانفرنس کے فوراً بعد جب اس کی خبریں یورپ کے دوسرے ممالک میں پہنچیں تو کینیڈا، مغربی جرمنی اور دیگر ممالک کی طرف سے تقاضے شروع ہو گئے ہیں کہ ان کے ممالک میں اس نوع کی کانفرنسیں منعقد کی جائیں۔ لیکن اس کے بعد حج بیت اللہ کا موسم آ جانے کے باعث ان ممالک میں کانفرنسوں کا فوری انعقاد نہ ہو سکا۔ اب ان شاء اللہ ان کا پروگرام جلدی طے ہو گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کانفرنس سے ہمارا سب سے بڑا مقصد اس فتنہ کے سلسلہ میں یورپی مسلمانوں کو بیدار کرنا اور وہاں کی رائے عامہ کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا تھا کہ اسلام اور قادیانیت دو الگ الگ مذہب ہیں۔ قادیانیوں کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور قادیانی گروہ کے راہنما خود کو مسلمان ظاہر کر کے اور اسلام کا نام استعمال کر کے دنیا کو اشتباہ اور دھوکہ کی جس کیفیت میں رکھنا چاہتے ہیں، ملت اسلامیہ کے لیے وہ قابل برداشت نہیں ہے۔ چنانچہ اس مقصد میں ہمیں کامیابی حاصل ہوئی ہے، وہاں کے مسلمانوں نے قادیانیوں کے سوشل بائیکاٹ اور انہیں مسلمانوں کی ایسوسی ایشنوں سے نکالنے کی مہم شروع کر دی ہے۔

کانفرنس کے بعد قادیانیوں نے باٹلے اور بریڈ فورڈ میں ''احمدیہ مسلم ایسوسی ایشن'' کے نام اور ''جلسہ ختم نبوت'' کے عنوان سے اجتماعات کا اعلان کیا جس پر وہاں کے مسلمانوں نے مقامی حکام

سے احتجاج کیا اور انہیں اپنے موقف سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ قادیانی اپنا اجتماع ضرور کریں لیکن ''ختم نبوت'' اور ''مسلم'' کے عنوان سے ہم انہیں جلسہ نہیں کرنے دیں گے۔ اس سے دھوکہ اور اشتباہ پیدا ہوتا ہے۔ برطانوی حکام نے مسلمانوں کے موقف کو تسلیم کرتے ہوئے قادیانی اجتماعات کے لیے پہلے سے کی ہوئی پبلک ہال کی بکنگ منسوخ کر دی۔

یہ واقعات اس امر پر شاہد ہیں کہ کانفرنس اپنے مقاصد کے لحاظ سے کامیاب رہی ہے۔

سوال: اب ذرا اپنے ملک میں واپس آتے ہیں، یہ بتائیں کہ کیا آپ تحریک ختم نبوت کی موجودہ صورتحال سے مطمئن ہیں اور اس سلسلہ میں کیا تقاضے محسوس کرتے ہیں؟

جواب: مطمئن ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ ابھی بہت سا کام باقی ہے۔ آئینی اور قانونی طور پر غیر مسلم قرار دیے جانے اور اسلامی اصطلاحات کے استعمال سے قادیانیوں کو روک دیے جانے کے بعد ان آئینی و قانونی اقدامات پر عملدرآمد کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں سے عملدرآمد کے غیر مؤثر ہونے کی شکایات موصول ہو رہی ہیں اور بااثر قادیانی افسران ان میں مسلسل رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ مولانا محمد اسلم قریشی کی بازیابی کا مسئلہ ابھی جوں کا توں ہے، کلیدی آسامیوں سے قادیانیوں کی علیحدگی کے بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا، ارتداد کی شرعی سزا کے نفاذ کا مطالبہ ابھی پورا نہیں ہوا، اس کے علاوہ اور بھی اہم مسائل ابھی حل طلب ہیں۔ اس لیے تحریک ختم نبوت کو ازسرنو منظّم کرنے اور تمام مکاتب فکر کے ذمہ دار راہنماؤں کو اعتماد میں لیتے ہوئے اس جدوجہد کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

سوال: آپ نے مولانا اسلم قریشی کی بازیابی کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں تازہ صورتحال کیا ہے؟

جواب: اسلم قریشی کیس کے سلسلہ میں تازہ صورتحال یہ ہے کہ گوجرانوالہ کے ڈی آئی جی پولیس میجر مشتاق احمد کی سربراہی میں بننے والی ٹیم کے پاس یہ کیس آنے کے بعد سے تفتیش کا کام قطعی طور پر معطل ہے اور برائے نام بھی کوئی کام نہیں ہو رہا۔ ''مرکزی مجلس عمل'' نے اس ٹیم پر عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے لیکن نہ تو اس ٹیم کو بدلا گیا ہے اور نہ ہی یہ ٹیم کچھ کر رہی ہے۔ حال ہی میں اسلم قریشی اغوا کیس کے سلسلہ میں کچھ اور شواہد سامنے آئے ہیں جن کی بنیاد پر تفتیش کو آگے بڑھایا جا

سکتا ہے۔لیکن موجودہ ٹیم تک ان امور کو پہنچانے کو ہم ان قرائن کو سامنے کر دینے کے مترادف سمجھتے ہیں، اس لیے نئی ٹیم کے انتظار میں ہیں۔

سوال: کیا انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کی پاکستان میں شاخ قائم کی جا رہی ہے؟

جواب: میں انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کا باقاعدہ ممبر نہیں ہوں اس لیے پوری ذمہ داری سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ میری معلومات کے مطابق مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان اور انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کے درمیان لندن میں ہی یہ سمجھوتا طے پا گیا ہے کہ پاکستان میں تحریک ختم نبوت کی راہنمائی اور قیادت مجلس تحفظ ختم نبوت کرے گی، اور بیرون ملک اس جدوجہد کو مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے امیر مولانا خان محمد ہی کی زیرنگرانی انٹرنیشنل ختم نبوت مشن آگے بڑھائے گا۔اس لیے میرے خیال میں غالباً پاکستان میں مشن کی شاخ قائم نہیں کی جائے گی۔

سوال: مشن کے راہنماؤں کا مختصر تعارف کرا دیجئے۔

جواب: انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کے سرپرست مولانا اسعد مدنی اور مولانا خان محمد بھارت اور پاکستان کی معروف شخصیات ہیں۔نائب امیر مولانا منظور احمد چنیوٹی جنرل سیکرٹری، مولانا محمد ضیاء القاسمی اور رکن شوریٰ علامہ خالد محمود بھی تحریک ختم نبوت کے معروف راہنماؤں میں سے ہیں اور قادیانیت کے محاذ پر ان کی خدمات تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔البتہ مشن کے سربراہ مولانا عبدالحفیظ مکی پاکستان کے عوامی حلقوں میں زیادہ متعارف نہیں ہیں اس لیے ان کے بارے میں مختصراً یہ عرض ہے کہ مولانا عبدالحفیظ مکی پاکستان ہی کے رہنے والے ہیں جنہیں اب سعودی عرب کی شہریت حاصل ہے۔مکہ مکرمہ میں ایک عرصہ سے مقیم ہیں، کتابوں کا کاروبار کرتے ہیں اور مکہ مکرمہ کے معروف دینی ادارہ مدرسہ صولتیہ کے استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ کے خلیفہ مجاز ہیں۔ایک ممتاز علمی اور روحانی شخصیت ہونے کے علاوہ دینی جذبہ اور ملی درد رکھنے والے باہمت راہنما ہیں اور انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کے قیام اور بین الاقوامی ختم نبوت کانفرنس کے انعقاد میں شخصی طور پر سب سے زیادہ انہی کی تگ ودو کا حصہ ہے۔ان کی خواہش ہے کہ مشن کے کام کو پوری دنیا میں پھیلا دیا جائے اور ہر سطح پر قادیانیت کا تعاقب کیا جائے۔

سوال: مرکزی مجلس عمل کے راہنما تحریک ختم نبوت کو آگے بڑھانے کے لیے کیا طرز عمل اختیار کر رہے ہیں؟

جواب: ہمارے کام کا میدان اور طریق کار تو یہی ہوتا ہے کہ تمام مکاتب فکر کے راہنماؤں اور علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش ہوتی ہے، رائے عامہ کو تحریک ختم نبوت کے مطالبات کے سلسلہ میں منظّم کیا جاتا ہے اور عوامی دباؤ کے ذریعے حکومت کو مطالبات کی منظوری کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب بھی یہی طریق کار اختیار ہوگا۔ ویسے تو اسلام کے نفاذ کی دعویدار حکومت کو ختم نبوت جیسے اہم دینی مسئلہ کے عملی تقاضوں کی تکمیل کے لیے عوامی مطالبات اور دباؤ کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اس کا اپنا کام ہے اور اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ مولانا محمد اسلم قریشی کا سراغ لگائے اور تحریک ختم نبوت کے مطالبات کو پورا کرے۔ تاہم اس سلسلہ میں مجلس عمل کے مرکزی راہنما باہمی رابطہ قائم کر رہے ہیں۔ اکتوبر کی ۲۴ اور ۲۵ تاریخ کو ربوہ میں دو روزہ کل پاکستان ختم نبوت کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس میں مرکزی مجلس عمل کے راہنما جمع ہوں گے، جبکہ ساہیوال کے شہدائے ختم نبوت قاری بشیر احمد اور اظہر رفیق کی شہادت کو ایک سال مکمل ہونے پر ۲۶ اکتوبر کو ساہیوال میں شہدائے ختم نبوت کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ اس موقع پر بھی مختلف مکاتب فکر کے راہنماؤں کا اجتماع ہوگا اور باہمی صلاح مشورہ کے ساتھ تحریک ختم نبوت کو آگے بڑھانے کے لیے کوئی لائحہ عمل طے کر لیا جائے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

’’شریعت بل‘‘ کے حوالے سے چند سوالات

(ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، لاہور ـ ۲۸ نومبر ۱۹۸۶ء)

(متحدہ شریعت محاذ کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا زاہد الراشدی سے انٹرویو)

سوال: سینٹ میں مولانا سمیع الحق اور قاضی عبد اللطیف کے پیش کردہ پرائیویٹ شریعت بل کے بارے میں اس وقت قومی حلقوں میں جو بحث جاری ہے اس کی روشنی میں شریعت بل کی افادیت اور ضرورت پر کیا آپ کچھ روشنی ڈالیں گے؟

جواب: جہاں تک ضرورت کا تعلق ہے وہ تو واضح ہے کہ تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان میں دی جانے والی مسلسل قربانیوں کا مقصد محض چہروں اور ناموں کی تبدیلی نہیں تھا۔ بلکہ تحریکِ آزادی، تحریکِ پاکستان اور تحریک نظامِ مصطفیٰ ؐ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ملک کا نظام تبدیل ہو اور فرنگی استعمار نے اپنے دورِ اقتدار میں جو نظام زندگی کے مختلف شعبوں میں مسلط کیا ہے اس کی جگہ مسلمانوں کے عقائد اور جذبات کے مطابق اسلامی نظام ملک میں نافذ ہو۔ شریعت بل اسی مقصد کو پورا کرنے کی ایک عملی کوشش ہے اور اس کے ذریعے ملک میں پہلی بار ایک ایسے اقدام کی بات کی گئی ہے جو صرف ناموں یا چہروں کی بجائے نظام کی تبدیلی کا آئینہ دار ہے۔

باقی رہی بات افادیت کی تو اس میں بحث ہو سکتی ہے اور شریعت بل کو نظام کی تبدیلی کے لیے زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کی کسی بھی تجویز کو قبول کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ ترمیم اس کی افادیت میں اضافہ کے لیے ہو، اس میں کمی یا اسے غیر مؤثر بنانے کے لیے نہ ہو۔

سوال: کیا شریعت بل کے بارے میں حکومت کے رویہ سے آپ مطمئن ہیں؟

جواب: قطعاً نہیں، کیونکہ حکمران پارٹی کا رویہ شریعت بل کو سینٹ میں بحث کے لیے منظور

کرنے کی مخالفت سے لے کر اس کے متبادل سرکاری مسودہ پیش کرنے تک کا ایک ایک مرحلہ حکومت کی ٹال مٹول اور پیچھا چھڑانے کی پالیسی کا مظہر ہے۔ حالانکہ حکمران گروہ کے لیے اس میں تاخیر کا کوئی جواز نہیں ہے۔

(۱) اول اس لیے کہ صدر مملکت اپنی صدارت کا جواز ہی اسلام کے نام پر کرائے جانے والے ریفرنڈم کو پیش کرتے ہیں اور وزیر اعظم نے اپنی ترجیحات میں نفاذِ اسلام کو پہلے نمبر پر رکھا ہوا ہے۔

(۲) دوم اس لیے کہ سینٹ کی طرف سے شریعت بل کو حکمران پارٹی کے کہنے پر عوامی رائے کے لیے مشتہر کیا گیا جو اگرچہ اصولی طور پر غلط فیصلہ تھا لیکن اس کے باوجود شریعت بل کے حق میں ملک کے طول و عرض سے عوام نے اس قدر خطوط لکھے کہ خود وزیر قانون نے سینٹ میں اسے پاکستان کی پوری پارلیمانی تاریخ کا ایک ریکارڈ واقعہ قرار دیا اور کہا کہ اس سے قبل کسی بل کو اتنی زبردست عوامی حمایت حاصل نہیں ہوئی۔

(۳) سوم اس لیے کہ حکومت نے خود شریعت بل کو اسلامی نظریاتی کونسل کے سپرد کیا جو حکومت ہی کا قائم کردہ ادارہ ہے، اور اسلامی نظریاتی کونسل نے شریعت بل کے مقاصد اور بنیادی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے اسے از سر نو مرتب کر دیا جسے متحدہ شریعت محاذ نے قبول کر لیا ہے لیکن حکومت نے اسے مسترد کر دیا ہے۔

ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد حکومت کے لیے کوئی اصولی اور اخلاقی جواز نہیں رہا کہ وہ شریعت بل کی منظوری میں رکاوٹ ڈالے۔

سوال: حکومت کے ساتھ متحدہ شریعت محاذ کے مذاکرات اب کس مرحلہ میں ہیں؟

جواب: مذاکرات تعطل کا شکار ہو چکے ہیں کیونکہ حکومت ہٹ دھرمی اور ضد سے کام لے رہی ہے۔ متحدہ شریعت محاذ کا موقف یہ ہے کہ شریعت بل میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ کی جائے، اور اگر کوئی ترمیم ناگزیر ہو تو اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے دائرہ میں رہتے ہوئے ترمیم کر لی جائے۔ جبکہ حکومت نے شریعت بل اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات دونوں کو مسترد کرتے ہوئے

اپنی طرف سے ایک متبادل مسودہ دے دیا ہے جو متحدہ شریعت محاذ کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔

سوال: پرائیویٹ شریعت بل اور سرکاری مسودہ میں فرق کیا ہے؟

جواب: پرائیویٹ شریعت بل اور سرکاری مسودہ میں چار اہم فرق ہیں:

(۱) پہلا فرق یہ ہے کہ شریعت بل میں شریعت کی تعبیر وتشریح کے لیے دفعہ ۲ اور دفعہ ۱۲ میں جو الگ الگ تفصیلات دی گئی ہیں انہیں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کی روشنی میں دفعہ ۲ کی شق ب میں سمو کر اسے زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ اور اسلامی نظریاتی کونسل کی یہی ایک سفارش ہے جسے سرکاری مسودہ میں قبول کیا گیا ہے۔ اب شریعت کی تعبیر یوں کی گئی ہے:

''شریعت سے مراد قرآن وسنت میں مذکور احکامِ اسلام ہیں۔ توضیح: احکامِ اسلام کی تعبیر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل مآخذ سے راہنمائی حاصل کی جائے گی: (۱) اجماعِ امت (۲) سنت خلفاء راشدین (۳) تعاملِ صحابہؓ (۴) مسلم فقہاء اسلام کی تشریحات۔''

اس تعبیر سے متحدہ شریعت محاذ نے بھی اتفاق کیا ہے اور اب یہ متفقہ تشریح قرار پائی ہے۔

(۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ سرکاری مسودہ میں شریعت بل کی دفعہ ۶، ۱۳ اور ۱۶ تینوں حذف کر دی گئی ہیں جو بالترتیب یہ ہیں:

دفعہ ۶: انتظامیہ کا کوئی بھی فرد بشمول صدرِ مملکت اور وزیر اعظم شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا۔

دفعہ ۱۳: انتظامیہ، عدلیہ اور مقنّنہ کے ہر فرد کے لیے فرائضِ شریعت کی پابندی اور محرماتِ شریعت سے اجتناب کرنا لازم ہوگا۔

دفعہ ۱۶: شریعت نے جو بنیادی حقوق باشندگانِ ملک کو دیے ہیں ان کے خلاف کوئی حکم نہیں دیا جائے گا۔

ہمارے نزدیک ان دفعات کو حذف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حکمران گروہ اسلامی احکام

کی پابندی کے سلسلہ میں اپنے اوپر کوئی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

(۳) تیسرا فرق یہ ہے کہ شریعت بل کی دفعہ ۷ میں کہا گیا ہے کہ

''حکومت کے تمام عمال بشمول صدرِ مملکت اسلامی قانونِ عدل کے مطابق عدالتی احتساب سے بالاتر نہیں ہوں گے۔''

جسے سرکاری مسودہ میں یوں تبدیل کیا گیا ہے:

''حکومت کے تمام عہدہ دار اسلامی عدل اور جواب دہی کے نظام کے تابع ہوں گے۔''

اب ''عدالتی احتساب سے بالاتر نہ ہونے'' اور ''جواب دہی کے نظام کے تابع ہونے'' میں جو فرق ہے اس کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ظاہر بات ہے کہ لفظی ہیر پھیر کے ساتھ سابقہ صورتحال کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۴) چوتھا فرق جو سب سے زیادہ اہم ہے وہ دفعہ ۴ کی تبدیلی ہے۔ شریعت بل کی دفعہ ۴ یہ ہے کہ

''ملک کی تمام عدالتیں تمام امور و مقدمات میں شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہوں گی۔''

اسے سرکاری مسودہ میں یوں بدل دیا گیا ہے کہ

''کوئی عدالت کسی ایسے قانون کی بنیاد پر کسی مقدمہ کا فیصلہ نہیں کرے گی جو شریعت کے منافی ہو۔ اور اگر یہ سوال پیدا ہو کہ ایسا کوئی قانون شریعت کے منافی ہے تو یہ معاملہ وفاقی شرعی عدالت کو فیصلے کے لیے سپرد کر دیا جائے گا، سوائے اس کے کہ اس سوال کا اس عدالت نے یا عدالتِ عظمیٰ کے شریعت ایپلٹ بینچ نے پہلے ہی فیصلہ کر دیا ہو۔''

دونوں کا فرق واضح ہے کہ شریعت بل کی دفعہ ۴ کا تقاضہ ملک میں مروجہ قوانین کی مکمل تبدیلی ہے کیونکہ اس کے نفاذ کے ساتھ تمام عدالتوں کا قانونی نظام یکسر بدل جائے گا جو نفاذِ اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ مگر سرکاری مسودہ میں الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ موجودہ قوانین کو برقرار رکھنے

اور وفاقی شریعت کورٹ کے طویل تدریجی عمل کے ذریعے قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اسی لیے متحدہ شریعت محاذ نے متبادل سرکاری مسودہ مسترد کر دیا ہے۔

سوال: یہ بات کہاں تک درست ہے کہ شریعت بل کے ساتھ اجتہاد کا دروازہ بند ہو جائے گا؟

جواب: بالکل غلط بات ہے بلکہ شریعت بل تو جائز اجتہاد کی ضمانت دیتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اجتہاد کا مفہوم غلط سمجھ لیا گیا ہے، عام طور پر بعض حلقوں کی طرف سے اجتہاد کا یہ مطلب پیش کیا جاتا ہے کہ شریعت کے جس مسئلہ کو دورِ حاضر کے کسی تقاضے سے متصادم سمجھ لیا جائے تو اس میں شرعی مسئلہ کو ایسی لچک دے دی جائے کہ جدید دور کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکے۔ حالانکہ یہ اجتہاد نہیں بلکہ سراسر تحریف ہے جو دین کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔ قرآن کریم سے پہلی آسمانی کتابوں تورات، انجیل، زبور اور ان کی شریعتوں کا حلیہ اسی قسم کے نام نہاد اجتہاد کے ذریعے بگاڑا گیا تھا۔ اور یہ دینی احکام و مسائل کو دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق ڈھالتے رہنے کا ہی نتیجہ ہے کہ ان شریعتوں اور آسمانی کتابوں کا اصلی وجود تک دنیا میں ناپید ہو گیا ہے۔ اجتہاد کے نام پر اس قسم کی شرعی تحریف کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اجتہاد کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ جس مسئلہ میں قرآن وسنت کی واضح ہدایت موجود نہ ہو اس میں مجتہد درجہ کے علماء قرآن وسنت کے اصولوں کی روشنی میں کوئی فیصلہ دیں۔ یہ اجتہاد ہر دور میں موجود رہا ہے اور آج بھی ہے۔ شریعت بل نے بھی اس اجتہاد کی کوئی نفی نہیں کی بلکہ وفاقی شرعی عدالت کو قوانین کی شرعی حیثیت کے تعین کا اختیار دے کر اجتہاد کی ذمہ داری میں علماء کے ساتھ جسٹس صاحبان کو بھی شریک کر دیا ہے جو یقیناً ایک بہت بڑی وسعت پسندی کی بات ہے۔ ہاں منصوص مسائل میں ردوبدل کا اختیار ہم کسی کو نہیں دیتے، نہ کسی پارلیمنٹ کو، نہ رائے عامہ کو اور نہ ہی کسی اور تھارٹی کو۔ کیونکہ اس کے بارے میں قرآن کریم کا حکم سورۃ الاحزاب میں بالکل واضح اور دوٹوک ہے کہ

”اور کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کسی مسئلہ کا فیصلہ کر دیں تو وہ اس میں اپنی رائے اور اختیار کو استعمال

کریں۔‘‘

سوال: عام طور پر شریعت بل کو ۱۹۷۳ء کے دستور کے منافی قرار دیا جا رہا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: یہ سوال وضاحت طلب ہے۔ اگر تو ۱۹۷۳ء کا دستور مکمل اسلامی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی اور شریعت بل کی ضرورت نہیں تو یہ کہنے والوں کو ۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کے بارے میں وضاحت کرنی چاہیے کہ ۱۹۷۳ء کے دستور کے نافذ ہوتے ہوئے اس تحریک کا کیا جواز تھا، کیونکہ اسلام تو ۱۹۷۳ء کے دستور کی صورت میں مکمل نافذ تھا۔ اور اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت بل کے مؤثر نفاذ کے لیے ۱۹۷۳ء کے دستور کی کچھ دفعات میں ترمیم ضروری ہے جیسا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے بھی یہی ہے تو ہم بلا تامل یہ کہیں گے کہ دستور کی ان دفعات میں ضرور ترمیم ہونی چاہیے۔ اگر ایم آر ڈی ۱۹۷۳ء کے دستور میں دی گئی صوبائی خودمختاری کی حدود کو مسترد کر کے نئی حدود متعین کر سکتی ہے تو نفاذِ شریعت کے لیے ۱۹۷۳ء کے دستور کی کچھ دفعات کے اِدھر اُدھر ہو جانے سے کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔

سوال: ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ غیر نمائندہ اسمبلیوں اور متنازعہ حکومت کے سامنے شریعت بل کو پیش کرنا غلط ہے۔

جواب: حیرت کی بات ہے کہ موجودہ اسمبلیوں اور حکومت کو غیر نمائندہ قرار دینے والے اپنے مطالبات کے لیے تو اسی حکومت کو مخاطب کرتے ہیں اور الیکشن کی تاریخ کے اعلان کی صورت میں مذاکرات کی پیشکش بھی اسی حکومت کو کرتے ہیں لیکن شریعت بل کے بارے میں وہ موجودہ اسمبلیوں کے سامنے مطالبہ رکھنے پر معترض ہیں۔ یہ اعتراض برائے اعتراض ہے کیونکہ یہ کوئی اصول نہیں کہ حکومت کا جواز متنازعہ ہو تو اس کے سامنے مطالبات ہی نہ رکھے جائیں۔ ہمارے بزرگوں نے تو انگریز کے دور میں ’’شریعت ایکٹ‘‘ منظور کرانے اور صوبہ سرحد میں عورتوں کو وراثت کا شرعی حق دلانے کی جدوجہد کی تھی جبکہ وہ اسی حکومت کو قطعی ناجائز قرار دے کر اس سے صرف حکومت نہیں بلکہ ملک چھوڑ دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

سوال: جب آپ خود بھی کہتے ہیں کہ موجودہ حکومت سے نفاذِ اسلام کے سلسلہ میں کوئی توقع نہیں ہے تو پھر

جدوجہد کا فائدہ؟

جواب: یہ اصول کب سے طے ہوگیا ہے کہ حکومت سے جس کام کی توقع نہ ہو اس کا مطالبہ ہی چھوڑ دیا جائے اور اس کے لیے جدوجہد ترک کر دی جائے؟ کیا شریعت بل کے مخالفین کو اپنے مطالبات اور جدوجہد کے سلسلہ میں حکومت سے کوئی توقع ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیا پھر وہ آرام سے بیٹھ جائیں گے؟ یہ بات اصولاً غلط ہے، حکومت سے توقع ہو یا نہ ہو ہمارا کام ملک میں بہتر تبدیلی کے لیے محنت کرنا ہے اور وہ ہم جاری رکھیں گے۔

سوال: شریعت بل کو مودودی ازم سے بھی تعبیر کیا جا رہا ہے، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: یہ شوشہ پیر صاحب آف پگارا نے چھوڑا ہے جنہیں شوشے چھوڑنے کی عادت ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا نورانی جیسے سنجیدہ شخص نے بھی اس شوشے کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے حالانکہ یہ قطعی خلافِ واقعہ بات ہے۔ شریعت بل مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبد اللطیف نے پیش کیا ہے اور ان دونوں کا تعلق جمعیت علماء اسلام سے ہے۔ پھر جماعتِ اسلامی کے ساتھ دینی حلقوں کے اختلافات معروف اور واضح ہیں اور ان اختلافات کے حوالے سے شریعت بل کی کسی ایک دفعہ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جسے ملک کے عام دینی حلقوں کے موقف کے خلاف اور جماعتِ اسلامی کے مخصوص نظریات پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہو۔ اگر مولانا نورانی ایسی کسی ایک شق کی نشاندہی بھی کر دیں تو ہم اسے ان کی خواہش کے مطابق تبدیل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن کسی دلیل کے بغیر صرف ''مودودی ازم'' کی رٹ لگائے جانا محض الزام تراشی ہے۔

جماعتِ اسلامی شریعت بل کے مسئلہ پر ہمارے ساتھ ہے، متحدہ شریعت محاذ میں شریک ہے اور شریعت بل کی غیر مشروط حمایت کر رہی ہے۔ ہم اس کے شکرگزار ہیں لیکن شریعت بل مودودی ازم نہیں ہے بلکہ ملک کے قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے ایک ایسی دستاویز ہے جسے تمام مکاتبِ فکر کے سنجیدہ علماء اور راہنماؤں کی حمایت حاصل ہے۔

سوال: شریعت بل کے خلاف اسلام آباد میں خواتین کے مظاہرہ پر آپ کا ردعمل کیا ہے؟

جواب: ہم ان مٹھی بھر خواتین کو ملک کی کروڑوں دیندار خواتین کا نمائندہ نہیں سمجھتے جو پاکستان

کے مشرقی اور اسلامی معاشرہ کو ایک ایسے وقت میں مغربی معاشرہ کی پیروی کی دعوت دے رہی ہیں جبکہ خود یورپ کے دانشور اپنے معاشرہ میں عریانی، بے راہ روی اور گھریلو بے سکونی سے عاجز آچکے ہیں۔ ملک کی کروڑوں خواتین قرآن وسنت پر پختہ ایمان رکھتی ہیں اور قرآن وسنت کی واضح ہدایات اور احکام کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ پھر خواتین کے یہ مظاہرے ہمارے نزدیک خود حکومت کے ایماء پر ہورہے ہیں کیونکہ حکومت کے بعض وزراء ایک عرصہ سے شریعت بل کے مخالف عناصر کو ابھارنے اور طبقاتی اختلافات کو ہوا دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان مظاہروں کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ہماری جدوجہد ملک کے نظام کو اسلامی تقاضوں کے مطابق تبدیل کرنے کے لیے ہے اور یہ جدوجہد کسی مخالفت کی پروا کیے بغیر نتائج کے حصول تک ان شاء اللہ تعالیٰ جاری رہے گی۔

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

(جنوری ۱۹۹۰ء)

عالیجاہ محمد کون تھا؟

سوال: امریکہ کے حوالے سے اکثر عالیجاہ محمد کا نام سننے میں آتا ہے۔ یہ صاحب کون ہیں اور ان کے عقائد کیا ہیں؟ (حافظ عطاء المجید، کبیر والا)

جواب: عالیجاہ محمد سیاہ فام امریکیوں کا ایک لیڈر تھا جس نے اپنے آپ کو مسلم راہنما کی حیثیت سے متعارف کرایا اور سفید فام امریکیوں کے خلاف سیاہ فام طبقہ کی روایتی نفرت کو بھڑکا کر اپنے گرد ایک اچھی خاصی جماعت اکٹھی کر لی، لیکن اس کے عقائد اسلامی نہیں تھے بلکہ اس نے اسلام کا لیبل چسپاں کر کے اپنے خودساختہ عقائد کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ۱۹۳۵ء میں اس نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح پہلے ہلکے پھلکے دعاوی کے ساتھ لوگوں کا مانوس کیا اور پھر ۱۹۵۰ء میں نبوت ورسالت کا کھلا دعوٰی کر دیا۔

اس نے اسلام کے بنیادی احکام کو بدل دیا۔ تمام سفید چیزوں کو حرام قرار دیا۔ نماز کے بارے میں کہا کہ نماز کھڑے ہو کر دعا کرنے کا نام ہے۔ روزے دسمبر میں رکھنے کا حکم دیا۔ حج منسوخ کر کے شکاگو میں اپنے ہیڈکوارٹر پر آنے کو حج کا قائم مقام قرار دیا۔ اور عمومی چندہ کو زکوٰۃ کا نام دے دیا۔

عالیجاہ محمد نے سفید فام لوگوں کے خلاف اپنے پیروکاروں کا یہ ذہن بنایا کہ سفید فام شیطان کی اولاد ہیں اور کہا کہ حضرت آدم علیہ السلام سیاہ فام تھے اور ان کی ساری اولاد سیاہ فام ہے۔

عالیجاہ محمد کے ایک قریبی ساتھی اور دست راست مالکم ایکس نے سب سے پہلے اس کے جھوٹے مذہب سے بغاوت کی اور اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد اختیار کرنے کا اعلان کیا مگر ۱۹۶۵ء میں انہیں شہید کر دیا گیا۔ مالکم ایکس اب مالکم شہباز شہیدؒ کے نام سے متعارف ہیں اور ان کی یاد

میں نیویارک میں ''مالکم شہباز مسجد'' تعمیر کی گئی ہے جو تبلیغِ اسلام کا معروف مرکز ہے۔

مکہ بازی کے سابق عالمی چیمپئن محمد علی کلے نے بھی ابتداء میں جب قبول اسلام کا اعلان کیا تو وہ عالیجاہ محمد کے پیروکار تھے لیکن جلد ہی مالکم شہباز شہیدؒ کے گروپ میں شامل ہو گئے اور اب وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔

عالیجاہ محمد کی موت کے بعد اس کے فرزند وارث دین محمد بھی باپ کے عقائد سے منحرف ہو چکے ہیں اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کے ایک بڑے گروپ کی قیادت کر رہے ہیں، جبکہ مالکم شہباز شہیدؒ کا ایک قریبی ساتھی لوئیس فرخان اسلام کے صحیح عقائد سے (معاذ اللہ) منحرف ہو کر اب عالیجاہ محمد کے گمراہ گروپ کی قیادت کر رہا ہے۔

اسلامی نظام میں نمائندگی کا تصور کیا ہے؟

سوال: کیا اسلامی نظام میں حکومت اور عوام کے درمیان نمائندوں کے کسی طبقے کا وجود ہے؟ اور اسلام میں اس کا تصور کیا ہے؟ (حافظ عبید اللہ عامر، گوجرانوالہ)

جواب: کسی مسئلہ پر عوام کی رائے کو صحیح طور پر معلوم کرنے کے لیے نمائندگی کا تصور اسلام میں موجود ہے۔ غزوۂ حنین کے بعد غنیمت کا مال تقسیم ہوا اور مفتوحین کی طرف سے اپنے قیدی واپس لینے کے لیے ایک وفد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو چونکہ قیدی مجاہدین میں تقسیم ہو چکے تھے اس لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں کی واپسی کے لیے مجاہدین کی رضا اور رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب مجاہدین کو جمع کیا جن کی تعداد بارہ ہزار کے لگ بھگ تھی، ان سب کے سامنے مسئلہ پیش کر کے ان کی رائے طلب کی، سب نے اجتماعی آواز سے جواب دیا کہ ہمیں قیدیوں کی واپسی بخوشی منظور ہے لیکن جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجتماعی جواب پر اکتفاء نہیں کیا اور ارشاد فرمایا کہ

انا لا ندری من اذن منکم فی ذٰلک ومن لم یاذن فارجعوا حتٰی یرفع الینا عرفائکم امرکم. (بخاری ج ۲ ص ۶۱۸)

''ہم نہیں جانتے کہ تم میں سے کس نے اجازت دی ہے اور کس نے نہیں۔ اس

لیے تم سب (اپنے خیموں میں) واپس جاؤ حتیٰ کہ تمہارے عرفاء تمہارا معاملہ ہمارے سامنے پیش کریں۔‘‘

چنانچہ مجاہدین اپنے خیموں میں چلے گئے اور عرفاء نے ان سے الگ الگ رائے معلوم کر کے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک اسے پہنچایا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کی واپسی کا فیصلہ کیا۔

عرفاء ’’عریف‘‘ کی جمع ہے اور عریف عرب معاشرے میں ان لوگوں کو کہا جاتا تھا جو عوام کے مسائل سرداروں اور حکمرانوں تک پہنچاتے تھے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اس طبقہ کو اپنے فیصلہ کی بنیاد بنایا ہے بلکہ ایک موقع پر یہ بھی ارشاد فرمایا کہ

ان العرافة حق ولابد للناس من عرفاء رواه ابوداؤد (مشکوٰة ص ۳۳۱)

’’عرافہ حق ہے اور لوگوں کے لیے عرفاء کا وجود ضروری ہے۔‘‘

اس لیے اسلامی نظام میں حکومت اور عوام کے درمیان ایک ایسے طبقے کے وجود اور اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے جو عام لوگوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کے مسائل اور اجتماعی امور پر ان کی رائے حکومت تک پہنچا سکے۔

جمعیۃ العلماء ہند کب وجود میں آئی؟

سوال: جمعیۃ العلماء ہند کا قیام کب عمل میں آیا اور اس کے بنیادی مقاصد کیا تھے؟ (عبد الوحید بٹ، گکھڑ ضلع گوجرانوالہ)

جواب: ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں متحدہ ہندوستان کے سرکردہ علماء کرام کا ایک اجلاس مولانا عبد الباری فرنگی محلی کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں ’’جمعیۃ العلماء ہند‘‘ کے نام سے علماء کی ایک مستقل جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا مفتی کفایت اللہؒ کو جمعیۃ کا پہلا صدر اور مولانا احمد سعیدؒ کو ناظم منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد جمعیۃ کا پہلا اجلاس عام ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ہوا جس میں اس کے اغراض و مقاصد اور قواعد و ضوابط کی منظوری دی گئی۔ اور اغراض و مقاصد میں مسلمانانِ

ہند کی دینی وسیاسی معاملات میں راہنمائی کے ساتھ ساتھ آزادئ وطن کو جمعیۃ کا بنیادی مقصد قرار دیا گیا۔

بنیاد پرست مسلمان کون ہیں؟

سوال: آج کل عام طور پر بعض راہنماؤں کے بیانات میں بنیاد پرست مسلمانوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، اس سے ان کی مراد کون لوگ ہیں؟ (مسعود احمد، لاہور)

جواب: ایک عرصہ سے عالمی اسلام دشمن لابیاں اس منظّم کوشش میں مصروف ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے بنیادی عقائد واحکام سے ہٹا کر جدید افکار ونظریات کے ساتھ مفاہمت کے لیے تیار کیا جائے اور مسلمانوں کے اندر ایک ایسی لابی منظّم کی جائے جو جدید تعبیر وتشریح اور اجتہاد مطلق کے نام پر قرآن وسنت کے احکام کو نئے اور خود ساختہ معنی پہنا سکے۔ مگر راسخ الاعتقاد مسلمانوں اور علماء کے سامنے ان کا بس نہیں چل رہا کیونکہ علماء کرام اس موقف پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں کہ قرآن و سنت کی تعبیر وتشریح وہی قابل قبول ہے جو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور امتِ مسلمہ کے چودہ سو سالہ اجماعی تعامل کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، اس سے ہٹ کر کی جانے والی کوئی بھی تعبیر سراسر الحاد اور گمراہی ہوگی۔

ان علماء اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کو جو قرآن وسنت کی چودہ سو سالہ اجماعی تعبیر وتشریح پر سختی کے ساتھ قائم ہیں، اسلام دشمن لابیوں کی طرف سے مختلف خطابات والقابات سے نوازا جاتا ہے۔ اس سے قبل انہیں دقیانوسی اور رجعت پسند کہا جاتا تھا اور اب ان کے لیے ”بنیاد پرست“ کی نئی اصطلاح ایجاد کی گئی ہے۔

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

(فروری ۱۹۹۰ء)

اشتراکیت کا فلسفہ کیا ہے؟

سوال: اشتراک کا فلسفہ کیا ہے اور یہ سب سے پہلے کس نے پیش کیا؟ (محمد غفران، اسلام آباد)۔

جواب: اشتراک کا فلسفہ یہ ہے کہ چونکہ دنیا میں انسانوں کے درمیان زیادہ تر جھگڑے زمین، مال اور عورت کی وجہ سے ہوتے ہیں اس لیے یہ تینوں چیزیں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہوسکتیں بلکہ یہ تینوں تمام انسانوں کے درمیان کسی تعیین کے بغیر مشترک ملکیت ہیں۔ یہ فلسفہ سب سے پہلے پارسیوں (مجوسیوں) کے ایک راہنما مزدک نے پیش کیا اور کہا کہ ایک شخص جو کچھ کماتا ہے وہ اس کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ سب لوگوں کی مشترک ہے۔ اسی طرح کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر مرد ہر عورت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

ظہورِ اسلام کے بعد اسی فلسفہ کو عباسی خلیفہ معتصم باللہ کے دور میں بابک خرمی نے دوبارہ پیش کیا اور زن، زر اور زمین کو مشترک ملکیت قرار دے کر اس کا پرچار شروع کر دیا لیکن خلیفہ معتصم باللہ نے اسے قتل کرا دیا۔ موجودہ دور میں انفرادی ملکیت کی نفی کا یہ فلسفہ منظّم شکل میں سب سے پہلے کارل مارکس نے پیش کیا اور اسے ''کمیونزم'' کا نام دیا۔ روس، چین اور مشرقی یورپ کے اشتراکی انقلاب اسی فلسفہ پر برپا ہوئے لیکن کہیں بھی کارل مارکس کا فلسفہ اصلی شکل میں نافذ نہ کیا جا سکا بلکہ ''سوشلزم'' کے نام سے اس کے قریب قریب ایک جبری نظام ان ممالک پر مسلط کر دیا گیا مگر وہ بھی اب دم توڑ رہا ہے۔

ام المؤمنین سیدہ عائشہؓ اور معراجِ جسمانی

سوال: بعض حضرات کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ ام

المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج جسمانی کی قائل نہ تھیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟ (عبد الغفور، اوکاڑہ)

جواب: یہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان ہے کیونکہ خود حضرت عائشہؓ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا واقعہ روایت کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سدرۃ المنتہٰی کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام کو اصلی شکل میں دیکھا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں اس امر پر اختلاف تھا کہ معراج کے اس سفر میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی بلاحجاب زیارت کی ہے یا نہیں؟ حضرت عائشہؓ اس کی قائل نہیں تھیں اور ان کا ارشاد یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سدرۃ المنتہٰی کے پاس اللہ تعالیٰ کی نہیں بلکہ حضرت جبریل علیہ السلام کی اصلی شکل میں زیارت ہوئی تھی، جیسا کہ صحیح مسلم ج ا ص ۹۸ میں یہ روایت منقول ہے۔

باقی رہی بات معراج جسمانی کی تو جب حضرت عائشہؓ سدرۃ المنتہٰی تک جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے، جبریل علیہ السلام کو اصلی صورت میں دیکھنے اور اللہ تعالیٰ کی بے حجاب زیارت نہ ہونے کا موقف پیش کر رہی تھیں تو ان کی طرف معراج جسمانی کے انکار کی نسبت کیسے درست ہو سکتی ہے؟

ربوہ کا معنٰی کیا ہے؟

سوال: بعض علماء کی طرف سے ربوہ کے نام کی تبدیلی کا مطالبہ کیا جاتا ہے، ربوہ کا معنٰی کیا ہے اور اس مطالبہ کا پسِ منظر کیا ہے؟ (عبد السلام، فیصل آباد)

جواب: ربوہ عربی زبان میں اونچے ٹیلے کو کہتے ہیں اور قرآن کریم میں حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حوالہ سے ”ربوہ“ کا لفظ مذکور ہے کہ ”واٰوینٰھما الیٰ ربوۃ“ ہم نے ان دونوں کو اونچے ٹیلے پر جگہ دی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا چونکہ دعویٰ یہ ہے کہ وہ خود عیسٰی بن مریم ہے اور احادیث رسولؐ میں مسیحؑ اور عیسٰیؑ کی دوبارہ تشریف آوری کی جو بشارت دی گئی ہے وہ اس کے بارے میں ہے، اس لیے قیامِ پاکستان کے بعد قادیانیوں نے ایک سازش کے تحت اپنے

نئے ہیڈکوارٹر کا نام ''ربوہ'' رکھ دیا تاکہ ناواقف لوگ جب قادیانیوں کے ہیڈکوارٹر ربوہ کا نام قرآن کریم میں دیکھیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے ربوہ کا تذکرہ ہوگا تو مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں دھوکہ کا شکار ہو جائیں گے۔

چنانچہ عملاً ایسا ہو بھی رہا ہے۔ افریقی ممالک میں جہاں قادیانیوں کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، جب علماء اسلام وہاں جا کر قادیانیت کی تردید کرتے ہیں تو بہت سے سادہ لوح لوگ ان سے جھگڑتے ہیں کہ ''ربوہ'' کا ذکر تو خود قرآن کریم میں ہے، تم اس کی تردید کیوں کرتے ہو؟ اسی وجہ سے علماء اسلام حکومتِ پاکستان پر اس بات کے لیے زور دیتے ہیں کہ ربوہ کا نام سرکاری طور پر تبدیل کر دیا جائے کیونکہ یہ نام بیرون ملک بہت زیادہ لوگوں کی گمراہی کا باعث بن رہا ہے۔

قیامِ پاکستان اور جمعیت علماء اسلام

سوال: عام طور پر مشہور ہے کہ علماء دیوبند نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی، یہ کہاں تک درست ہے؟ (عبد الکبیر، مانسہرہ)

جواب: یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ آل انڈیا جمعیت علماء اسلام نے باقاعدہ جماعتی حیثیت سے تحریک پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ اس جمعیۃ کا قیام ۱۹۴۵ء میں عمل میں لایا گیا تھا اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو اس کا سربراہ منتخب کیا گیا تھا۔ چنانچہ ان کی قیادت میں علماء کی ایک بہت بڑی تعداد نے تحریک پاکستان میں سرگرم کردار ادا کیا۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تحریکِ پاکستان کی بھرپور حمایت کی۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کے موقع پر صوبہ سرحد کا تفصیلی دورہ کر کے رائے عامہ کو پاکستان کے حق میں ہموار کیا۔ جبکہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے سلہٹ کا تفصیلی دورہ کر کے وہاں کے عوام کو مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت کے لیے آمادہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگی زعماء نے کراچی میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ڈھاکہ میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے ہاتھوں سب سے پہلے پاکستان کے قومی پرچم کے لہرانے کا اہتمام کیا جو تحریکِ پاکستان میں ان کی خدمات اور جدوجہد کا اعتراف تھا۔

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

(مارچ ۱۹۹۰ء)

اسلام میں معاشی مساوات کا تصور

سوال: ایک طالب علم تنظیم (۱) خدا پرستی (۲) انسان دوستی اور (۳) معاشی مساوات کو اپنے بنیادی اصول قرار دیتی ہے۔ کیا معاشی مساوات کا تصور اسلام میں ہے؟ (نیاز محمد ناصر بلوچستانی)

جواب: معاشی مساوات کا معنٰی اگر تو یہ ہے کہ ایک معاشرہ کے تمام افراد ایک ہی جیسی زندگی گزاریں اور خوراک، لباس، رہائش، ملکیت، کاروبار اور دیگر معاملات میں ان میں کسی قسم کا کوئی تفاوت اور ترجیحات نہ ہوں تو یہ قطعی طور پر ایک غیر فطری تصور ہے جو نہ صرف یہ کہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہے بلکہ عملاً بھی ناممکن ہے۔ ہر انسان ذہنی صلاحیت، قوتِ کار اور وسائل سے استفادہ کی استعداد کے لحاظ سے دوسرے سے مختلف ہے۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اپنے چار یا پانچ لڑکوں کو ایک ایک ہزار روپے کی رقم دیں اور یہ توقع رکھیں کہ سب کے سب اس رقم کو ایک ہی مدت میں خرچ کریں گے، ایک ہی مصرف میں صرف کریں گے اور ایک ہی جیسے نتائج اور منافع حاصل کریں گے۔ یہ قطعی غیر فطری بات ہے اور اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اسلام پیداوار کے قومی ذرائع سے استفادہ کا ہر شہری کو یکساں حق دیتا ہے اور قومی ذرائع سے استفادہ کے باب میں ترجیحات کا قائل نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی شہری اس حق کو استعمال کرنے میں اپنی ذہنی صلاحیت اور قوت کار کے لحاظ سے دوسروں سے بڑھ جائے تو یہ اس کی اپنی محنت اور صلاحیت کا ثمر ہے۔

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کے دورِ خلافت میں بحرین سے بیت المال میں خاصا سامان اور دولت آئی، اس موقع پر حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی

کہ بیت المال سے وظائف اور اموال کی تقسیم میں ترجیحات قائم کی جائیں اور حضراتِ صحابہ کرامؓ میں فضیلت کے جو درجات ہیں اس لحاظ سے تقسیم کے درجات قائم کیے جائیں۔ مثلاً بدری صحابہؓ کو سب سے زیادہ دیا جائے، پھر مہاجرینؓ کو، پھر تیسرے نمبر پر انصارؓ کو اور پھر بعد میں مسلمان ہونے والے حضراتؓ کا درجہ رکھا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ فضیلت کا تعلق آخرت سے ہے، اس کا ثواب زیادہ یا کم آخرت میں ملے گا ”**وهذه معاش فالأسوة فيه خير من الاثرة**“ اور یہ معیشت ہے اس میں برابری ترجیح سے بہتر ہے۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ اپنے دور خلافت میں اسی اصول پر عمل کرتے رہے لیکن جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے اس اصول کو بدل کر اپنی تجویز کے مطابق ترجیحات کی بنیاد پر وظائف کی تقسیم کا سلسلہ شروع کر دیا اور دس سالہ دور خلافت میں اسی طریق کار پر عمل کیا۔ البتہ آخری سال انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ بیت المال سے وظائف کی تقسیم کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کی رائے درست تھی اس لیے آئندہ سال سے میں موجودہ طریق کار کو ترک کر کے حضرت ابوبکرؓ کے طے کردہ اصول کے مطابق برابری کی بنیاد پر وظائف کی تقسیم کا نظام قائم کروں گا۔ لیکن اس کے بعد حضرت عمرؓ کی شہادت ہوگئی اور انہیں اپنے نظام پر نظر ثانی کا موقع نہیں مل سکا۔

امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں یہ ساری تفصیل بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری اور قومی ذرائع پر تمام شہریوں کا حق یکساں ہے اور اس میں ترجیحات قائم کرنا بہتر نہیں ہے۔ البتہ یہاں زیر بحث مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے نظر انداز کرنا شاید قرین انصاف نہ ہو۔ وہ یہ کہ صدیقی دور میں بیت المال سے وظائف کی تقسیم برابری کی بنیاد پر ہوتی رہی ہے اور فاروقی دور میں ترجیح کا اصول اپنایا گیا ہے۔ اگرچہ حضرت عمرؓ نے اس سے رجوع کا زبانی اظہار فرما دیا تھا لیکن اس کے بعد بھی ترجیحی اصول پر عملدرآمد کا تسلسل قائم رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دراصل دونوں اصول موقع محل کی مناسبت سے قابل عمل ہیں اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں سے کسی بھی اصول کو اپنایا جا سکتا ہے۔ اصل بات اجتماعی مفاد کی ہے، اگر کسی وقت حالات کا تقاضا قومی ذرائع پیداوار کی برابری کی بنیاد پر تقسیم کا ہو اور اجتماعی مفاد اس میں ہو تو ایک اسلامی حکومت اس اصول کو اپنا سکتی ہے، اور کسی دور میں اگر اجتماعی حالات کا تقاضا اس کے برعکس ہو تو

دوسری صورت اختیار کرنے کی گنجائش بھی موجود ہے۔

دینی مدارس کا نصاب اور اکابر کا طرز عمل

سوال: آج مختلف اطراف سے دینی مدارس کے نصاب میں تبدیلی اور اس میں عصری علوم اور تقاضوں کو شامل کرنے کی آواز اٹھ رہی ہے جبکہ ہمارے اکابر نے ایسا نہیں کیا اور نہ ہی کسی بزرگ نے اس مقصد کے لیے کوشش کی۔ کیا موجودہ رجحان اکابر کے طرز عمل سے انحراف نہیں ہے؟ (منظور احمد، سمن آباد، گوجرانوالہ)

جواب: یہ کہنا کہ ہمارے اکابر نے دینی مدارس کے نصاب میں عصری تقاضوں کو شامل کرنے کی طرف توجہ نہیں دی ہے یا اسے پسند نہیں کیا، خلافِ واقعہ بات ہے۔ سب سے پہلے دینی مدارس اور عصری علوم کو اکٹھا کرنے کی بات شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے کی تھی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خود علی گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنو کا قیام بھی اسی جذبہ کے تحت عمل میں لایا گیا تھا اور اسی مقصد کے لیے جامعہ ملیہ دہلی کی تشکیل ہوئی تھی۔ اس ضمن میں جمعیۃ العلماء ہند کی مندرجہ ذیل قرارداد بطور خاص اہمیت رکھتی ہے جو جمعیۃ کے تیرہویں عمومی اجلاس منعقدہ لاہور بتاریخ ۲۰ تا ۲۱ مارچ ۱۹۴۲ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی زیر صدارت منظور ہوئی تھی۔ قرارداد کا متن یہ ہے:

> ”جمعیۃ العلماء ہند کا یہ اجلاس مدارس عربیہ دینیہ کے مروجہ نصاب میں دورِ حاضر کی ضرورتوں کے موافق اصلاح وتبدیلی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہے اور مدارس عربیہ کے ذمہ دار حضرات اور تعلیمی جماعتوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے باہمی مشورے اور تعاون سے مقرر کر کے ایک ایسا نصاب مرتب کرائیں جو دینی علوم کی تکمیل کے ساتھ ضروریات عصریہ میں بھی مہارت پیدا کرنے کا کفیل ہو، اور اس سلسلہ میں جمعیۃ العلماء ہند ارباب علم سے رائے لے کر اپنی صوابدید کے مطابق حتی الوسع جلد کوئی مؤثر اقدام کرے۔“

اس سے واضح ہوتا ہے کہ درس نظامی کے نصاب میں عصری تقاضوں کے امتزاج کی ضرورت کا احساس ہمارے اکابر کو بھی تھا، صرف اتنی بات تھی کہ وہ تحریکِ آزادی میں مصروفیات کے باعث اس سمت کوئی نتیجہ خیز عملی پیش رفت نہیں کر سکے۔ اور اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ۱۹۴۲ء میں اس ضرورت کا احساس اس قدر شدت کے ساتھ تھا تو آج ۱۹۹۰ء میں اس کی اہمیت اور ضرورت میں کس قدر اضافہ ہو چکا ہوگا۔

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

(اپریل ۱۹۹۰ء)

شرعی مہر ۳۲ روپے؟

سوال: عام طور پر یہ سننے میں آتا ہے کہ حق مہر شرعی طور پر ۳۲ روپے ہے، اس کی کیا حقیقت ہے؟ (حافظ محمد سعید، کچا دروازہ، گوجرانوالہ)

جواب: اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے، مہر کے بارے میں بہتر بات یہ ہے کہ خاوند کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیئے جسے وہ آسانی سے ادا کر سکے۔ کچھ عرصہ قبل تک ایک سو بتیس روپے چھ آنے کو مہر فاطمی کے برابر سمجھا جاتا تھا جو کسی دور میں ممکن ہے صحیح ہو لیکن چاندی کی موجودہ قیمت کے لحاظ سے کسی صورت بھی یہ مہر فاطمی نہیں ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر پانچ سو درہم تھا، درہم چاندی کا سکہ تھا جس کا وزن ساڑھے تین ماشے بیان کیا جاتا ہے، اس حساب سے پانچ سو درہم کا وزن ساڑھے ستر سو ماشے بنتا ہے یعنی ایک سو پینتالیس تولے اور دس ماشے۔ اور ان دنوں (۱۹۹۰ء) چاندی کا بھاؤ کم وبیش ستر روپے تولہ ہے، اس طرح چاندی کی موجودہ قیمت کے حساب سے مہر فاطمی دس ہزار روپے سے زائد بنتا ہے۔

اس لیے بتیس روپے کو شرعی مہر قرار دینا درست نہیں ہے بلکہ احناف کے ہاں تو بتیس روپے مہر مقرر کرنا ویسے بھی جائز نہیں ہے کیونکہ احناف کے نزدیک مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم متعین ہے جس کی بنیاد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر ہے کہ "**لا مهر اقل من عشرة دراهم**" دس درہم سے کم مہر جائز نہیں ہے۔ دس درہم کا وزن ایک ماشہ کم تین تولے ہے اور قیمت کے اعتبار سے دو سو روپے کے لگ بھگ رقم بنتی ہے۔ اس سلسلہ میں صاحبِ ہدایہؒ نے مہر کے باب میں احناف کے اس موقف کی وضاحت کی ہے کہ اگر کسی نے دس درہم سے کم مہر مقرر کر لیا تو

بھی اسے کم از کم دس درہم (یعنی دو سو روپے کے لگ بھگ) ہی ادا کرنا ہوں گے۔

تیتو میر کون تھے؟

سوال: تحریکِ آزادی کے حوالہ سے بعض مضامین میں تیتو میرؒ کا ذکر آتا ہے، یہ کون بزرگ تھے اور تحریکِ آزادی میں ان کا کیا کردار ہے؟ (محمد عاصم بٹ، گکھڑ، ضلع گوجرانوالہ)

جواب: تیتو میرؒ کا نام نثار علی تھا، بنگال کے رہنے والے تھے، اپنے گاؤں نوکل باڑیہ میں لٹھ مار قسم کے نوجوان شمار ہوتے تھے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب امیر المؤمنین سید احمد شہیدؒ اور امام المجاہدین شاہ اسماعیل شہیدؒ جہادِ آزادی کی تیاری کے سلسلہ میں حجاز مقدس گئے ہوئے تھے۔ نثار علیؒ بھی اسی سال حج کے لیے گئے، سید احمد شہیدؒ سے ملاقات ہوئی، ان کی صحبت نے ذہن کا رخ بدل دیا۔ دل میں آزادی کا جذبہ انگڑائی لینے لگا، واپس آ کر علاقہ کے ہندو زمینداروں اور جاگیرداروں کے خلاف نوجوانوں کو منظّم کرنا شروع کر دیا اور دینی اقدار کی ترویج کے لیے جدوجہد کی۔ نثار علیؒ کی محنت سے نوجوانوں کا ایک اچھا خاصا گروہ دینداری کی طرف مائل ہوا۔ نماز کی پابندی کے ساتھ ڈاڑھی کی سنت بھی زندہ ہونے لگی۔ ہندو جاگیرداروں نے دینی بیداری کو خطرہ سمجھتے ہوئے اس رجحان کو قوت کے زور سے دبانا چاہا اور ڈاڑھی پر ٹیکس لگا دیا۔ نثار علیؒ کے گروہ نے ٹیکس دینے سے انکار کر دیا، کشمکش بڑھی، محاذ آرائی کی صورت پیدا ہوگئی۔

نثار علیؒ نے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ اپنے گاؤں میں مورچہ بندی کر لی اور ارد گرد کے علاقہ پر علاقہ پر قبضہ کر کے انگریزی اقتدار کے خاتمہ اور مسلمانوں کی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ ہزاروں مجاہدین کے ساتھ نثار علیؒ نے یلغار شروع کی، انگریزی فوج اس کا سامنا نہ کر سکی اور بالآخر کلکتہ سے کمانڈر الیگزینڈر کی قیادت میں انگریزی لشکر مقابلہ کے لیے آیا اور اسے بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد کلکتہ سے دوسرا انگریزی لشکر آیا اور اس سے مقابلہ کرتے ہوئے نثار علیؒ نے جواب تیتو میر کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے جامِ شہادت نوش کیا اور ان کے متعدد ساتھیوں کو گرفتار کر کے بعد میں پھانسی دے دی گئی۔ امیر المؤمنین سید احمد شہیدؒ نے بالاکوٹ میں مئی ۱۸۳۱ء

میں جامِ شہادت نوش کیا جبکہ ان کے تربیت یافتہ بنگالی مجاہد نثار علی عرف تیتو میرؒ اسی سال نومبر یا دسمبر میں عروسِ شہادت سے ہمکنار ہوئے۔

فئی اور غنیمت کا فرق؟

سوال: قرآن کریم میں غنیمت اور فئی دونوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ (رشید احمد، دوبئی)

جواب: غنیمت اور فئے دونوں کفار سے حاصل شدہ مال کو کہتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ جو مال اور سامان میدانِ جنگ میں مقابلہ کے ساتھ کفار سے وصول ہو وہ غنیمت کہلاتا ہے، اور جو ساز وسامان مسلمانوں کے لشکر سے مرعوب ہو کر لڑائی کے بغیر کفار چھوڑ کر چلے جائیں اسے فئے کہتے ہیں، یا جنگ کی صورت میں کفار کی جو زمین مسلمانوں کے قبضے میں آئے اور اسے بعد میں کفار ہی کے قبضہ میں چھوڑ کر ان پر جزیہ یا خراج عائد کر دیا جائے تو یہ آمدنی بھی فئی شمار ہوتی ہے۔

غنیمت اور فئے میں دوسرا فرق یہ ہے کہ قرآن کریم کے حکم کے مطابق غنیمت کا ایک خمس مال بیت المال کے لیے الگ کر کے باقی مال مجاہدین میں تقسیم کیا جاتا ہے، جبکہ فئی سارے کا سارا بیت المال کا حق ہے اور بیت المال کی تحویل میں جانے کے بعد بیت المال کے مقرر کردہ اصول وضوابط کے مطابق اسے صرف کیا جا سکتا ہے۔

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

(مئی ۱۹۹۰ء)

مروجہ جمہوریت اور اسلام

سوال: عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے سب سے پہلے جمہوری نظام پیش کیا۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟ اور کیا موجودہ جمہوریت اسلام کے مطابق ہے؟ (محمد الیاس، گوجرانوالہ)۔

جواب: جمہوری نظام سے مراد اگر تو یہ ہے کہ حکومت اور عوام کے درمیان اعتماد کا رشتہ ہونا چاہیئے تو یہ اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمران کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ

''تمہارے اچھے حکمران وہ ہیں جو تم سے محبت کریں اور تم ان سے محبت کرو، اور برے حکمران وہ ہیں جو تم سے بغض رکھیں اور تم ان سے بغض رکھو، وہ تم پر لعنت بھیجیں اور تم ان پر لعنت بھیجو۔''

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حکومت اور عوام کے درمیان اعتماد کا رشتہ ضروری ہے اور اس عوامی اعتماد کے اظہار کی جو صورت بھی حالات کے مطابق اختیار کر لی جائے اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن جمہوریت کا جو تصور آج کل معروف ہے اور جس میں عوام کے نمائندوں کو ہر قسم کے کُلّی اختیارات کا حامل سمجھا جاتا ہے، یہ اسلام کے اصولوں سے متصادم ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ۱۴ مارچ ۱۹۲۶ء کو کلکتہ میں جمعیۃ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں اسلام اور مروجہ جمہوریت کے درمیان اصولی فرق کو ان الفاظ کے ساتھ واضح کیا ہے:

''موجودہ جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں کچھ فرق بھی ہے۔ موجودہ

جمہوریت کے لیے شریعتِ الٰہی سے واقفیت ضروری نہیں۔ اسلامی جمہوریت کی صدارت کے لیے دوسرے شرائط کے ساتھ شریعتِ الٰہی سے واقفیت ضروری ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ راویوں کی اکثریت اور قلت غلطی اور صواب کا معیار نہیں ہے، بلکہ کتاب وسنت سے قریب ہونا یا نہ ہونا صحت اور خطا کی پہچان ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہمارے ارکانِ سلطنت جس طرح رومن لاء اور یورپین قوانین سے واقف ہیں وہ اسلامی قوانین سے بھی آگاہ ہوں، بلکہ وہ جس طرح قوانینِ یورپ کے ماہر ہیں اگر وہ اسلامی قانون اور اس کے مآخذ سے بھی آگاہ ہوں تو وہ خود علماء ہیں۔ ان کو تنگ خیال ''ملاؤں'' کی بھی شکایت نہیں رہے گی اور ان کو مذہب یا تمدن کی کشمکش سے نجات مل جائے گی۔''

نواب سراج الدولہؒ کون تھے؟

سوال: تحریکِ آزادی کے حوالہ سے نواب سراج الدولہؒ کا ذکر اکثر مضامین میں ہوتا ہے۔ یہ بزرگ کون تھے اور تحریکِ آزادی میں ان کا کردار کیا ہے؟ (حافظ عزیز الرحمان، گکھڑ)

جواب: جب انگریز برصغیر پاک وہند و بنگلہ دیش میں اپنے قدم جمانے میں مصروف تھا، نواب سراج الدولہؒ بنگال کا حکمران تھا اور یہ پہلا حکمران ہے جس نے میدانِ جنگ میں انگریز کی قوت کو للکارا اور مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ سراج الدولہ کو اس کے مرحوم والد علی وردی خان نے وصیت کی تھی کہ بنگال میں انگریزوں کو قدم جمانے کا موقع نہ دینا۔ چنانچہ سراج الدولہؒ نے اپنے والد کی جگہ حکمرانی کا منصب سنبھالتے ہی انگریزوں کو اپنے علاقہ میں قلعے اور مورچے توڑ دینے کا حکم دیا اور حکم نہ ماننے کی وجہ سے حملہ کر کے کلکتہ شہر لڑائی کے ذریعے انگریزوں سے چھین لیا۔

اس کے بعد پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہؒ اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں سراج الدولہؒ کے سپہ سالار میر جعفر نے انگریزوں کے ساتھ ساز باز کر کے سراج الدولہؒ

سے غداری کی اور اس غداری کے نتیجے میں نواب سراج الدولہؒ ۲۹ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدانِ جنگ میں جامِ شہادت نوش کر گئے۔ اور اس طرح فرنگی استعمار کے خلاف یہ پہلا جہادِ آزادی تھا جو نواب سراج الدولہؒ کی قیادت میں پلاسی کے میدان میں لڑا گیا مگر میر جعفر کی غداری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔

حج بدل کون کرے؟

سوال: عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جس شخص نے اپنا حج کیا ہو وہی دوسرے کی طرف سے حج بدل کر سکتا ہے۔ کیا شرعاً یہ ضروری ہے؟ (محمد سلیمان۔ لاہور)

جواب: امام شافعیؒ کے نزدیک حج بدل کے لیے یہ شرط ہے کہ وہی شخص دوسرے کی طرف سے حج بدل کر سکتا ہے جس نے پہلے اپنا حج کیا ہو مگر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے اور ان کے نزدیک وہ شخص بھی دوسرے کی طرف سے حج بدل کر سکتا ہے جس نے پہلے اپنا حج نہیں کیا۔ البتہ علامہ شامیؒ (رد المحتار ج ۲ ص ۲۴۸) میں فرماتے ہیں کہ اختلاف سے بچنے کے لیے بہتر یہی ہے کہ حج بدل کے لیے اسی شخص کو بھیجا جائے جس نے اپنا حج کیا ہوا ہو۔

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

(جون ۱۹۹۰ء)

حضرت سعد بن عبادہؓ اور بیعت سیدنا صدیق اکبرؓ

سوال: عام طور پر تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت سے انکار کر دیا تھا اور پھر آخر دم تک اپنے اس انکار پر قائم رہے تھے۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟ (محمد معاویہ۔ کراچی)

جواب: جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد انصارِ مدینہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے جانشینِ رسولؐ کے طور پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا فیصلہ کیا۔ بیعت کی تیاری ہو رہی تھی کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے صورتحال کو تدبر کے ساتھ سنبھال لیا۔ چنانچہ بحث و تمحیص کے بعد بالآخر حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کرنے پر اتفاق رائے ہو گیا اور تمام حاضرین نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ تاریخ کی بعض روایات میں آتا ہے کہ اس موقع پر حضرت سعد بن عبادہؓ نے بیعت سے انکار کر دیا تھا لیکن یہ روایات درست نہیں ہیں کیونکہ مشہور مؤرخ طبریؒ نے جہاں انکار کی روایات نقل کی ہیں وہاں ایک روایت میں یہ الفاظ بھی بیان کیے ہیں "**فتتابع القوم و بایع سعد**" کہ حاضرین نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر لگاتار بیعت کی اور سعدؓ نے بھی بیعت کی۔

اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ مسند احمد میں سند صحیح کے ساتھ روایت نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے اپنے خطاب کے دوران جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا حوالہ دیا کہ "**الائمة من قریش**" حکمران قریش میں سے ہوں گے تو حضرت سعد بن عبادہؓ نے اس کی تصدیق کی اور فرمایا "**فانتم الامراء و نحن الوزراء**" پس تم امیر ہو گے اور ہم تمہارے

وزیر ہوں گے۔ اس لیے بیعت صدیق اکبرؓ سے حضرت سعد بن عبادہؓ کے انکار کی روایات درست نہیں ہیں اور صحیح بات یہی ہے کہ دوسرے صحابہ کرامؓ کے ساتھ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔

سر سید احمد خان اور جہادِ آزادی

سوال: ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں سرسید احمد خان کا کردار کیا تھا؟ (حافظ محمد علی صدیقی۔ لیہ)

جواب: ۱۸۵۷ء میں سرسید احمد خاں ضلع میرٹھ میں سرکاری ملازم تھے اور انہوں نے جہادِ آزادی کے دوران مسلمانوں کے خلاف انگریزی حکومت کا دل کھول کر ساتھ دیا۔ سرسید احمد خان نے ۱۸۵۷ء کے معرکۂ حریت پر ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں اپنے بارے میں ایک انگریز افسر مسٹر جان کری کرافٹ کے مندرجہ ذیل ریمارکس نقل کیے:

> ''تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اور باوجود کہ بجنور کے ضلع میں ہندو اور مسلمانوں میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کر کے اٹھایا تھا، جب ہم نے تم کو اور رحمت خان صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت، اچھے چال چلن اور نہایت طرفداری سرکار کے سبب ہندوؤں نے، جو بڑے رئیس اور ضلع میں نامی چودھری تھے، سب نے کمالِ خوشی اور نہایت آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے پر حاکم بنانا قبول کیا، بلکہ درخواست کی کہ تم ہی سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ۔ اور سرکار نے بھی ایسے وقت میں تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح وفادار اور نمک حلال نوکر سرکار کے رہے۔ اس کے صلے میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کو رکھی جاوے تو بھی کم ہے۔'' (ص ۱۹۲)

یہ تو انگریز حکام کے تاثرات ہیں اور جہاد ۱۸۵۷ء کے بارے میں جس میں حضرت حاجی امداد

اللہ مہاجر مکی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، حافظ ضامن شہید، مولانا سرفراز علی شہید، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا عبدالقادر لدھیانوی، جنرل بخت خان اور سردار احمد خان کھرل رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے مجاہدین شریک ہوئے، سرسید احمد خان کے اپنے تاثرات کیا تھے وہ خود سرسید احمد خان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

> ”غور کرنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں جن لوگوں نے جہاد کا جھنڈا بلند کیا ایسے خراب اور بدرویہ اور بداطوار آدمی تھے کہ بخدا شراب نوشی، تماش بینی اور ناچ رنگ دیکھنے کے کچھ دریغ ان کا نہ تھا۔ یہ کیونکہ پیشوا اور مقتدا جہاد کے کہے جا سکتے تھے۔اس ہنگامہ میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہ ہوئی۔سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب جو امانت تھا اس میں خیانت کرنا، ملازمین سے نمک حرامی کرنی، مذہب کی رو سے درست نہ تھی۔ صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا مذہب کے موجب گناہِ عظیم تھا۔ پھر یہ ہنگامۂ غدر کیونکر جہاد ہوسکتا تھا؟ ہاں البتہ چند بدذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورا کرنے اور جاہلوں کو بہکانے کو اور اپنے ساتھ جمعیت کرنے کو جہاد کا نام لے دیا۔ پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرامزدگیوں میں سے ایک حرامزدگی تھی، نہ واقع میں جہاد“۔(ص ۹۳)

نشہ کی حالت میں مرنے والے کا جنازہ

سوال: جو شخص نشہ کی حالت میں مر جائے اس کا جنازہ پڑھنا چاہیئے یا نہیں؟ (عبد اللطیف۔ گوجرانوالہ)

جواب: نشہ کرنا خواہ وہ کسی چیز سے ہو حرام ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”کل مسکر حرام“ ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔نشہ کرنے والا شخص کبیرہ گناہ کا مرتکب اور فاسق ہے لیکن اس سے کافر نہیں ہوتا۔اگر کوئی شخص اسی حالت میں مرگیا تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اسی نوعیت کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے امداد الاحکام جلد اول ص ۲۵ میں لکھتے ہیں کہ:

’’شراب کے نشہ میں مرنے سے ایمان زائل نہیں ہوتا، ایمان کفر سے زائل ہوتا ہے، اور یہ فعل کفر نہیں بلکہ معصیت کبیرہ ہے۔ پس یہ شخص مسلمان ہے اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے۔ البتہ زجر وتوبیخ کے لیے عالم مقتدا اور امام جامع مسجد اس کی نماز نہ پڑھے، عام مسلمان نماز پڑھ کر دفن کر دیں۔ اگر بدونِ نماز کے دفن کیا گیا تو سب گنہگار رہوں گے۔‘‘

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

(جولائی ۱۹۹۰ء)

قادیانی اور مسئلہ کشمیر

سوال: عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مسئلہ کشمیر پیدا کرنے میں قادیانیوں کا ہاتھ ہے، اس کی کیا حقیقت ہے؟ (حافظ محمد ایوب گوجرانوالہ)۔

جواب: یہ بات تاریخی لحاظ سے درست ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب پاکستان کے قیام اور ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ پنجاب کی تقسیم کا بھی فیصلہ ہو گیا تو پاکستان کے حصے میں آنے والے پنجاب کی حد بندی کے لیے ریڈکلف باؤنڈری کمیشن قائم کیا گیا جس نے متعلقہ فریقوں کا مؤقف معلوم کرنے کے بعد حد بندی کی تفصیلات طے کر دیں۔ اصول یہ طے ہوا تھا کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی وہ پاکستان میں شامل ہوگا اور جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہوگی وہ بھارت میں رہے گا۔

ضلع گورداسپور کی صورتحال یہ تھی کہ قادیانیوں کا مرکز ''قادیان'' اس ضلع میں تھا اور ان کی بڑی آبادی بھی یہیں تھی۔ اگر ان کی آبادی کو مسلمانوں کے ساتھ شمار کیا جاتا تو یہ علاقہ مسلم اکثریت کا علاقہ شمار ہوتا اور اگر انہیں غیر مسلموں کے زمرہ میں رکھا جاتا تو یہ غیر مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ قادیانیوں نے باوجود اس کے کہ وہ خود کو مسلمان کہنے پر ابھی تک مصر ہیں اور اسلام کے نام پر اپنے جھوٹے مذہب کے فروغ میں مصروف ہیں، ریڈکلف کمیشن کے سامنے اپنا مؤقف مسلمانوں سے الگ پیش کیا جس کی وجہ سے اس علاقہ کو غیر مسلم اکثریت کا علاقہ قرار دے دیا گیا اور اسے بھارت میں شامل کر دیا گیا۔ ضلع گورداسپور کی جغرافیائی صورتحال یہ ہے کہ اس وقت کشمیر کو بھارت سے ملانے والا واحد راستہ ضلع گورداسپور سے ہو کر جاتا تھا۔ اگر یہ ضلع پاکستان میں شامل ہوتا تو بھارت کے پاس کشمیر میں مداخلت کا کوئی زمینی راستہ نہیں تھا۔ اس طرح کشمیر بھارت کی دستبرد سے محفوظ

رہتا۔

اس پس منظر میں یہ کہا جاتا ہے کہ قادیانیوں نے ریڈ کلف کمیشن کے سامنے اپنا مؤقف مسلمانوں سے الگ پیش کر کے ضلع گورداسپور کو بھارت میں شامل کرنے کا موقع فراہم کیا جس سے بھارت کو کشمیر کے لیے راستہ ملا اور اس نے مداخلت کر کے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اس لحاظ سے کشمیر اور اہلِ کشمیر کی موجودہ غلامی اور مصائب کی ذمہ داری قادیانیوں پر عائد ہوتی ہے۔

خارجی گروہ کب پیدا ہوا؟

سوال: خارجی گروہ کسے کہتے ہیں اور اس کا آغاز کب ہوا تھا؟ (محمد اسلم، اسلام آباد)

جواب: امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جنگ صفین کے درمیان مصالحت کی بات چلی اور دونوں لشکروں نے جنگ بندی کر کے حضرت ابو موسٰی اشعریؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کو مصالحتی گفتگو کے لیے ثالث مقرر کر لیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر کا ایک حصہ ان کے اس فیصلہ پر ناراض ہو کر الگ ہو گیا۔ اس وقت ان کی تعداد کم و بیش بارہ ہزار تھی اور ان کا موقف یہ تھا کہ حکم صرف خدا کا ہے اور دو انسانوں کو حکم اور فیصل مقرر کر کے فریقین نے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کی بیعت توڑ کر عبد اللہ بن وہب الراسبی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

حضرت علیؓ نے مختلف صحابہ کرامؓ کے ذریعے اور براہ راست ان کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے بلکہ حضرت علیؓ کے مقابلہ پر لشکر جمع کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ نہروان کے مقام پر حضرت علیؓ کے لشکر سے ان کی جنگ ہوئی جس میں خوارج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد کسی علاقہ پر اس گروہ کا تسلط تو نہ رہا لیکن ایک مذہبی فرقہ کی حیثیت سے اس کا وجود کافی عرصہ تک قائم رہا۔

ان کے عقائد میں یہ بات نمایاں تھی کہ کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ کی تکفیر اور توہین میں یہ لوگ نمایاں تھے۔ آج دنیا میں خوارج کا کوئی منظم فرقہ موجود نہیں ہے لیکن حضرت علیؓ اور اہلِ بیتؓ کے بارے میں غیر متوازن نظریات کے حامل افراد

کوالزاماً خارجی کہہ دیا جاتا ہے۔

متعہ کا مسئلہ اور امام مالکؒ

سوال: متعہ کسے کہتے ہیں اور کیا اہلِ سنت کے کسی امام کے نزدیک متعہ جائز ہے؟ (عبد الحمید، لاہور)

جواب: مرد اور عورت کے درمیان عمر بھر کے لیے ازدواج کا جو عقد ہوتا ہے وہ شرعاً نکاح کہلاتا ہے اور ازدواج کی شرعی شکل ہے۔ لیکن اگر اسی عقد کی مدت متعین کر دی جائے تو اسے متعہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اتنے دن کے لیے یا ماہ کے لیے یا سال کے لیے نکاح کیا جائے۔ مدت خواہ ایک گھنٹہ ہو یا پچاس سال، جب نکاح میں مدت طے کر دی جائے تو وہ متعہ بن جاتا ہے۔ جاہلیت کے دور میں متعہ بھی ازدواج کی جائز صورتوں میں شمار ہوتا تھا لیکن جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حرام قرار دے دیا اور اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اہلِ تشیع اس کے جواز کے قائل ہیں مگر اہلِ سنت کے نزدیک متفقہ طور پر حرام ہے اور کوئی امام بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ بعض فقہاء نے حضرت امام مالکؒ کی طرف متعہ کے جواز کی نسبت کی ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ خود حضرت امام مالکؒ متعہ کی حرمت کے قائل ہیں اور مؤطا امام مالک میں انہوں نے متعہ کی حرمت پر روایات بھی نقل کی ہیں۔

بے نماز کی قربانی

سوال: ایک شخص نماز روزہ کی پابندی نہیں کرتا مگر زکوٰۃ اور قربانی ادا کرتا ہے، کیا اس کو اس عمل کا ثواب ہو گا؟ (حافظ محمد سعید، گوجرانوالہ)

جواب: اگر وہ نماز روزہ کا منکر نہیں ہے تو وہ مسلمان ہے۔ جو نیک عمل کرتا ہے اس پر اسے ثواب ملے گا اور جن فرائض کا تارک ہے اس پر اسے گناہ ہوگا اور وہ اس کے ذمہ واجب الادا رہیں گے جب تک کہ ان کی قضا نہ کر لے۔

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

(اگست ۱۹۹۰ء)

کیا امام اعظم ابوحنیفہؒ کا تعلق مرجئہ سے تھا؟

سوال: مرجئہ کون تھے؟ ان کے خاص خاص عقیدے کیا تھے؟ کیا یہ فرقہ اب بھی موجود ہے؟ امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھی مرجئہ فرقہ میں سے تھے، اس کی کیا حقیقت ہے؟ (چراغ الدین فاروق، کوٹ رنجیت سنگھ، شیخوپورہ)

جواب: عہدِ صحابہؓ کے اختتام پر رونما ہونے والے فرقوں میں سے ایک ''مرجئہ'' بھی تھا جس کے مختلف گروہوں کا ذکر امام محمد بن عبد الکریم الشہرستانیؒ (المتوفی ۵۴۸ھ) نے اپنی معروف تصنیف ''الملل والنحل'' میں کیا ہے، اور مرجئہ کی وجہ تسمیہ ایک یہ بیان کی ہے کہ یہ لوگ ایمان کے ساتھ عمل کو ضروری نہیں سمجھتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ کبیرہ گناہ کے مرتکب کے بارے میں دنیا میں جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور فیصلہ آخرت تک مؤخر اور موقوف ہے۔ اس لیے انہیں مرجئہ کہا جاتا تھا جس کا معنی ہے ''مؤخر کرنے والا گروہ''۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک شخص جب توحید و رسالت پر ایمان لے آئے تو اس کو کوئی گناہ ضرر نہیں دیتا اور اس کی نجات یقینی ہے۔

دراصل اسی دور میں خوارج اور بعض دیگر گروہوں نے جب اس عقیدہ کا اظہار کیا کہ کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے، تو اس کے ردعمل میں مرجئہ دوسری انتہا پر چلے گئے کہ صرف ایمان کافی ہے، عمل کی سرے سے ضرورت نہیں ہے۔ یا ایمان کی موجودگی میں کسی بھی قسم کا عمل کوئی نقصان نہیں دیتا۔

جبکہ اہلِ سنت کا مذہب اعتدال و توازن کا ہے کہ ایمان کے ساتھ نجاتِ کامل کے لیے عملِ صالح شرط ہے، لیکن کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے کفر لازم نہیں آتا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ چونکہ اہلِ

سنت کے امام اور ترجمان تھے اور انہوں نے کبیرہ گناہ کے مرتکب پر کفر کا فتویٰ لگانے سے انکار کر دیا، تو اس طرف کے لوگوں نے الزاماً انہیں ''مرجئہ'' قرار دے دیا، حالانکہ امام صاحبؒ کا مرجئہ کے ساتھ دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ امام شہرستانیؒ نے ''الملل والنحل'' میں امام اعظمؒ کی طرف مرجئہ ہونے کی نسبت کا خوب تجزیہ کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ صرف قدریہ اور معتزلہ کا حضرت امام صاحبؒ پر الزام ہے۔

معرکہ ۱۸۵۷ء اور بہادر شاہ ظفرؒ

سوال: ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں بہادر شاہ ظفرؒ کا کردار کیا تھا؟ (محمد عاصم بٹ، گکھڑ ضلع گوجرانوالہ)

جواب: ۱۸۵۷ء کے معرکہ حریت میں بادشاہ ہند بہادر شاہ ظفر مرحوم مجاہدینِ آزادی کے ساتھ پوری طرح شریکِ کار تھے۔ انہوں نے والیانِ ریاست کے نام اپنے ایک خط میں لکھا کہ

''میری پر جوش خواہش ہے کہ ہندوستان سے فرنگیوں کو ہر ممکن طریق سے نکال دیا جائے تا کہ ملک آزاد ہو جائے۔''

بہادر شاہ ظفرؒ نے اس خدشہ کی بھی تردید کر دی کہ آزادی کی جدوجہد میں ان کی دلچسپی اپنے اقتدار کی خاطر ہے، چنانچہ انہوں نے لکھا کہ

''انگریزوں کو ملک سے نکال دینے کے بعد میرا مقصد ہندوستان پر حکومت کرنے کا نہیں۔ اگر تمام راجے دشمن کو ملک سے نکالنے کے لیے تلوار نیام سے نکال لیں تو میں شاہی اختیارات اور طاقت سے دستبردار ہونے کے لیے رضامند ہو جاؤں گا۔''

مجاہدین کی افواج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے جنرل بخت خان کا تقرر بھی بہادر شاہ ظفرؒ نے کیا اور مجاہدینِ آزادی کی پوری طرح پشت پناہی کی۔ اسی ''جرم'' میں ۱۸۵۷ء کی جنگ میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد بہادر شاہ ظفرؒ کو گرفتار کر لیا گیا، ان کے بیٹوں کو شہید کر دیا گیا اور مقدمہ چلانے کے بعد بہادر شاہ ظفرؒ کو مجرم قرار دے کر جلاوطن کر دیا گیا۔ چنانچہ رنگون میں نظر بندی کی حالت میں ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ (بحوالہ ''انگریز کے باغی مسلمان'' از جانباز مرزا)

کیا علماء دیوبند نے انگریزی سیکھنے کو حرام قرار دیا تھا؟

سوال: مشہور ہے کہ علماء دیوبند نے انگریزی زبان سیکھنے کو حرام قرار دیا تھا، اس کی حقیقت کیا ہے؟ (اللہ وسایا قاسم، جہانیاں)

جواب: یہ بات غلط ہے، علماء دیوبند نے انگریزی زبان اور تعلیم کے جلو میں آنے والی یورپی تہذیب وثقافت اور انگریزی ذہنیت و کلچر کی مخالفت ضرور کی ہے اور حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کے بارے میں ان کا موقف درست تھا، لیکن بحیثیت زبان کے انگریزی کی مخالفت نہیں کی۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اس سلسلہ میں ایک استفتاء کے جواب میں مندرجہ ذیل صراحت کی ہے:

’’سوال: انگریزی پڑھنا اور پڑھانا درست ہے یا نہیں؟

جواب: انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آوے۔‘‘ (فتاویٰ رشیدیہ ص ۵۶۰)

ان کے علاوہ دیگر اکابر نے بھی مختلف مواقع پر اسی موقف کا اظہار کیا حتیٰ کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے تو مالٹا کی نظر بندی سے واپسی پر خود علماء کو ترغیب دی کہ وہ انگریزی زبان سیکھیں تاکہ نئے دور کے تقاضوں سے عہدہ براہو سکیں۔

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

(ستمبر ۱۹۹۰ء)

کیا حضرت عمرؓ نے احادیث بیان کرنے سے منع فرمایا تھا؟

سوال: منکرینِ حدیث کا کہنا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں احادیث کی روایت سے منع فرمایا تھا، اس کی کیا حقیقت ہے؟ (عبد الکریم، کوئٹہ)

جواب: یہ بات درست نہیں ہے اور جو روایات ایسی منقول ہیں ان کا مطلب ہرگز وہ نہیں ہے جو منکرینِ حدیث بیان کرتے ہیں، بلکہ اصل روایات کو ملاحظہ کیا جائے تو مطلقاً منع کرنے کا حکم ہمیں نہیں ملتا بلکہ اس میں روایات کو بکثرت بیان کرنے سے روکا گیا ہے۔ چنانچہ عراق کی طرف روانہ کردہ وفد کو حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ

”فلا تصدوهم بالاحاديث فتشغلوهم جودوا القرآن واقلوا الرواية عن رسول الله“ (تذكرة الحفاظ للامام ذهبیؒ ج ۱ ص ۴)

ترجمہ: ”انہیں (اہل عراق کو) احادیث کے ذریعے (قرآن سے) نہ روک دینا کہ تم انہیں (احادیث کے ساتھ ہی) مشغول کر دو۔ قرآن کو اچھا کر کے (پڑھو) اور (احادیث) بیان کرنا کم کر دو۔“

اس کی وجہ حافظ ذہبیؒ یہ بیان کرتے ہیں کہ

وقد كان عمر من وجله ان يخطئ الصاحب على رسول الله صلى الله عليه وسلم يامرهم ان يقلوا الرواية عن نبيهم ولئلا يتشاغل الناس بالاحاديث عن حفظ القرآن.

ترجمہ: ”عمرؓ نے اس خوف سے کہ رسول اللہ کی طرف بہتان منسوب ہو جائے گا، اصحابؓ کو حکم دیا کہ احادیث کی روایت کو کم کر دیں اور تا کہ لوگ قرآن کو چھوڑ

کر احادیث کے ساتھ مشغول نہ ہو جائیں۔‘‘

علاوہ ازیں اگر حضرت عمرؓ کی مراد روایت حدیث سے مطلقاً منع کرنا ہوتی تو لازماً آپ خود بھی احادیث کی روایت نہ کرتے حالانکہ ایک قول کے مطابق حضرت عمرؓ سے ۵۳۷ احادیث مروی ہیں (تاریخ عمرؓ بن الخطاب للامام ابوالفرج جمال الدین ابن الجوزیؒ ص ۱۷۳)۔ پھر حضرت عمرؓ ایک عام راوی نہیں بلکہ پختہ کار محدث تھے۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں:

وھو الذی من للمحدثین التثبت فی النقل. (تذکرہ ص ٦ ج ١)

ترجمہ: ’’حضرت عمرؓ نے ہی محدثین کو نقلِ حدیث میں ثابت قدمی کی راہ بتلائی۔‘‘

حافظ ذہبیؒ نے چند واقعات نقل کیے ہیں جو منکرینِ حدیث کے دعوے کے ابطال پر حجتِ قاطعہ ہیں۔ یہاں پر ان میں سے ایک نقل کیا جاتا ہے: ابوموسٰی الاشعریؓ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے گھر آئے اور باہر کھڑے ہو کر تین دفعہ سلام کیا لیکن جواب نہ ملنے پر واپس ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے آدمی بھیج کر آپ کو بلوایا اور پوچھا کہ آپ واپس کیوں لوٹ گئے تھے؟ ابوموسٰیؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا اگر تین دفعہ سلام کرنے پر بھی جواب نہ ملے تو واپس لوٹ آیا کرو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایک اور گواہ لاؤ ورنہ میں سزا دوں گا۔ تو ابوموسٰیؓ نے صحابہ میں سے ایک آدمی کو بطور گواہ کے پیش کر دیا یعنی حضرت عمرؓ نے ایک راوی کے ہوتے ہوئے (جو ثقہ بھی تھے) گواہ طلب کیا اور اس کے بعد انہیں اطمینان ہوا۔ الغرض منکرینِ حدیث کا مذکورہ دعوٰی بدلائل قاطعہ و براہین ساطعہ باطل ہے۔

امام ابن حجرؒ کون تھے؟

سوال: علمِ حدیث کے حوالہ سے ابن حجرؒ کا نام اکثر سننے اور پڑھنے میں آتا ہے۔ یہ بزرگ کون ہیں اور ان کا تعارف کیا ہے؟ (محمد احمد، گوجرانوالہ)

جواب: امام ابن حجرؒ کا نام احمد بن علی ہے اور آٹھویں، نویں صدی ہجری کے محدث ہیں۔ ۷۷۳ھ میں کنانۃ (عسقلان) کے مقام پر پیدا ہوئے پھر مصر چلے گئے۔ مسلکاً شافعی ہیں، تمام

علوم وفنون خصوصاً علمِ حدیث میں مہارتِ تامّہ رکھتے تھے۔

برع فی الحدیث و تقدم فی جمیع فنونه (لحظ الالحاظ بذیل تذکرة الحفاظ ص ۳۸۱)

''حدیث کے فن میں کامل اور دوسرے تمام فنون میں سب سے بڑھ کر تھے۔''

وقد غلق بعده الباب و ختم به هذا الشان (ص ۳۸۲)

''آپ کے بعد اس پایہ کا کوئی محدث پیدا نہیں ہوا۔''

ابن حجرؒ کی زیادہ تر تصنیفات علمِ حدیث اور اسماء الرجال پر ہیں۔ علمِ حدیث میں صحیح بخاری کی شرح ''فتح الباری'' ہر دور میں متداول اور متقدمین ومتاخرین کا ماخذ رہی ہے۔ جبکہ علمِ رجال میں تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب، لسان المیزان، الاصابۃ الدرر الکامنۃ اور دیگر کتب دوسری تمام کتبِ رجال سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں تعلیقات وتخریجات سو (۱۰۰) سے بڑھ کر ہیں (ص ۳۸۱)۔ قریباً ایک ہزار مجالس میں املاء کروایا، متعدد مقامات پر تدریس کی اور بالآخر ذی الحجہ ۸۵۲ھ میں وفات پا گئے۔ ابن حجرؒ کے جنازہ کے موقع پر بارش ہوگئی تو کسی عقیدت مند نے کہا

قد کمبت السحب علی قاضی القضاة بالمطر

وانهدم الرکن الذی کان مشیدًا من حجر

''قاضی القضاۃ کی وفات پر بادل بارش کے ساتھ روئے اور پتھر جیسا مضبوط عالم گر گیا۔''

جاحظیہ کون تھے؟

سوال: جاحظیہ کون تھے اور ان کے عقائد کیا تھے؟ (محمد عبد اللہ، وہاڑی)

جواب: جاحظیہ، معتزلہ کی ایک شاخ ہیں۔ یہ لوگ عمرو بن بحرین الجاحظ کے پیروکار تھے جو معتصم باللہ اور متوکل علی اللہ عباسی خلفاء کے دور (دوسری صدی ہجری کے نصف اول) میں ایک بڑا عالم تھا۔ ان کے چند ایک عقائد کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے جو جمہور معتزلہ سے جدا ہیں:

(۱) عقائد (علمِ الٰہی) بالکلیہ ضروری ہیں اور ہر انسان ان کو طبعی طور پر جانتا ہے حتیٰ کہ خدا اور

نبی کا مفہوم بھی جانتا ہے۔

(۲) اہلِ جہنم کو جسمانی سزا نہیں ملے گی بلکہ آگ ان کو اپنے اندر جذب کر لے گی اور وہ آگ ہی بن جائیں گے۔

(۳) تمام صفاتِ باری تعالیٰ (علم، حیات، ارادہ، قدرت، سمع، بصر وغیرہ) کے اصلاً منکر ہیں۔

(۴) خلقِ قرآن کے بارے میں اس حد تک معتقد تھے کہ ان کے نزدیک قرآن مرد اور عورت کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔

(الملل والنحل للامام الشہر ستانیؒ ج ا ص ۹۱ ـ ۹۴)

لفظ ''فارقلیط'' کیا ہے؟

سوال: فارقلیط کس زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی کیا ہے؟
(عبد الحفیظ، وزیر آباد)

جواب: فارقلیط یونانی لفظ ''پیرکلوتوس'' سے مقرب ہے اور اس کا معنی تعریف کیا ہوا یعنی ''احمد'' ہے۔ یہ لفظ انجیل یوحنا ۱۶: ۷ ـ ۱۵ میں بار بار استعمال ہوا ہے اور حضرت عیسیٰؑ نے آنحضرت کے بارے میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن پاک میں بھی (الصّف ۶) حضرت عیسیٰ کی اس بشارت کو نقل کیا گیا ہے۔ عیسائی حضرات جہاں ان بشارات کے آنحضرتؐ پر اطلاق سے انکار کرتے ہیں اور ان کو روح القدس (اقنوم ثالث) کے لیے ماننے پر اصرار کرتے ہیں، اسی طرح اس لفظ کی تاویل میں کہتے ہیں کہ یہ یونانی زبان کے لفظ ''پراکلی توس'' سے مقرب ہے نہ کہ ''پیرکلوتوس'' سے اور ''پراکلی توس'' کا معنی ''احمد'' نہیں ہے۔ (فارقلیط از پادری وکلف اے سنگھ ص ۱۱۔ شائع کردہ مسیحی اشاعت خانہ لاہور)۔ تفصیلی بحث کے لیے دیکھئے ''فارقلیط کون ہے؟'' از مولانا بشیر الحسینی، شائع کردہ اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی نمبر ۵۔

قومی تعلیمی کمیشن کا سوالنامہ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جنوری ۱۹۹۲ء)

(حکومت پاکستان کے قائم کردہ قومی تعلیمی کمیشن کی خصوصی کمیٹی نمبر ۵ کے کنوینر جناب جسٹس (ریٹائرڈ) محمد ظہور الحق کی طرف سے دینی مدارس اور عصری اسکولوں و کالجوں کے نصاب و نظام میں ہم آہنگی کے سلسلہ میں ماہرین تعلیم کو ارسال کیے جانے والے سوالنامہ کا جواب۔)

سوالنامہ

محترم و مکرم السلام علیکم!

حکومت پاکستان نے شریعت کے نفاذ کے لیے اپنی کاوشوں کا آغاز کر رکھا ہے۔ شریعت بل ۱۹۹۱ء کے تحت قومی تعلیمی کمیشن برائے اسلامائزیشن تشکیل دیا گیا ہے۔ اس کمیشن کی پہلی نشست ۳ ستمبر ۱۹۹۱ء کو ہوئی تھی اور کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔ کمیٹی نمبر ۵ کا میں کنوینر ہوں۔ یہ کمیٹی دینی مدارس کے مسائل، ضروریات اور سہولتوں کے مسائل پر غور و فکر کر رہی ہے۔ دینی مدارس کے مسائل کا علم آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ تعلیم کو اسلامی خطوط پر استوار کرنے میں کمیشن کی اعانت فرمائیں اور دینی مدارس کو کیا سہولتیں حکومت سے درکار ہیں یا ہو سکتی ہیں، اس کی وضاحت فرما دیں۔

سفارشات ۵ دسمبر سے پہلے ارسال فرمائیں۔

(۱) دینی مدارس کو حکومت کی مالی معاونت کی ضرورت سے متعلق آپ کی تجاویز۔

(۲) دینی مدارس کے مسائل اور ضروریات۔

(۳) دینی مدارس کو حکومت کس طرح کی سہولتیں مہیا کرے؟

(۴) جدید نظام تعلیم کو اسلامی خطوط پر کس طرح استوار کیا جائے؟

(۵) دینی مدارس میں جدید علوم کو کس طرح متعارف کرایا جائے؟

(۶) یہ بھی درخواست ہے کہ دینی مدارس اور عام مدارس کے نصاب اور نظام میں کس طرح ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں بھی اپنی تجاویز تحریر فرما دیں۔ نوازش ہوگی۔

تعاون کا پیشگی شکریہ۔ والسلام

جسٹس (ریٹائرڈ) محمد ظہور الحق

کنویز نیشنل ایجوکیشنل کونسل، اسلام آباد

جوابات

حکومت پاکستان کے قائم کردہ نیشنل ایجوکیشنل کمیشن کی کمیٹی نمبر ۵ نے دینی مدارس اور مروجہ تعلیمی اداروں کے نصاب و نظام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جو سوالنامہ جاری کیا ہے، اگرچہ اس میں چھ سوالات ہیں، لیکن یہ سب سوالات بنیادی طور پر دو سوالوں پر مشتمل ہیں:

(۱) ایک یہ کہ عصری اسکولوں اور کالجوں کے نصاب و نظام کے ساتھ دینی مدارس کے نصاب و نظام کو کس طرح زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؟

(۲) اور دوسرا یہ کہ دینی مدارس کو درپیش مسائل و ضروریات میں حکومت کیا تعاون کر سکتی ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، اس ضمن میں یہ گزارش ہے کہ اگرچہ یہ بظاہر ایک دلکش اور خوشنما تصور ہے لیکن اصولی طور پر یہ غلط اور غیر منطقی سوچ ہے، کیونکہ اس سوچ کی بنیاد ان دونوں نظام ہائے تعلیم کی جداگانہ ضرورت و اہمیت کو تسلیم کرنے پر ہے جبکہ یہ ضرورت و اہمیت بجائے خود محل نظر ہے۔

عصری اسکولوں اور کالجوں کا نظام تعلیم مستقل حیثیت کا حامل ہے اور دینی مدارس کا نظام تعلیم اس سے بالکل مختلف اور الگ حیثیت رکھتا ہے۔ ان دونوں کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد اس دور کی قومی ضروریات کے پیش نظر ہوا تھا۔ دونوں تعلیمی نظاموں کی بنیاد خوف اور تحفظات پر تھی۔

☆ جدید تعلیم کا نظام کھڑا کرنے والوں کے سامنے یہ خوف تھا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزی تعلیم حاصل نہ کی تو وہ نئے قومی نظام میں شریک نہیں ہو سکیں گے اور ان کے ہندو معاصرین اس دوڑ میں آگے بڑھ کر قومی زندگی پر تسلط جما لیں گے جس سے مسلمان دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ جائیں گے۔

☆ جبکہ دینی تعلیمی نظام کے بانیوں کو یہ خوف لاحق تھا کہ اگر قرآن وسنت اور عربی علوم کی تعلیم کا اہتمام نہ کیا گیا تو مسلمانوں کا رشتہ اپنے مذہب اور اعتقاد سے کٹ جائے گا اور وہ دینی تشخص سے محروم ہو جائیں گے۔

یہ دونوں خوف اپنی اپنی جگہ صحیح تھے اور انہی کی بنیاد پر دو الگ اور مستقل نظام ہائے تعلیم وجود میں آ گئے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد ان میں سے کسی خوف کے تسلسل کا کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا تھا اور قومی دانشوروں کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان دو طرفہ خدشات کی نفی کرتے اور دونوں محاذوں پر قوم کو خوف سے نجات دلا کر خوف اور تحفظات کی بنیاد پر تشکیل پانے والے دونوں تعلیمی نظاموں کے خاتمہ کی راہ ہموار کرتے، لیکن بدقسمتی سے اب تک ایسا نہیں ہوا اور ہم حصول آزادی کے تقریباً نصف صدی بعد بھی تعلیمی پالیسیوں کے لحاظ سے ابھی تک انیسویں صدی کے اواخر کے ذہنی دائروں میں کولہو کے بیل کی طرح چکر کاٹ رہے ہیں۔

کالجوں اور دینی مدارس کے نصاب و نظام میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہماری بنیادی تعلیمی ضرورت نہیں ہے۔ یہ محض ایڈہاک ازم ہے جو کسی ٹھوس اور واضح تعلیمی پالیسی کے جڑ پکڑنے تک ایک عبوری اور عارضی انتظام کا درجہ تو پا سکتی ہے، لیکن یہ ہمارے تعلیمی مسائل کا حل نہیں ہے۔ اور اگر سنجیدگی کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو دونوں نصابوں کو مکمل طور پر ہم آہنگ کرنا قابل عمل اور ممکن بھی نہیں ہے، کیونکہ اگر دونوں نصاب پورے کے پورے یکجا کر دیے جائیں تو طلبہ کی میسر کھیپ میں سے شاید پانچ فیصد اسے بمشکل کور کر سکیں۔ اور اگر ایک کو بنیاد بنا کر دوسرے نصاب کی چند چیزیں اس کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے تو اسے ''ہم آہنگی'' قرار دینا مشکل ہو جائے گا۔

اس لیے ہمارے نزدیک یہ تصور ہی سرے سے غلط ہے کہ دونوں نظام ہائے تعلیم کو یکجا کرنے

کی کوشش کی جائے بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ جرات وحوصلہ سے کام لے کر ان دونوں نظاموں کی نفی کرتے ہوئے ایک نئے نظام تعلیم کی بنیاد رکھی جائے۔ ان دو نظام ہائے تعلیم کی نفی کا مطلب ان کے معاشرتی کردار کی نفی نہیں ہے۔ دونوں نے اپنے اپنے دائرے میں قوم کی خدمت کی ہے اور ان میں سے کسی کے کردار کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان کی ضرورت اور اہمیت کا دور گزر چکا ہے اور دونوں نظام اپنی طبعی عمر پوری کر چکے ہیں، اس لیے انہیں مصنوعی تنفس کے ذریعے سے زندہ رکھنے کی کوشش نہ عقل و دانش کا تقاضا ہے اور نہ ہی ایسا کرنا نئی نسل کے ساتھ انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگا۔ ہمارے خیال میں قومی تعلیمی کمیشن کا اصل رول یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک نئے اور انقلابی تعلیمی نظام کے لیے قوم کی ذہن سازی کرے اور دونوں طبقوں کے ماہرین تعلیم کو اعتماد میں لے کر نئے تعلیمی نظام کا ڈھانچہ تشکیل دے۔

نئے تعلیمی نظام کو بنیادی شخصی ضروریات اور قومی تقاضوں کے دو دائروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک تعلیمی نظام کا پہلا حصہ بنیادی شخصی ضروریات پر مشتمل ہونا چاہیے اور دوسرے حصے میں قومی ضروریات کو ایک حسین توازن و تناسب کے ساتھ سمو دینا چاہیے۔ مثلاً اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ہر شہری کی بنیادی ضروریات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اس کی مادری اور علاقائی زبان پر اسے عبور ہو اور وہ اسے لکھنے پڑھنے پر قادر ہو۔

(۲) قومی زبان اردو پر بھی اسے یہی قدرت حاصل ہو۔

(۳) دینی زبان عربی کے ساتھ اس کا اتنا تعلق ضرور ہو کہ وہ قرآن وحدیث کو سمجھ سکے۔

(۴) بین الاقوامی زبان انگریزی پر بھی اسے دسترس حاصل ہو۔

(۵) عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات کے بارے میں اسے اتنا دینی علم حاصل ہو کہ وہ ایک صحیح مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکے۔

(۶) اتنا حساب کتاب جانتا ہو کہ روزمرہ کے معاملات میں اسے دقت پیش نہ آئے۔

(۷) ملکی اور بین الاقوامی حالات سے اس قدر ضرور واقف ہو کہ قومی تقاضوں کو سمجھ سکے۔

(۸) وہ جدید سائنسی علوم کے بارے میں بھی بنیادی معلومات سے بہرہ ور ہو۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ ان بنیادی ضروریات پر مشتمل نصاب تعلیم میٹرک تک از سرنو مرتب کیا

جائے اور اسے ہر شہری کے لیے قانوناً لازمی قرار دے دیا جائے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے کے تعلیمی نظام میں قومی تقاضوں کو سامنے رکھ کر شعبوں کی تقسیم کی جائے۔ مثلاً ہمیں اچھے علماء کی ضرورت ہے، بہترین سائنس دانوں کی ضرورت ہے، قابل ڈاکٹروں کی ضرورت ہے، ماہر انجینئروں کی ضرورت ہے، اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ماہرین درکار ہیں۔ اس لیے میٹرک کے بعد ہر طالب علم کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے ذوق اور صلاحیت کے مطابق ان میں سے کسی ایک شعبہ میں تعلیم و مہارت حاصل کرے اور قومی پالیسی کے طور پر ایک ایسا توازن قائم کیا جائے کہ تمام شعبہ ہائے زندگی کی ضروریات تناسب کے ساتھ پوری ہوتی رہیں۔

دوسرا اہم سوال دینی مدارس کی ضروریات و مسائل میں حکومت کے ممکنہ تعاون کی صورت کے بارے میں ہے۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ دینی مدارس معاشرہ میں قرآن وسنت اور دیگر دینی علوم کی ترویج اور بقا وتحفظ کا جو کردار ادا کر رہے ہیں، وہ بہت بڑی قومی خدمت ہے اور جب تک دینی تعلیم کی تمام ضروریات کو اپنے اندر سمونے والا کوئی ہمہ گیر نظام تعلیم وجود میں آ کر مستحکم نہیں ہو جاتا، اس وقت تک دینی مدارس کی ضروریات اور ان کا کردار بہر حال ایک ناگزیر قومی تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ دینی مدارس کا یہ کردار ان کے اس آزادانہ نظام کی بدولت ہی تاریخ میں اپنی جگہ بنا سکا ہے جو ہر دور میں حکومت کی سرپرستی اور دخل اندازی سے بے نیاز رہا ہے۔ اگر دینی مدارس کو وقت کی حکومتوں کی دخل اندازی سے آزادی اور بے نیازی حاصل نہ ہوتی تو ان کی خدمات اور جدوجہد کے نتائج کی موجودہ شکل سامنے نہیں آ سکتی تھی۔ اس لیے ہمارے نزدیک دینی مدارس کا سب سے بڑا مسئلہ اور ان کی سب سے اہم ضرورت ان کے آزادانہ تعلیمی کردار کا تحفظ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو دینی ادارے اپنے معاشرتی کردار کی اہمیت سے شعوری طور پر آگاہ ہیں، وہ ہر دور میں سرکاری امداد قبول کرنے سے گریزاں رہے ہیں اور آج بھی بے نیازی کی اسی روش پر گامزن ہیں۔ محتاط دینی اداروں کی سوچ یہ ہے کہ پاکستان میں قائم ہونے والی حکومتوں کا اسلام کے ساتھ تعلق مخلصانہ اور نظریاتی نہیں بلکہ مصلحت پرستانہ ہے، اور وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ کسی بھی قسم

کی سرکاری امداد حکومت کی پالیسیوں اور مصلحتوں کے ساتھ کسی نہ کسی درجے میں وابستگی کا احساس ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ پھر بعض تجربات نے اس احساس کو بھی جنم دیا ہے کہ حکومت کی سرپرستی میں آنے کے بعد دینی مدارس شاید اپنے موجودہ کردار کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے، جیسا کہ محکمہ تعلیم کی تحویل میں آنے والے جامعہ عباسیہ بہاولپور، محکمہ اوقاف کے کنٹرول میں آنے والے جامعہ عثمانیہ اوکاڑہ، اور ان جیسے بیسیوں دیگر دینی مدارس کے انجام سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

اس لیے اگر حکومت دینی مدارس کو ان کے آزادانہ کردار کے تحفظ کا یقین اور اعتماد دلا سکے تو یہ ان مدارس کے ساتھ حکومت کا سب سے بڑا تعاون ہوگا اور پھر آزادانہ کردار کے تحفظ کے ساتھ دینی مدارس کے اخراجات میں ان سے تعاون، ان کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے میں ماہرین کے ذریعے سے ان کی راہنمائی، ان کی سندات کی مسلمہ حیثیت کو یقینی اور قابل عمل بنانے اور ان کے درمیان رابطہ وتعاون کی فضا کو بہتر بنانے کے اقدامات کے ذریعے سے حکومت دینی مدارس کی بہتر خدمت کر سکتی ہے۔

مائیکل اسکاٹ سے چند باتیں

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۸ و ۹ اپریل ۱۹۹۹ء)

فرانس کی ایک ٹیلی ویژن کمپنی کے نمائندہ مسٹر مائیکل اسکاٹ ان دنوں پاکستان آئے ہوئے ہیں اور مختلف دینی جماعتوں کے راہنماؤں سے مل رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ مغرب اور عالمِ اسلام کی موجودہ کشمکش کے حوالے سے اسلامی تحریکات بالخصوص جہادی قوتوں کی سرگرمیوں کے بارے میں ایک دستاویزی فلم کی تیاری میں مصروف ہیں اور اس کے لیے مختلف ممالک کا دورہ کر رہے ہیں۔ مائیکل اسکاٹ گوجرانوالہ میں میرے پاس بھی آئے اور متعلقہ امور پر دو نشستوں میں ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ایک نشست میں انہوں نے میرا انٹرویو لیا تو اس کے بعد میں نے کہا کہ میں بھی ان سے کچھ سوال و جواب کرنا چاہوں گا تو وہ دوسری نشست کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ گفتگو انگریزی میں ہوئی اور چونکہ میں انگلش سے بالکل نابلد ہوں اس لیے اس کے لیے ترجمانی کا سہارا لینا پڑا۔ مائیکل اسکاٹ سے بعض اہم امور پر جو گفتگو ہوئی اس کے کچھ پہلو اختصار کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

عالم اسلام اور مغرب کی کشمکش کے محرکات

مغرب اور عالمِ اسلام کی موجودہ کشمکش کے بارے میں انہوں نے میرا نقطۂ نظر معلوم کرنا چاہا تو راقم الحروف نے عرض کیا کہ یہ کشمکش تو موجود ہے اور دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے اسباب و عوامل کے حوالے سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے پیچھے یہودی ذہن کارفرما ہے، اور یہودیوں نے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں اور عیسائی دنیا کی کشمکش کے تاریخی پس منظر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغرب کی عیسائی حکومتوں اور عالمِ اسلام کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ ورنہ اس کشمکش میں اصل مفاد یہودی قوم کا ہے جبکہ عیسائی قوت اور وسائل اس مقصد کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہودیوں کی بہ نسبت مسلمان اور عیسائی آپس میں زیادہ قریب ہیں جس کا ذکر قرآن کریم نے بھی کیا

ہے اور ہمارے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک تیسری قوت کے خلاف مسلمانوں اور عیسائیوں کے اتحاد کی پیشگوئی کی ہوئی ہے۔

اس لیے ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مغرب اور عالمِ اسلام کی موجودہ کشمکش یہودیوں کی پیدا کردہ ہے۔ اور اگر مغرب کے مسیحی دانشوروں تک میرا یہ پیغام پہنچ سکے تو ان سے میری گزارش ہے کہ وہ اس سازش کو پہچانیں اور مسیحی دنیا کی قوت اور وسائل کو یہودیوں کے حق میں استعمال ہونے سے روکیں۔ اس مقصد کے لیے ہم ان سے گفت وشنید، مذاکرات اور افہام وتفہیم کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ بلکہ میں نے چند سال قبل امریکہ اور برطانیہ کے دو ذمہ دار مسیحی مذہبی راہنماؤں سے براہ راست اس مسئلہ پر گفتگو کی کہ انسانی سوسائٹی کو آسمانی تعلیمات سے ایک سازش کے تحت باغی کیا گیا ہے جس کا نتیجہ حلال وحرام کے تصور سے آزاد سوسائٹی کی صورت میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ شراب، بدکاری اور حرام خوری کی آزادی نے خاندانی سسٹم کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرہ کے ذہنی سکون کو غارت کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لیے انسانی معاشرہ کو آسمانی تعلیمات کے دائرہ میں واپس لانے کے لیے مسلمانوں اور مسیحی امت کے مذہبی راہنماؤں کو مشترکہ جدوجہد کرنی چاہیے۔

یہودیوں کے کردار کے حوالے سے مائیکل اسکاٹ نے کہا کہ اس معاملہ میں اہلِ مغرب کی سوچ کا انداز مختلف ہے۔ اور آپ لوگ یعنی مسلمان یہودیوں کو جس نظر سے دیکھتے ہیں ہم اہلِ مغرب انہیں اس طرح نہیں دیکھتے۔ بلکہ ہم انہیں مظلوم سمجھتے ہیں اور مغرب کا عام آدمی یہ سوچتا ہے کہ یہودیوں پر صدیوں تک جو مظالم ہوتے رہے ہیں اس کے ردعمل میں یہودیوں کی موجودہ صورتحال ایک تحفظاتی کیفیت ہے۔ اور جب ہم یہودی قوم کے موجودہ حالات کو ان پر صدیوں سے ہونے والے مظالم کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو لازماً ان کے بارے میں ہماری سوچ مسلمانوں کے تاثرات سے مختلف ہوتی ہے۔

میں نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ یہ بات درست ہے کہ یہودیوں پر صدیوں تک مظالم ڈھائے گئے ہیں اور انہیں مصائب ومشکلات کے ایک طویل دور سے گزرنا پڑا ہے۔ لیکن یہ مظالم ہم مسلمانوں نے تو نہیں ڈھائے۔ ابتدائی دور کے ایک دو واقعات کے علاوہ مسلمانوں کی چودہ سو

سال کی تاریخ میں کسی ایک واقعہ کی نشاندہی کر دی جائے کہ یہودی بحیثیت قوم کسی مسلمان حکومت یا قوم کے مظالم کا نشانہ بنے ہوں۔ یہ مظالم بھی تو ان پر مسیحی حکومتوں نے کیے ہیں اور یہودی صدیوں تک جس قتل عام اور اذیتوں کا نشانہ بنے ہیں وہ سب کچھ مسیحی حکومتوں اور قوموں کا کیا دھرا ہے۔ ماضی قریب میں یہودیوں کا قتل عام جرمن کی نازی حکومت نے کیا جو کہ عیسائی تھے۔ اس لیے اس بات کی کیا منطق ہے کہ عیسائیوں کے ظلم و تشدد کا صدیوں تک شکار رہنے کے بعد یہودیوں نے انہی عیسائیوں سے اتحاد کر لیا ہے؟ اور یہ اتحاد مسلمانوں کے خلاف ہے جس کے نتیجے میں فلسطینی مسلمانوں سے ان کا علاقہ چھین کر وہاں یہودی سلطنت قائم کی گئی، عربوں کو تہس نہس کر دیا گیا، خلیج پر بزور شمشیر قبضہ کر لیا گیا اور پورے عالمِ اسلام کو سیاسی و اقتصادی طور پر جکڑ کر بے بس کر دیا گیا ہے۔ اگر یہودیوں کی موجودہ صورتحال ان پر صدیوں سے ہونے والے مظالم کا ردعمل ہے تو یہ ردعمل ظلم کرنے والوں کے خلاف کیوں ظاہر نہیں ہوا، اس کا نشانہ مسلمان ہی کیوں ہیں؟

مائیکل اسکاٹ نے کہا کہ یہ بات ان کی سمجھ سے بھی بالاتر ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا ہے؟ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہودیوں کے بارے میں مغرب والوں کی سوچ کا انداز مسلمانوں سے مختلف ہے اور وہ انہیں ایک مظلوم قوم سمجھتے ہیں جو صدیوں کی مظلومیت کے بعد اب سنبھل رہی ہے۔

عالمی تہذیبی کشمکش میں کمی کے امکانات

مائیکل اسکاٹ نے سوال کیا کہ آپ کے خیال میں اس کشمکش میں اضافہ ہوگا یا اسے کم کرنے کا کوئی امکان بھی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ یہ کشمکش دن بدن بڑھے گی اور اس میں کمی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مغرب کی مسیحی قوتوں کو ابھی تک اس کا احساس نہیں ہو رہا کہ ایک قوت انہیں استعمال کر رہی ہے اور انہیں عالمِ اسلام کے سامنے صف آرا کر کے اپنے مقاصد حاصل کر رہی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عالمی سطح پر کوئی ایسا فورم موجود نہیں ہے جو اس کشمکش کو کم کرنے کے لیے مؤثر کردار ادا کر سکے۔ ایک اقوامِ متحدہ ہے لیکن وہ اس کشمکش میں غیر جانبدار نہیں بلکہ عالمِ اسلام کے خلاف خود فریق ہے۔

اقوامِ متحدہ کا اپنا تنظیمی ڈھانچہ اس قدر غیر متوازن ہے کہ عالمِ اسلام کو کسی بھی درجہ میں اس سے

انصاف کی کوئی توقع نہیں ہوسکتی۔ عالمِ اسلام کو سلامتی کونسل کی ایک بھی مستقل نشست حاصل نہیں ہے، ویٹو پاور حاصل نہیں ہے، اور اقوامِ متحدہ کی پالیسی سازی میں کوئی مؤثر حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اس لیے مغرب اور عالمِ اسلام کی موجودہ کشمکش میں اقوامِ متحدہ سے کسی مؤثر کردار کی توقع کرنا فضول ہوگا۔ ہاں اگر اقوامِ متحدہ کی از سرِ نو تنظیم کر کے اس کے تنظیمی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں، معروضی حالات کے مطابق عالمِ اسلام کو اس میں پوری نمائندگی دی جائے، سلامتی کونسل کی مستقل نشستیں مسلم ممالک کے لیے بھی مخصوص کی جائیں، انہیں بھی ویٹو پاور حاصل ہو، پالیسی کی تشکیل اور کنٹرول میں انہیں مؤثر حیثیت حاصل ہو، اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر نظر ثانی کر کے اس میں اسلامی عقائد و روایات اور کلچر کا بھی لحاظ رکھا جائے تو پھر شاید یہ ممکن ہو کہ اقوامِ متحدہ مغرب اور عالمِ اسلام کی کشمکش کو کم کرنے کے لیے کوئی کردار ادا کر سکے۔

کوسووو کے معاملے میں امریکی کردار

مائیکل اسکاٹ نے مجھ سے دریافت کیا کہ کوسووو کے مسئلہ پر امریکہ نے سربوں کے خلاف جو سخت رویہ اختیار کیا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میرا جواب یہ تھا کہ بوسنیا کے مسئلہ پر امریکہ اور مغرب کو اپنے جانبدارانہ رویہ کے حوالہ سے دنیا بھر میں جس رسوائی کا سامنا کرنا پڑا ہے، امریکہ اب اسے ''بیلنس'' کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور کوسووو میں سربوں کے خلاف سخت رویہ اپنا کر خود کو غیر جانبدار شو کرنا چاہتا ہے۔ لیکن عالمِ اسلام اتنا بے وقوف نہیں ہے اور پورے عالمِ اسلام کے بارے میں امریکہ کے مجموعی طرزِ عمل کو سامنے رکھتے ہوئے یہ جزوی مسئلہ اس کے بارے میں مسلمانوں کے تاثرات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکے گا۔ مائیکل اسکاٹ نے میری بات سے اتفاق کیا اور کہا کہ اس کے ساتھ ایک اور بات کو بھی شامل کر لیں کہ سرب اور مشرقی یورپ کے دیگر عیسائی آرتھوڈکس فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور روس بھی سربوں کی حمایت اس وجہ سے کر رہا ہے کہ روسی عیسائی بھی آرتھوڈکس فرقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ جبکہ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کے مسیحیوں کا تعلق رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں سے ہے اور آرتھوڈکس کے ساتھ ان کی صدیوں سے مخاصمت چلی آرہی ہے۔

اس پر میں نے سوال کیا کہ کیا پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک عیسائیوں کی بہ نسبت آرتھوڈکس عیسائیوں میں مسلمانوں کے خلاف زیادہ نفرت اور تعصب کی وجہ یہ تو نہیں کہ انہیں مشرقی یورپ میں ترکی کی خلافتِ عثمانیہ سے صدیوں تک سابقہ درپیش رہا ہے اور ان کے بہت سے علاقے ایک عرصہ تک خلافتِ عثمانیہ کے زیرنگیں رہے ہیں اور اس وجہ سے وہ مشرقی یورپ میں مسلمانوں کا وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں؟ مائیکل اسکاٹ نے کہا کہ یہ بات درست ہے لیکن رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسیحیوں کے جذبات بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہیں کیونکہ بوسنیا کے مسئلہ پر مسلمانوں کے خلاف سب سے زیادہ مؤثر کردار فرانس کے صدر متراں نے ادا کیا تھا اور اب بھی امریکہ کو سربوں کے خلاف یورپی حکومتوں کی بھرپور حمایت حاصل نہیں ہے۔

اسامہ بن لادن کی جدوجہد

مائیکل اسکاٹ نے الشیخ اسامہ بن لادن کے بارے میں دریافت کیا کہ مغرب میں اسامہ کو ''دہشت گرد'' سمجھا جاتا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ہمارے نزدیک اسامہ ''فریڈم فائٹر'' ہے اور آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اس لیے ہماری تمام تر ہمدردیاں اور دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مغرب نے فلسطینیوں سے ان کا علاقہ چھین کر سازش اور جبر کے ساتھ وہاں یہودی سلطنت قائم کی ہے اور اس کو مسلسل تحفظ فراہم کیا جا رہا ہے۔ فلسطینی دربدر پھر رہے ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ خلیج میں شخصی حکومتوں اور بادشاہتوں کو تحفظ مہیا کر کے امریکہ اور اس کے حواری اس خطہ کے عوام کو انسانی حقوق اور شہری آزادیوں سے مسلسل محروم رکھے ہوئے ہیں۔ امریکہ اور مغربی حکومتوں نے عراق اور کویت کا تنازعہ سازش کے تحت کھڑا کر کے اس بہانے خلیج پر فوجی قبضہ کر لیا ہے اور عربوں کے تیل اور سرمائے کا وحشیانہ استحصال کیا جا رہا ہے۔ جبکہ اس جبر وتشدد اور وحشت وبربریت کے خلاف آواز بلند کرنے اور اپنے جذبات کا اظہار کرنے کا کوئی اور معروف طریقہ عربوں کے پاس موجود نہیں ہے۔

اس لیے آزادی وخودمختاری کے حصول اور ناروا مغربی مداخلت کے خاتمہ کے لیے عرب

نوجوانوں کے پاس ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے جو اسامہ بن لادن نے اختیار کیا ہے۔ یہ کوئی نیا اور انوکھا طریقہ نہیں ہے بلکہ نوآبادیاتی سسٹم کے خلاف آزادی کے مجاہدوں نے دنیا کے ہر خطے میں ہمیشہ آخری چارہ کار کے طور پر یہی طریقہ اپنایا ہے اور استعماری حملہ آوروں کو شکست دی ہے۔ اس لیے ہم اسامہ بن لادن کو اس طرز عمل میں مجبور اور حق بجانب سمجھتے ہیں اور اس کی مکمل حمایت کر رہے ہیں۔

مائیکل اسکاٹ نے سوال کیا کہ عام پاکستانیوں کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ پاکستانیوں کو عربوں سے محبت ہے، حرمین شریفین سے عقیدت ہے اور یہودیوں سے نفرت ہے۔ وہ اسرائیل کے قیام اور خلیج میں امریکی فوجوں کی موجودگی کو ظلم سمجھتے ہیں اور خود پاکستان بھی اپنے قیام کے بعد سے اسی نوعیت کی امریکی مداخلت کا شکار چلا آ رہا ہے۔ اس لیے عام پاکستانی بھی اسامہ بن لادن سے محبت کرتے ہیں اور اسے خود اپنے ہی جذبات کا ترجمان سمجھتے ہیں۔

مسٹر مائیکل اسکاٹ کا کہنا ہے کہ وہ بوسنیا کی جنگ کے دوران وہاں گئے تو انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بہت سے نوجوان مختلف علاقوں سے وہاں آ کر لڑائی میں شریک تھے جن کا اس خطہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن وہ بوسنیائی مسلمانوں کے شانہ بشانہ اس معرکہ میں سربوں کے خلاف لڑ رہے تھے اور شہید ہو رہے تھے۔ انہوں نے ایک برطانوی نوجوان کو دیکھا جس کی شادی ایک بوسنیائی خاتون سے ہوئی تھی، وہ وہاں مجاہد کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہے۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ دوسرے کئی علاقوں میں جا کر جہاد میں شریک ہو چکا ہے جن علاقوں کے ساتھ اس کا سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مائیکل اسکاٹ کہتے ہیں کہ میرے ذہن نے سوچا کہ آخر وہ کون سا لنک اور تعلق ہے جو دنیا کے مختلف خطوں کے نوجوانوں کو ایک دوسرے کے علاقوں میں جا کر لڑنے پر مجبور کر رہا ہے؟ اور وہ یہی رشتہ معلوم کرنے کے لیے مختلف ممالک میں گھوم پھر رہے ہیں۔

نفاذِ اسلام کی اسلامی تحریکات

مائیکل اسکاٹ کا ایک سوال عالمِ اسلام کی اسلامی تحریکات اور ان کے باہمی تعلقات کے

بارے میں بھی تھا۔ میں نے گزارش کی کہ کم وبیش سبھی مسلم ممالک میں اسلامی تحریکات موجود ہیں جو مروجہ نوآبادیاتی سسٹم کے خاتمہ اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں۔ ان کے درمیان دینی اور نظریاتی رشتہ موجود ہے اور وہ ایک دوسرے کو دیکھے اور ایک دوسرے سے ملے بغیر بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، حمایت کرتے ہیں، اور جہاں موقع ملتا ہے تعاون سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان سب کا مقصد اور منزل ایک ہی ہے البتہ طریق کار مختلف ہے کہ ہر ملک کی تحریک نے اپنے معروضی حالات کے مطابق مناسب طریق کار اختیار کر رکھا ہے۔ جہاں ریاستی جبر زیادہ نہیں ہے وہاں نسبتاً کھلی فضا میں کام ہو رہا ہے اور جہاں ریاستی جبر میں تشدد ہے وہاں اس کے جواب میں بھی شدت کی فضا قائم ہوگئی ہے۔ مثلاً پاکستان میں اسلامی تحریکات کو ریاستی جبر کا کچھ زیادہ نشانہ نہیں بننا پڑا اس لیے یہاں نفاذ اسلام کی جدوجہد کھلی فضا اور جمہوری ذرائع سے آگے بڑھ رہی ہے۔ مگر الجزائر میں جمہوری ذرائع سے آگے آنے والی اسلامی تحریک کو عسکری جبر اور فوجی تشدد کے ذریعے دبانے کی کوشش کی گئی تو جواب میں بھی تشدد ابھرا جو کہ ایک فطری ردعمل ہے۔ خدانخواستہ پاکستان میں بھی اگر فوج کو اسلامی قوتوں کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی گئی، جیسا کہ عالمی استعمار کے ایجنڈے میں شامل ہے، تو اس کا ردعمل بھی اسی طرح ہوگا۔

راقم الحروف نے مائیکل اسکاٹ سے سوال کیا کہ مغرب میں رہنے والوں کا اس بارے میں کیا خیال ہے کہ ہمارے ہاں اسلامی تحریکات آگے بڑھ رہی ہیں، ان کی قوت اور باہمی ربط میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس سوچ کو تقویت حاصل ہو رہی ہے کہ زندگی کے اجتماعی معاملات سے مذہب کی لاتعلقی نقصان کا باعث بنی ہے، اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسولؐ کی تعلیمات کی طرف واپس جانا چاہیے اور اپنے اجتماعی نظام اور سوسائٹی سسٹم کو ان کی ہدایات کے تابع کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اسلامی تحریکات کا بنیادی فلسفہ یہی ہے اور وہ اسی کو لے کر مسلسل پیشرفت کر رہی ہیں۔

مائیکل اسکاٹ نے کہا کہ ہمارے ہاں یہ تصور موجود نہیں ہے اور ہم ریاستی اور حکومتی معاملات میں مذہب کے تعلق کو درست نہیں سمجھتے۔ لیکن ہم کسی مذہب کے خلاف بھی نہیں ہیں اور مذہب کو کسی بھی شخص کا ذاتی اور انفرادی معاملہ تصور کرتے ہیں۔

عالمی ذرائع ابلاغ کا جانبدارانہ طرز عمل

راقم الحروف نے مائیکل اسکاٹ سے عالمی ذرائع ابلاغ کے طرز عمل کے بارے میں دریافت کیا کہ ان کا رویہ اس قدر جانبدارانہ کیوں ہے؟ مائیکل نے اس بات سے اتفاق کیا کہ عالمی ذرائع ابلاغ اور گلوبل میڈیا میں مسلمانوں، بالخصوص اسلامی تحریکات کو جائز مقام حاصل نہیں ہے اور ان کا نقطۂ نظر صحیح طور پر سامنے نہیں آرہا جس کی وجہ سے ''کمیونیکیشن گیپ'' پیدا ہوگیا ہے اور غلط فہمیاں مسلسل بڑھ رہی ہیں۔

ایک اور سوال کے جواب میں مائیکل نے کہا کہ یہ بات بھی درست ہے کہ ابلاغ کے جو عالمی ذرائع درست ''پکچر'' اور معروضی صورتحال پیش کرنے کے دعوے دار ہیں وہ بھی حالات کی تصویر کو ایک خاص زاویے سے دکھاتے ہیں اور عالمی حالات کی منظر کشی میں ان کی اپنی ترجیحات کا خاصا دخل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اسلامی تحریکات کے بارے میں صحیح صورتحال اور ان کا اپنا موقف سامنے نہیں آپاتا۔ مائیکل اسکاٹ نے کہا کہ وہ اس کے اسباب کے بارے میں تو کوئی وضاحت نہیں کر پائیں گے، البتہ وہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ عالمی ذرائع ابلاغ سے مسلمانوں اور اسلامی تحریکات کا موقف بھی خود ان کی اپنی زبان میں سامنے آنا چاہیے تاکہ ان کے بارے میں رائے قائم کرنے والے کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ خود بھی اپنی دستاویزی فلم میں اس بات کی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اسلامی تحریکات کے راہنماؤں اور جہادی تحریکوں کے قائدین کا نقطۂ نظر خود ان کی زبان میں سامنے لائیں تاکہ تصویر کا یہ رخ بھی دنیا کے سامنے صحیح طور پر آجائے۔

خدا کرے کہ مسٹر مائیکل اسکاٹ اپنے اس وعدہ کی پاسداری کر سکیں ورنہ وہ پہلے مائیکل اسکاٹ نہیں ہیں، ان سے پہلے بھی بیسیوں مائیکل اسکاٹ یہاں آچکے ہیں اور اسی طرح کی باتوں سے ہمارا دل بہلاتے رہے ہیں مگر جب واپس اپنے ڈیسک پر پہنچے تو ''مائیکل اسکاٹ'' ہی ثابت ہوئے۔

جہادِ افغانستان میں امریکہ کا کردار

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ۔ ۲۷ جنوری ۲۰۰۱ء)

اکوڑہ خٹک کی متحدہ اسلامی کانفرنس میں پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا صلاح الدین فاروقی میرے ساتھ تھے، واپسی پر رات ٹیکسلا میں انہی کے ہاں قیام کیا۔ حسب سابق انہوں نے عشاء کے بعد ایک مسجد میں قرآن کریم کے درس اور اس کے بعد نوجوانوں کے ساتھ سوال و جواب کی نشست کا اہتمام کرلیا۔ ایک عرصہ تک میرا یہ معمول رہا کہ شمال کی طرف سے کسی بھی سفر میں ایک رات ٹیکسلا میں گزارتا تھا اور یہاں ایک نشست ایسی ہوجاتی تھی جس میں مختلف نوعیت کے سوال و جواب ہوتے اور شرکاء محفل کے ساتھ مجھے بھی یہ فائدہ ہوتا کہ متعدد مسائل پر ذہن ایک بار پھر حاضر ہوجاتا اور نت نئے نکات ذہن میں ابھرتے۔ کچھ عرصہ کے وقفہ کے بعد گزشتہ ایک دو سالوں سے یہ روایت پھر سے زندہ ہوگئی ہے، اسی حوالہ سے اس رات بھی اچھی خاصی نشست ہوگئی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس نشست کے اہم سوالات و جوابات کی ایک جھلک قارئین کے سامنے بھی آجائے۔

> سوال: کیا افغانستان کی جنگ دراصل امریکہ اور روس کی جنگ تھی جو امریکہ کے کہنے پر شروع ہوئی اور دینی حلقے امریکہ کے لیے استعمال ہوگئے؟ کیا اب بھی ایسا نہیں لگتا کہ امریکہ ہی کوئی چال ہے جس کی وجہ سے دینی حلقے پھر سے متحرک ہو رہے ہیں؟

میں نے اس سوال کے جواب میں یہ عرض کیا کہ اس سلسلہ میں دو باتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ یہ بات تاریخی طور پر غلط ہے کہ افغانستان میں روس کے خلاف جنگ امریکہ کے کہنے پر لڑی گئی ہے۔ اس لیے کہ افغانستان میں سوویت یونین کی مسلح افواج کی آمد پر مولوی محمد نبی محمدی، مولوی جلال الدین حقانی، مولوی محمد یونس خالص، مولوی ارسلان رحمانی اور دیگر جن علماء کرام نے اپنے اپنے علاقوں میں جہاد کا فتویٰ دے کر اس کا عملی آغاز کیا تھا ان کا امریکہ کے ساتھ

کوئی رابطہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے طور پر شرعی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے جہاد کا فتویٰ دیا اور انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں اس کا آغاز کر دیا۔ اس وقت ان کے پاس پرانا روایتی اسلحہ بھی مناسب مقدار میں نہیں تھا، وہ بوتلوں میں پٹرول اور صابن کے محلول بھر کر ان بوتل بموں سے ٹینکوں کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ اور شروع کے کم و بیش تین سال تک یہ کیفیت رہی ہے کہ وہ بہت معمولی اسلحہ کے ساتھ اور انتہائی فقر و فاقہ کے ماحول میں محض ایمانی قوت کے ساتھ روسی فوجوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ البتہ اس دوران جب انہوں نے افغانستان کے اچھے خاصے علاقے پر کنٹرول حاصل کر لیا تو امریکہ اور دیگر ممالک ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور پھر جس جس نے بھی روس کے ساتھ کوئی حساب چکانا تھا وہ اس جنگ میں کود پڑا۔ اس کے بعد امریکہ اور اس کے ساتھیوں نے اسلحہ بھی دیا، دولت بھی دی اور ہر طرح کی امداد کی۔ چنانچہ یہ کہنا تو درست ہے کہ اس جنگ میں امریکہ کا بھی مفاد تھا اور اس نے اپنے مفاد کی خاطر افغان مجاہدین کی بھرپور مدد کی ہے، لیکن یہ کہنا قطعی طور پر غلط اور حقائق کے منافی ہے کہ افغان جہاد امریکہ کے کہنے پر شروع کیا گیا تھا اور افغان علماء نے اس معرکہ میں امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔

دوسری بات، یہ کہنا درست ہے کہ روسی استعمار کے خلاف جہاد افغانستان کے نام پر لڑی جانے والی یہ جنگ ابتدائی تین چار سال کے بعد افغان مجاہدین اور امریکہ کی مشترکہ جنگ بن گئی تھی جس میں دونوں نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔ افغان مجاہدین کو یہ فائدہ پہنچا کہ امریکہ کے تعاون کی وجہ سے ان کی جنگ آسان ہوگئی۔ جبکہ امریکہ کو یہ فائدہ پہنچا کہ اپنی باقاعدہ فورسز استعمال کیے بغیر اس نے سوویت یونین کو شکست دے کر نہ صرف اس کے خلاف سرد جنگ جیت لی بلکہ ویت نام کی ہزیمت کا بدلہ بھی لے لیا۔

لیکن اس سوال کا جواب دینا ابھی باقی ہے کہ ان دونوں میں سے کس نے دوسرے کو استعمال کیا؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں جنگ کے بعد کے حقائق پر ایک نظر ڈالنا ہوگی۔ اور میں اس سلسلہ میں بھی ایک سادہ سا معیار اور کسوٹی پیش کرتا ہوں کہ اگر تو جنگ کے خاتمہ اور روس کی شکست کے بعد افغان مجاہدین کی قیادت امریکہ کے ایجنڈے پر چل رہی ہے اور افغانستان میں امریکہ کی پالیسیوں پر عمل ہو رہا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کر لینے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے کہ امریکہ

نے افغانستان میں اپنے مفاد کے لیے مولوی کو استعمال کر لیا ہے اور افغان مولوی نے جہاد کے نام پر امریکہ کی جنگ لڑی ہے۔ لیکن اگر افغان مولوی نے جنگ کے بعد والے افغانستان میں امریکہ کی پالیسی اور پروگرام کو مسترد کر کے اپنے ایجنڈے پر عمل شروع کر رکھا ہے اور وہ امریکہ کی طرف سے تمام تر مخالفت، دھمکیوں اور پابندیوں کے باوجود اپنے ایجنڈے پر قائم ہے تو ہمیں پورے شرح صدر کے ساتھ تاریخ کے اس فیصلے کو قبول کرنا ہوگا کہ افغان مولویوں نے اپنی جنگ کے لیے امریکہ کو استعمال کیا ہے۔ اور امریکہ بہادر اپنے تمام تر جاہ و جلال اور شکوہ و دبدبہ کے باوجود افغانستان کی سنگلاخ زمین پر سادہ، غریب اور بے سروسامان مولوی کے ہاتھوں بری طرح استعمال ہو گیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہی پیچ و تاب امریکہ کو اس حوالے سے کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہا۔

سوال: اگر افغان جنگ کمیونزم کے خلاف تھی تو یہ جنگ روس کے کمیونزم کے خلاف کیوں لڑی گئی ہے اور چین کا کمیونزم اس جنگ کے اثرات سے کیوں محفوظ ہے؟

میں نے عرض کیا کہ روس کے کمیونزم اور چین کے کمیونزم میں ایک بنیادی فرق تھا۔ وہ یہ کہ روس کے کمیونزم نے اپنے پاؤں پھیلا کر پوری دنیا پر اپنے فلسفہ کے تسلط کے لیے مہم شروع کر رکھی تھی۔ اور وسطی ایشیا اور افغانستان کو عبور کرنے کے بعد اس کا اگلا نشانہ پاکستان تھا جس کے لیے یہاں بھی خاصا ورک ہو چکا تھا۔ جبکہ چین کا کمیونزم جیسا کیسا بھی ہے اپنے ملک کی سرحدوں کے اندر ہے اور ملک سے باہر توسیع پسندانہ عزائم اور پروگرام نہیں رکھتا۔ اس لیے ہمیں اس سے اپنے لیے کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا افغان مولوی یا جنوبی ایشیا کے دینی حلقوں نے روس کے خلاف جو جنگ لڑی ہے وہ دراصل کمیونزم کے خلاف نہیں بلکہ اس کے توسیع پسندانہ عزائم اور پروگرام کے خلاف تھی، اور اپنے عقائد و روایات اور ملی تشخص کے تحفظ کے لیے تھی۔

اب اس خطہ کے دینی حلقوں کو یہی خطرہ امریکہ کی طرف سے درپیش ہے کہ وہ نیو ورلڈ آرڈر کے نام پر اور اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور کی آڑ میں مسلمانوں کو اسلام کے معاشرتی کردار اور اسلامی عقائد و احکام کے عملی نفاذ کے حق سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔ اس لیے وہی دینی حلقے اب امریکہ کے خلاف صف بندی میں مصروف ہیں۔ چین کی طرف سے اس قسم کی کوئی مہم نہیں

اس لیے اس کے خلاف ہماری کوئی جنگ بھی نہیں ہے اور ہم ایک عظیم اور دوست پڑوسی کی حیثیت سے اس کا احترام کرتے ہیں۔

سوال: چین کے صوبے سنکیانگ کے مسلمانوں پر ہونے والے ریاستی جبر اور سینکڑوں مسلمان نوجوانوں کی شہادت کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

میں نے عرض کیا کہ یہ مسئلہ موجود ہے اور ہمیں اس کی سنگینی کا احساس ہے۔ مگر ہم اس مسئلہ کے حوالہ سے امریکی عزائم سے بھی باخبر ہیں اور کسی قیمت پر یہ نہیں چاہتے کہ امریکہ اس مسئلہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چین کے خلاف کوئی محاذ گرم کر سکے۔ البتہ سنکیانگ کے مسلمانوں کے مذہبی حقوق کے بارے میں چینی حکومت سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ میں سنجیدگی سے توجہ دے۔ اور پاکستان کی دینی قیادت جہاں چینی حکمرانوں سے طالبان اور امریکہ کے سوال پر بات کرنے کی خواہشمند ہے وہاں سنکیانگ کے مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں بھی بات ہوگی۔ تاکہ یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو جائے اور امریکہ اسے چین کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال نہ کر سکے۔

اس موقع پر میں نے یہ بھی عرض کیا کہ جنوبی ایشیاء کے دینی حلقے اب امریکہ کے خلاف صف آراء ہو چکے ہیں اور امریکہ نے خود سلامتی کونسل کی قرارداد کی صورت میں اعلان جنگ کر دیا ہے۔ اس لیے اب آزمائش اور ابتلاء کا ایک اور دور شروع ہونے والا ہے جس میں اور کئی باتوں کے علاوہ یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ اس خطہ میں استعمار کے اصل دشمن کون ہیں اور استعمار دشمنی کے نام پر دولت اکٹھی کر کے چوری کھانے اور کھوکھلے نعرے لگانے والے کون ہیں۔

سانحہ گیارہ ستمبر اور افغانستان کی صورتحال

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۶ نومبر ۲۰۰۱ء)

گزشتہ روز لندن کے ٹی وی چینل اے آر وائی ڈیجیٹل کے پینل انٹرویو کے ایک پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔ موضوع ''افغانستان کی صورتحال'' تھا اور شرکائے گفتگو میں دیگر حضرات کے علاوہ برطانوی دارالامراء کے رکن لارڈ نذیر احمد بھی شامل تھے۔ اردو اور انگلش کے ایک گھنٹے کے اس ملے جلے پروگرام میں ٹیلی فون پر جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد اور صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کے ترجمان جنرل راشد قریشی سے بھی رابطہ کیا گیا اور پینل کے شرکاء نے ان سے سوالات کیے۔ ان کے علاوہ سیالکوٹ اور کراچی کے کچھ ناظرین نے بھی فون پر سوالات کیے اور اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

اے آر وائی ڈیجیٹل کا پینل انٹرویو

اے آر وائی ڈیجیٹل کے پی جے میر صاحب نے پروگرام کنڈکٹ کیا، ان کا پہلا سوال مجھ سے تھا کہ کیا آپ طالبان کی حمایت کرتے ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو دوسرا سوال ہوا کہ طالبان کی حمایت کس وجہ سے کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا اس لیے کہ طالبان ایک جائز موقف کے لیے لڑ رہے ہیں، وہ جہاد افغانستان کے منطقی اور نظریاتی نتائج کا تحفظ کر رہے ہیں۔ ان پر یہ جنگ ٹھونسی گئی ہے اور وہ مظلوم ہیں اس لیے میں ان کی حمایت کرتا ہوں۔ اس پر لارڈ نذیر احمد صاحب نے کہا کہ وہ اسامہ بن لادن کے حوالہ سے طالبان کے موقف سے اختلاف رکھتے ہیں کیونکہ جب امریکہ اور عالمی برادری نے ان سے مطالبہ کیا کہ اسامہ بن لادن ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کا مجرم ہے اس لیے اسے امریکہ کے حوالہ کر دیا جائے تو انہیں یہ مطالبہ مان لینا چاہیے تھا۔ آخر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابیٔ رسول حضرت ابوجندلؓ کو کفار مکہ کے مطالبہ پر ان کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے گزارش کی کہ یہ بات دو وجہ سے درست نہیں ہے۔

(۱) ایک اس وجہ سے کہ جناب رسول اللہؐ نے صلح حدیبیہ میں قریش کے مطالبہ پر حضرت ابوجندلؓ کو ان کے حوالہ کر دیا تھا لیکن یہ ایک معاہدہ کا نتیجہ میں تھا۔ کفار مکہ کے ساتھ آنحضرتؐ کا باقاعدہ معاہدہ ہوا تھا جس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ قریش مکہ کا کوئی شخص انہیں چھوڑ کر حضورؐ کے پاس جائے گا تو آپؐ اسے واپس کر دیں گے۔ یہ معاہدہ طے پانے کے بعد حضرت ابوجندلؓ پا بہ زنجیر حضورؐ کی خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ میں مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے آپ کے ساتھ مدینہ منورہ جانا چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں معاہدہ کر چکا ہوں اس لیے ساتھ نہیں لے جا سکتا چنانچہ ابوجندلؓ کو قریش مکہ اپنے ساتھ واپس لے گئے۔ لیکن امریکہ اور طالبان کے درمیان تو کوئی معاہدہ نہیں ہے، نہ مجرموں کے باہمی تبادلہ کا کوئی معاہدہ موجود ہے اور نہ ہی امریکہ نے طالبان حکومت کو تسلیم کیا ہے۔ اس لیے اسامہ بن لادن کے حوالہ کرنے کا مطالبہ کا ہی سرے سے کوئی جواز نہیں بنتا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ امریکہ نے اسامہ بن لادن کو مجرم قرار دے دیا ہے تو میرا سوال یہ ہے کہ اس کیس میں امریکہ کی حیثیت مدعی کی ہے یا مجسٹریٹ کی؟ اگر امریکہ مدعی ہے تو وہ کونسی غیر جانبدار عدالت ہے جس نے امریکہ کے اس موقف کو تسلیم کرتے ہوئے اسامہ بن لادن کو مجرم قرار دیا ہے؟ طالبان نے اسامہ کی حوالگی سے انکار نہیں کیا، صرف ثبوت مانگے ہیں اور غیر جانبدار عدالتی فورم کی تشکیل کا مطالبہ کیا ہے اور ان کا یہ موقف جائز ہے۔

گفتگو میں یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ طالبان پاکستان کے مخالف ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بالکل نہیں، طالبان نے کبھی پاکستان کی مخالفت نہیں کی اور نہ اب کر رہے ہیں۔ حکومت پاکستان کے موقف سے اختلاف اور چیز ہے اور پاکستان کی مخالفت اس سے بالکل مختلف معاملہ ہے۔ ہمیں ان دو باتوں میں فرق کرنا چاہیے۔

پھر یہ کہا گیا کہ پاکستان سے جو لوگ افغانستان میں لڑنے کے لیے جا رہے ہیں وہ پاکستان کے خلاف لڑیں گے۔ اس کا جواب قاضی حسین احمد صاحب نے دیا کہ طالبان نے کسی کو اپنے ملک

میں لڑنے کے لیے بلایا ہے اور نہ کوئی جا رہا ہے یہ محض پروپیگنڈا ہے۔ جبکہ میں نے عرض کیا کہ جو لوگ افغانستان میں جا کر جہاد میں شریک ہونے کا عزم ظاہر کر رہے ہیں وہ پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ امریکہ کے خلاف لڑنے کا عزم رکھتے ہیں اور امریکہ کے خلاف جنگ کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان تو اس جنگ میں خود کو فریق ہی تسلیم نہیں کر رہا تو اس کے خلاف جنگ کیسی؟

پینل گفتگو میں ایک اور سوال اٹھ کھڑا ہوا۔ قاضی حسین احمد نے اپنی ٹیلی فونک گفتگو میں کہا کہ جنرل پرویز مشرف اپنے موقف میں تنہا ہیں اور ان کے ساتھ ایک محدود ٹولہ ہے جبکہ پوری قوم ان کے اس موقف کے خلاف ہے۔ اس پر کہا گیا کہ دینی جماعتوں کو تو پارلیمنٹ میں کبھی ایسی نمائندگی حاصل نہیں رہی کہ وہ پوری قوم کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتیں اس لیے یہ کہنا کہ قوم ان کے ساتھ ہے مشکل بات ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس مسئلہ کا حل مشکل نہیں ہے، میری تجویز یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ قوم کا اجتماعی موقف کیا ہے، یا تو معطل پارلیمنٹ کا صرف اس مسئلہ پر دو گھنٹے کا اجلاس طلب کر لیا جائے اور اس سے استفسار کیا جائے کہ موجودہ حالات میں جنرل پرویز مشرف اور دینی جماعتوں میں سے کس کا موقف درست ہے اور قومی جذبات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس مسئلہ پر عوامی ریفرنڈم کرا لیا جائے، خود بخود فیصلہ ہو جائے گا کہ قوم اس مسئلہ میں کس کے ساتھ ہے۔

میں نے ریفرنڈم کا نام لیا تو گفتگو میں شریک ایک خاتون جرنلسٹ شیری رحمان نے صدر ضیاء الحق مرحوم کے ریفرنڈم کا ذکر چھیڑ دیا کہ انہوں نے ریفرنڈم کرایا تھا لیکن اس کے لیے جو الفاظ ڈیزائن کیے گئے تھے وہ مضحکہ خیز تھے۔ میں نے گزارش کی کہ الفاظ باہمی مشورہ سے ڈیزائن کر لیے جائیں اور عوام سے ان کے مطابق پوچھا جائے، آخر عوام سے پوچھیں تو سہی!

میں نے عرض کیا کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جنرل پرویز مشرف نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ حالات کے جبر کا نتیجہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر حالات کا یہ جبر نہ ہوتا اور جنرل پرویز مشرف آزاد فضا میں فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے تو ان کا فیصلہ یہ نہ ہوتا۔ البتہ انہوں نے فیصلہ کرنے میں جلدی سے کام لیا ہے اور اپنی قوم اور بین الاقوامی مسلم برادری کو اعتماد میں لینے سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا اور اس کا اعلان کرنے کے بعد صلاح مشورے شروع کیے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور

صدر پرویز مشرف فیصلہ کرنے سے قبل ملک کی دینی وسیاسی جماعتوں کو مشورہ میں شریک کر لیتے اور عالم اسلام کے راہنماؤں سے مشاورت کے ساتھ ساتھ او آئی سی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیتے تو کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آتا اور حالات اس مقام تک نہ پہنچتے جس کا ہم آج سامنا کر رہے ہیں۔

سیالکوٹ سے ایک صاحب نے فون پر سوال کیا کہ جس طرح نیٹو کے ممالک نے یہ طے کر رکھا ہے کہ ان میں سے کسی ایک پر حملہ نیٹو کے سب ارکان پر حملہ متصور ہوگا اس طرح کا کوئی معاہدہ مسلم ممالک آپس میں کیوں نہیں کر لیتے؟ اس پر گفتگو میں شریک مصری صحافی عبداللہ حمودہ نے کہا کہ یہ بات نظریاتی لحاظ سے تو ٹھیک ہے مگر عملاً مشکل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بے شک اس میں عملی مشکلات ہیں لیکن عالم اسلام کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مسلم دنیا کو بالآخر اس نکتے پر آنا ہوگا اور مشکلات کا حل نکالتے ہوئے نیٹو کی طرز کے مسلم بلاک کی تشکیل کرنا ہوگی۔

پینل گفتگو میں ننکانہ صاحب کے ناظم رائے محمد نواز کھرل بھی شریک تھے، انہوں نے صدر جنرل پرویز مشرف کے موقف کی تائید کی اور کہا کہ ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے طالبان کی بھی حمایت کی اور کہا کہ مسلمان کی حیثیت سے ہمارے دل طالبان کے ساتھ ہیں اور ہم ان کے لیے دعا گو ہیں۔

پینل کے سب شرکاء کا اس بات پر اتفاق تھا کہ سب کچھ کے باوجود افغانستان کی شہری آبادی اور متعین اہداف سے ہٹ کر امریکی اور برطانوی طیاروں کی بمباری قطعی طور پر غلط اور افسوسناک ہے اور موجودہ صورتحال میں صحیح بات یہی ہے کہ افغانستان پر فضائی حملے فوری طور پر بند کیے جائیں اور جنگی کارروائی روک کر مذاکرات اور سیاسی ذرائع سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

اسامہ بن لادن اور ان کی جدوجہد

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۰۲ء)

(لاہور کے ایک دینی حلقے کی طرف سے ''الشریعہ'' کے رئیس التحریر کو چند سوالات موصول ہوئے جن کے جوابات قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ ادارہ)

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کا سانحہ

سوال: ستمبر کے حملے کے بعد جو حالات پیش آئے ہیں، ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن میں پنٹا گون کی عمارت سے جہاز ٹکرانے کے جو واقعات ہوئے ہیں، ان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس نے کیے ہیں، اور خود مغربی ایجنسیاں بھی اس سلسلے میں مختلف امکانات کا اظہار کر رہی ہیں۔ لیکن چونکہ امریکہ ایک عرصہ سے معروف عرب مجاہد اسامہ بن لادن اور عالمِ اسلام کی مسلح جہادی تحریکات کے خلاف کارروائی کا پروگرام بنا رہا تھا، اور خود اسامہ بن لادن کی تنظیم ''القاعدہ'' کی طرف سے امریکی مراکز اور تنصیبات کو نشانہ بنانے کے اعلانات بھی موجود تھے، اس لیے امریکہ نے ان حملوں کا ملزم اسامہ بن لادن کو ٹھہرانے اور افغانستان کی طالبان حکومت سے اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کرنے کا فوری مطالبہ کر دیا اور اقوام متحدہ اور ورلڈ میڈیا کے ذریعے سے وہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش میں لگ گیا کہ ان حملوں کی ذمہ داری اسامہ بن لادن پر ہی عائد ہوتی ہے۔

جہاں تک ان حملوں کا تعلق ہے، دنیا کے ہر باشعور شخص نے ان کی مذمت کی اور ان میں ضائع ہونے والی ہزاروں بے گناہ جانوں کے نقصان پر افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن امریکہ

نے اس پر جس ردعمل کا اظہار کیا اور اس ردعمل پر اپنے آئندہ اقدامات کی بنیاد رکھی، اس کے بارے میں واضح تاثر یہ تھا کہ اس ردعمل کی بنیاد حوصلہ وتدبر پر نہیں بلکہ غصے اور انتقام پر ہے، اور عام طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ امریکہ بہرصورت فوری انتقامی کارروائی کرنے اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''جہادی تحریکات'' کو کچل دینے پر تل گیا ہے۔ اور اس کے بعد ہونے والے مسلسل اقدامات نے اس عمومی تاثر واحساس کی تصدیق کر دی ہے۔

جہاں تک الشیخ اسامہ بن لادن اور افغانستان کی طالبان حکومت کے موقف کا تعلق ہے، ان کے طریقۂ کار اور ترجیحات سے اختلاف کی گنجائش کے باوجود اصولی طور پر ان کا موقف درست تھا اور امریکہ کا موقف اس کے مقابلے میں کمزور اور بے وزن تھا۔ اسی لیے امریکہ نے کارروائی میں عجلت سے کام لیا تاکہ ۱۱ ستمبر کے واقعات کے نتیجے میں اسے عالمی سطح پر جو ہمدردی حاصل ہوئی ہے، اس کے ٹھنڈا پڑ جانے سے قبل وہ سب کچھ کر دیا جائے جس کے لیے امریکی دماغ اور ادارے کئی سال سے منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

اسامہ بن لادن روس کے خلاف ''جہادِ افغانستان'' میں عملاً شریک تھے اور امریکہ بھی اس جہاد کا سب سے بڑا اسپورٹر تھا، اسی لیے اس دور میں مغربی ذرائع ابلاغ اور خود امریکی ادارے انہیں ایک عظیم مجاہد کے طور پر پیش کرتے رہے اور جہادِ افغانستان کے خاتمے کے بعد اسامہ بن لادن ایک ہیرو کے طور پر اپنے وطن واپس جا چکے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ خود ان کے اپنے ملک سعودی عرب اور اس کے ساتھ پورے عرب خطے کو امریکہ کے ہاتھوں وہی صورتحال درپیش ہے جو جہادِ افغانستان سے قبل افغانستان کو روس کے ہاتھوں درپیش تھی تو ان کے لیے اس صورتحال کو قبول کرنا ممکن نہ رہا۔ انہوں نے دیکھا کہ

☆ خلیجِ عرب میں امریکی فوجیں مسلسل بیٹھی ہیں جس کی وجہ سے عرب ممالک کی آزادی اور خودمختاری ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے،

☆ عرب ممالک کی دولت اور تیل کا بے دردی کے ساتھ استحصال کیا جا رہا ہے،

☆ عرب عوام کو انسانی، شہری اور شرعی حقوق حاصل نہیں ہے اور اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کا کوئی موقع بھی میسر نہیں ہے،

☆ جبکہ فلسطین کے خلاف اسرائیل کی جارحیت اور تشدد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور فلسطینی عوام پر ان کی اپنی زمین تنگ کر دی گئی ہے۔

تو انہوں نے صدائے احتجاج بلند کی اور مطالبہ کیا کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی فوجیں خلیج عرب سے نکل جائیں۔ لیکن چونکہ ان کے ملک میں اس قسم کی بات کہنے اور کوئی سیاسی مہم چلانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اس لیے انہیں مجبوراً اس رخ پر آنا پڑا کہ وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کریں اور خلیجِ عرب سے امریکی فوجوں کی واپسی کے لیے اسی قسم کی جدوجہد منظّم کریں جس طرح کی جدوجہد کا تجربہ افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے لیے اس سے قبل ہو چکا تھا اور وہ خود اس میں شریک رہے تھے۔

اسامہ بن لادن کے طریق کار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس بات سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ان کا موقف اور مطالبہ اصولی طور پر درست تھا۔ اور اس بات سے اختلاف کرنا بھی ممکن نہیں ہے کہ سعودی عرب اور خلیج عرب کے دیگر ممالک میں سیاسی جدوجہد کے راستے مکمل طور پر مسدود ہونے کی وجہ سے اسامہ بن لادن اور ان کے رفقاء کے لیے اپنے جذبات اور موقف کے اظہار کے لیے صرف ایک راستہ باقی رہ گیا تھا جسے تشدد کا راستہ کہا جاتا ہے اور جس پر اسامہ بن لادن کو مطعون کیا جاتا ہے، لیکن طعن و تشنیع کرنے والے اس معروضی تناظر سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ ان حالات میں ان کے لیے اس کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔

اسامہ بن لادن کا خیال تھا کہ وہ جہاد افغانستان میں ٹریننگ لینے والے دنیا بھر کے مجاہدین کو ایک نظم اور پروگرام میں منسلک کریں گے اور اس طرح ایک ایسا مزاحمتی گروپ وجود میں آ جائے گا جو عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں ہونے والے جبر و تشدد کے خلاف ''پریشر گروپ'' کا کام کرے گا، اور شاید وہ اس کے ذریعے سے اسرائیلی جارحیت کے سامنے کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے اور خلیج عرب میں امریکی فوجوں کے خلاف اس حد تک دباؤ منظّم کرنے میں کامیاب ہو جائیں جو امریکہ کو خلیج عرب میں اپنی فوجوں کی موجودگی کے تسلسل پر نظر ثانی کے لیے مجبور کر سکے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے سوڈان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا لیکن امریکی دباؤ کی وجہ سے سوڈان کی حکومت کے لیے اسامہ بن لادن کا وجود برداشت کرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ وہ سوڈان چھوڑ کر افغانستان آ گئے

جہاں طالبان کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور وہ ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے قیام اور امریکہ کے تسلط سے عالمِ اسلام بالخصوص خلیج عرب کی آزادی کے حوالے سے اسامہ بن لادن کے موقف سے متفق تھی۔ ان کے ساتھ وہ ہزاروں عرب مجاہد بھی افغانستان آ گئے جو جہادِ افغانستان میں شریک تھے اور اسلامی جذبات سے سرشار ہونے کی وجہ سے اپنے اپنے ملکوں میں واپس جانے کی صورت میں حکومتوں کی طرف سے انتقامی کارروائیوں اور ریاستی جبر کا نشانہ بننے کے خطرات سے دوچار تھے۔

طالبان حکومت نے نہ صرف انہیں پناہ دی بلکہ موقف اور جذبات کی ہم آہنگی اور دینی حمیت میں شراکت کی وجہ سے دونوں میں ایسے تعلقات کار بھی قائم ہو گئے کہ انہیں ایک ہی منزل کے مسافر سمجھا جانے لگا۔ اس کے باوجود طالبان حکومت نے ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد یکطرفہ موقف اختیار نہیں کیا بلکہ ان واقعات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر ثبوت فراہم کر دیے جائیں تو وہ اسامہ بن لادن کو حوالے کر دینے کے مطالبے پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں، یا کسی ایسے بین الاقوامی فورم کے حوالے بھی کر سکتے ہیں جو غیر جانبدار ہو۔ مگر امریکہ نے رعونت اور ہٹ دھرمی کے ساتھ ان کے اس جائز موقف کو مسترد کر دیا اور اپنے الزامات کو ہی قطعی ثبوت قرار دیتے ہوئے افغانستان پر حملہ کا اعلان کر دیا جس کے ذریعے سے امریکہ نے وہ دونوں مقاصد حاصل کر لیے جو اس نے پہلے سے طے کر رکھے تھے اور ۱۱ ستمبر کے واقعات ان کے لیے محض بہانہ ثابت ہوئے۔

طالبان حکومت کا خاتمہ

سوال: افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوا ہے۔ اسے آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: طالبان حکومت قائم ہوتے ہی مجھے یہ خدشہ محسوس ہونے لگا تھا اور میں نے کئی مضامین میں اس کا اظہار بھی کیا کہ اس حکومت کو برداشت کرنا نہ صرف یہ کہ امریکہ کے لیے ممکن نہیں ہے بلکہ وہ مسلمان حکومتیں بھی اسے اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہیں جو اپنے ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریکات کا سامنا کر رہی ہیں۔ کیونکہ طالبان حکومت کی کامیابی کا واضح مطلب یہ ہوتا کہ مسلمان

ملکوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریکات کو تقویت حاصل ہوتی اور ایک کامیاب حکومت کی صورت میں عملی آئیڈیل بھی مل جاتا۔ اس لیے امریکہ اور کفر کی دیگر طاقتوں کے ساتھ ان مسلم حکومتوں کا اتحاد ایک فطری بات تھی اور ان سب نے مل کر ایک ایسی حکومت کو ختم کر دیا ہے جو اپنی کامیابی کی صورت میں دونوں کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔ خطرہ اس معنی میں نہیں کہ وہ کوئی بہت بڑی قوت ہوتی بلکہ اس معنی میں کہ موجودہ عالمی سسٹم سے ہٹ کر اور اس سے بغاوت کر کے ایک الگ نظریہ اور فلسفہ کے تحت بننے والی کسی حکومت کی کامیابی سے ان تمام قوتوں اور عناصر کو بغاوت کا راستہ مل جاتا جو موجودہ عالمی سسٹم سے مطمئن نہیں ہیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے راستے تلاش کر رہے ہیں۔ اسی لیے اسے بہت بڑا خطرہ سمجھا گیا اور اسے ختم کرنے پر دنیا کی سب حکومتیں اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود متفق ہو گئیں۔

امریکہ اور اس کی زیر قیادت عالمی استعمار کو عالمِ اسلام سے کوئی فوجی، سیاسی یا معاشی خطرہ نہیں ہے اور نہ مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان ہی ہے۔ بلکہ فوجی، سیاسی اور معاشی طور پر پورا عالمِ اسلام امریکہ کے شکنجے میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے۔ مگر مغربی تہذیب وثقافت اور فلسفہ ونظام کے مقابلے میں اگر کسی فلسفہ ونظام اور تہذیب وثقافت میں کھڑا ہونے کی قوت وصلاحیت موجود ہے تو وہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ اسی وجہ سے امریکہ اور اس کے اتحادی اسلامی تحریکات کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہیں اور بجا طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اس فلسفہ ونظام اور تہذیب وثقافت کو اگر دنیا کے کسی خطے میں ایک ریاستی سسٹم کے طور پر قدم جمانے کا موقع مل گیا تو وہ موجودہ عالمی نظام اور مغربی فلسفہ وثقافت کے لیے حقیقی خطرہ بن سکتا ہے۔ اسی وجہ سے موجودہ عالمی سسٹم کے ارباب حل وعقد نے قطعی طور پر یہ بات طے کر رکھی ہے کہ دنیا کے کسی کونے میں کوئی ایسی مسلمان حکومت وجود میں نہ آنے پائے جو موجودہ عالمی سسٹم اور بین الاقوامی نیٹ ورک سے ہٹ کر ہو، یا دوسرے لفظوں میں اقوامِ متحدہ کی بالادستی قبول کرنے کے بجائے وہ اپنا کوئی الگ ایجنڈا رکھتی ہو۔ افغانستان میں طالبان کی اسلامی نظریاتی حکومت کو تسلیم نہ کرنے اور اب اسے فوجی طاقت کے زور پر ختم کر دینے کا بھی یہی پس منظر ہے۔

البتہ طالبان حکومت کے خاتمے پر انتہائی افسوس اور صدمہ کے باوجود کسی حد تک یہ بات

اطمینان بخش ہے کہ طالبان حکومت کا خاتمہ فلسفہ ونظام اور تہذیب وثقافت میں مغرب کی بالادستی کے حوالے سے نہیں ہوا بلکہ محض مادی طاقت، جبر وتشدد اور عسکری قوت کے زور پر اسے ہٹایا گیا ہے۔ فکر وفلسفہ اور نظام وثقافت اگر زندہ ہوں تو عسکری ناکامیاں زیادہ دیر تک ان کا راستہ نہیں روک سکتیں اور وہ کسی نہ کسی طرح سے اپنے اظہار اور پیش قدمی کے راستے نکال لیا کرتے ہیں۔

افغانستان کا متوقع مستقبل

سوال: مستقبل میں افغانستان کی صورتحال کیا ہوگی؟

جواب: میرے خیال میں امریکی اتحاد کی پشت پناہی سے قائم ہونے والی حکومت افغانستان میں امن قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوگی اور افغانستان کے سب قبائل کو مطمئن کرنا اس کے بس میں نہیں ہوگا۔ یہ صرف اسلام اور ایمان کی قوت تھی جس نے قبائلی تعصّبات اور علاقائی امتیازات کو دبا رکھا تھا۔ اس کا پردہ ہٹ جانے کے بعد اب تمام معاملات قبائل اور علاقائیت کے حوالے سے طے پائیں گے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان عصبیتوں میں اضافہ ہوگا۔ جبکہ مغربی قوتوں کا مفاد بھی اسی میں ہوگا کہ یہ عصبیتیں بڑھیں اور اختلافات وتفرقہ کا ماحول قائم رہے تاکہ وہ اس کی آڑ میں افغانستان پر اپنا کنٹرول زیادہ دیر تک قائم رکھ سکیں اور وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا کے حوالے سے اپنے ایجنڈے کی تکمیل کر سکیں۔

دوسری طرف طالبان تحریک نے میدانِ جنگ سے پسپائی اختیار کی ہے، ذہنی طور پر شکست اور دستبرداری قبول نہیں کی۔ اور ان کی افرادی قوت بڑی حد تک محفوظ ہے اس لیے وہ کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ منظّم ہوں گے اور مزاحمت کا راستہ اختیار کریں گے جس کی حمایت وتعاون کرنا اس خطے کی ان تمام قوتوں کی مجبوری بن جائے گا جو امریکہ کی یہاں مستقل موجودگی کو اپنے مفادات کے لیے خطرہ تصور کرتے ہیں۔ وقتی لشکر کشی میں امریکی اقدامات کا ساتھ دینا اور بات ہے اور اس خطے میں امریکہ کی مستقل فوجی موجودگی کو قبول کرنا اس سے بالکل مختلف امر ہے۔ اس لیے اس کا فائدہ ہر اس قوت کو ہوگا جو افغانستان میں امریکی اتحاد کی فوجوں کی مستقل یا زیادہ دیر تک موجودگی کے خلاف مزاحمت کا راستہ اختیار کرے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ طالبان کی یہ مزاحمتی تحریک

دوبارہ منظّم ہونے میں ایک سال اور اپنے ہدف تک پہنچنے میں پانچ چھ سال کا عرصہ لے سکتی ہے اور افغان قوم کے مزاج، روایات اور تاریخی تسلسل کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے اس کی کامیابی میں شک اور تردد کی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی۔

مسلم حکومتوں کا کردار

سوال: القاعدہ اور طالبان کو نشانہ بنا کر امتِ مسلمہ پر جو ظلم کیا گیا ہے، اس میں اسلامی ممالک کی کیا ذمہ داری ہے؟

جواب: میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ موجودہ مسلم حکومتیں عالمی نظام اور اقوامِ متحدہ کے نیٹ ورک کا حصہ ہیں، وہ اس سے بغاوت اور انحراف کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اس لیے ان سے کسی ذمہ داری کی ادائیگی بلکہ کسی بھی درجے میں کسی خیر کی توقع کرنا ہی فضول ہے۔ اسلامی تحریکات کو مسلم عوام سے اپنا رشتہ استوار کرنا ہوگا اور انہی کے اعتماد اور تعاون سے اپنے کام کو آگے بڑھانا ہوگا، اس کے سوا ان کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے۔

اسلامی تحریکات کے لیے لائحہ عمل

سوال: مستقبل میں مجاہدین کو کس طرح کا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے؟ بالخصوص اب جبکہ پاکستان میں بھی مجاہدین کے خلاف عملی کارروائی ہونے کی توقع ہے؟

جواب: میں اصولی طور پر تشدد کے حق میں نہیں ہوں اور پُر امن سیاسی جدوجہد کا قائل ہوں۔ اسی وجہ سے جہاں سیاسی جدوجہد کے راستے کھلے ہوں وہاں کسی قسم کی پُر تشدد تحریک کو جائز نہیں سمجھتا، اور پاکستان میں بھی نفاذِ اسلام کی جدوجہد کے لیے تشدد اور عسکریت کا راستہ اختیار کرنا میرے نزدیک درست طرزِ عمل نہیں ہے۔ البتہ جہاں عالمی جبر یا ریاستی تشدد کی فضا موجود ہو اور اس کے خلاف رائے عامہ کو منظّم کرنے، اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے، اور سیاسی دباؤ ڈالنے کے تمام راستے مسدود ہوں، وہاں احتجاج کرنے اور کلمۂ حق بلند کرنے والوں کی طرف سے تشدد کا راستہ اختیار کرنے کو ان کی مجبوری سمجھتا ہوں اور مجبوری ہی کے درجے میں ان کی حمایت کو دینی

حمیت کا تقاضا تصور کرتا ہوں۔ اسی طرح جن غیر مسلم ممالک میں مسلم اکثریت کے خطے اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، ان کی جدوجہد میرے نزدیک جہاد ہے۔ اس پس منظر میں ’’جہادی تحریکات‘‘ کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ مل بیٹھ کر اپنی پالیسی اور طریق کار کا ازسرنو جائزہ لیں، اپنی غلطیوں کی نشاندہی کریں، ترجیحات پر نظر ثانی کریں، اور اہل علم ودانش کو اعتماد میں لے کر اپنا آئندہ طرزِ عمل طے کریں۔

میرے نزدیک جن باتوں نے جہادی تحریکات کو نقصان پہنچایا ہے، ان میں چند اہم امور یہ ہیں:

(۱) اصل اہداف سے ہٹ کر جذباتی نعرہ بازی مثلاً دہلی کے لال قلعہ پر جھنڈا لہرانے، پاکستان میں طالبان کی طرز پر انقلاب لانے، اور مغربی ملکوں کے مراکز کو نشانہ بنانے کی باتیں، جنہوں نے ان سب قوتوں کو نہ صرف چوکنا کیا بلکہ متحد بھی کر دیا۔

(۲) ایجنسیوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ اختلاط اور اس اختلاط میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی درپردہ کوششیں جن کی وجہ سے پالیسی سازی اور فیصلوں کی قوت بتدریج جہادی تحریکات کی لیڈرشپ کے ہاتھوں سے نکلتی چلی گئی۔

(۳) باہمی مشاورت، تعلقات کار اور انڈرسٹینڈنگ کے ضروری اہتمام سے گریز۔

(۴) ملک کے داخلی معاملات بالخصوص فرقہ وارانہ امور میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ملوث ہونا۔

(۵) اور اہلِ علم و دانش سے صرف تعاون اور سرپرستی کے حصول پر قناعت کرتے ہوئے ان سے راہنمائی اور مشاورت کی ضرورت محسوس نہ کرنا۔

یہ اور اس قسم کی دیگر کئی باتیں ہیں جنہوں نے جہادی تحریکات کو نقصان پہنچایا اور ان کے مخالف عناصر کو اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ اس لیے جہادی تحریکات کو اپنی پالیسیوں اور طریق کار کا ازسرنو جائزہ لینا چاہیے اور اہلِ علم و دانش کی راہنمائی میں لائحہ عمل اور ترجیحات کا پھر سے تعین کرنا چاہیے۔

فدائی حملے

سوال: حال ہی میں انڈین پارلیمنٹ پر فدائی حملہ ہوا ہے، اس کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: یہ حملہ جس نے بھی کیا ہے، اس نے انڈیا کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف کارروائی کی راہ ہموار کرے اور امریکہ کو جہادی تحریکوں کے خلاف دباؤ بڑھانے میں اس سے سہولت حاصل ہوئی ہے۔ اس پس منظر میں مجھے یہ حملہ کسی بین الاقوامی پلان کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ کشمیر اور فلسطین

سوال: مسئلہ کشمیر اور فلسطین کے مسئلے میں امریکہ کیا اب سنجیدگی سے غور کرے گا؟ میری مراد اس سے اقوام متحدہ ہے۔

جواب: فلسطین اور کشمیر دونوں جگہ امریکہ کی دلچسپی یا اقوامِ متحدہ کی تھوڑی بہت حرکت کا بنیادی سبب مزاحمتی تحریک اور مجاہدین کا کسی نہ کسی حد تک دباؤ ہے۔ یہ دباؤ موجود رہا تو شاید اقوامِ متحدہ اور امریکہ کسی درجے میں ان مسائل کے حل میں دلچسپی لیں۔ اور اگر یہ دباؤ ختم ہو گیا یا جیسا کہ خود امریکہ کا پروگرام ہے کہ مجاہدین کے اس دباؤ کو بزور بازو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد حالات کے نارمل ہو جانے پر امریکہ، اقوام متحدہ یا دیگر مغربی قوتوں کے لیے کوئی دردِ سر باقی نہیں رہے گا کہ وہ ان مسائل کے حل میں دلچسپی لیں، اور پھر عربوں اور پاکستان کو آزادی اور اطمینان کی فضا میں اقتصادی اور معاشی ترقی کا موقع بھی فراہم کریں۔ یہ سب باتیں امریکہ کے اپنے مفادات کے خلاف ہیں اس لیے اس سے یا اقوامِ متحدہ سے اس سلسلے میں کسی مثبت کردار کی توقع ایک خوش فہمی اور خام خیالی سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔

’’دہشت گردی‘‘ کے حوالے سے اسلامی نظریاتی کونسل کا سوالنامہ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

سوالنامہ

اسلام امن و آشتی اور صلح و سلامتی کا مذہب ہے، اس نے انسانی زندگی کی حرمت کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے اور اگر کسی مسلمان ملک میں غیر مسلم اقلیت آباد ہو تو اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، نیز نجی زندگی سے متعلق معاملات میں انہیں اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی دی گئی ہے۔ اس نے نہ صرف ظلم و تعدی سے روکا ہے بلکہ ظلم کے جواب میں دوسرے فریق کے بارے میں حد انصاف سے متجاوز ہو جانے کو ناپسند کیا ہے اور انتقام کے لیے بھی مہذب اور عادلانہ اصول و قواعد مقرر کیے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے زیادہ تر اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کی نیت سے اور کسی قدر غلط فہمیوں کی بنا پر اس وقت عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گردی سے جوڑ دیا گیا ہے اور اس جھوٹ کو اس قدر دہرایا گیا ہے کہ اب ایک طبقہ اسلام اور دہشت گردی کو مترادف سمجھنے لگا ہے۔ ان حالات میں علماء، فقہاء اور ارباب افتاء کی ذمہ داری ہے کہ دہشت گردی کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کو واضح کریں اور اسلام نے امن، صلح، عدل، مذہبی رواداری اور غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کی جو ہدایات دی ہیں، ان کو واضح کریں تا کہ لوگوں کے سامنے اسلام کی حقیقی اور سچی تصویر آسکے۔ اس پس منظر میں درج ذیل سوالات آپ کی خدمت میں پیش ہیں:

(۱) اسلامی نقطہ نظر سے ’دہشت گردی‘ کی تعریف اور حقیقت کیا ہے؟

(۲) یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات حکومتیں اپنے ملک میں بسنے والے تمام طبقات کے

ساتھ عدل و مساوات کا سلوک نہیں کرتیں بلکہ بعض طبقات کے ساتھ سیاسی و معاشی نا انصافی روا رکھی جاتی ہے اور کبھی تو ان کے جان و مال کے تحفظ میں بھی دانستہ کوتاہی سے کام لیا جاتا ہے یا سرکاری سطح پر ایسی تدبیریں کی جاتی ہیں کہ وہ طبقہ جانی و مالی نقصان سے دوچار ہو۔ تو کیا حکومتوں کے اس غیر منصفانہ اور ظالمانہ رویے پر بھی 'دہشت گردی' کا اطلاق ہوگا؟

(۳) اگر کسی گروہ یا طبقہ کے ساتھ ناانصافی روا رکھی جاتی ہے تو اس پر احتجاج اور ردعمل کا اظہار جائز ہے یا واجب؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ کیا مظلوم کا ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا بھی 'دہشت گردی' کے دائرے میں آتا ہے؟

(۴) اگر ایک طبقہ کی طرف سے ظلم و زیادتی ہو جس میں اس طبقہ کے کچھ افراد شریک ہوں تو کیا مظلوموں کو ظلم کرنے والے گروہ کے ان لوگوں سے بدلہ لینا جائز ہے جو بے قصور ہوں اور جو خود اس ظلم میں شامل نہ ہوں؟

(۵) مسلمان ملکوں میں جو غیر مسلم شہری آباد ہیں، ان کو اپنے مذہبی معاملات یعنی عقیدہ، عبادت، شخصی قوانین وغیرہ میں کس حد تک آزادی حاصل ہے؟

(۶) جہاں بھی دہشت گردی پیدا ہوتی ہے، وہاں اس کے کچھ بنیادی اسباب و محرکات ہوتے ہیں، جیسے کسی گروہ کے ساتھ معاشی یا سیاسی ناانصافی، یا کسی گروہ کے اندر طاقت و قوت کے ذریعہ حکومت اور معاشی وسائل پر تسلط حاصل کر لینے کی خواہش۔ ان اسباب کے تدارک کے لیے اسلام کیا ہدایات دیتا ہے؟

(۷) اگر کسی گروہ یا فرد کی جان و مال یا عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے تو اس کے دفاع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ حتی المقدور مدافعت واجب ہے، مباح ہے یا مستحب؟ نیز حق مدافعت کے حدود کیا ہیں؟

جواب

نحمدہ تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین.

اسلام بلاشبہ صلح و آشتی اور امن و سلامتی کا دین ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور ایمان کا ایک معنی یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان کے شر سے لوگ محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جسے دوسرے لوگ اپنی جان و مال پر امین سمجھیں اور انہیں اپنی جان و مال اور آبرو کے حوالے سے اس سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسلام اعتدال و توازن کا دین ہے جو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق کے تحفظ اور حصول کا راستہ بھی بتاتا ہے اور اس کی تلقین کرتا ہے۔ ظلم و تعدی اور جبر و ناانصافی انسانی سوسائٹی کے لوازم میں سے ہے جو نسل انسانی کے آغاز سے جاری ہے اور اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اس لیے ایک جامع اور مکمل ضابطہ حیات اور نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام ظلم و تعدی کو روکنے اور جبر و ناانصافی کے سدباب کے لیے بھی ایک مستقل فلسفہ و نظام رکھتا ہے جس کی تفصیلات قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ہر دور میں اس زمانے کے مقتضیات اور احوال کی روشنی میں فقہاء امت اس فلسفہ و نظام کی احکام و قواعد کی شکل میں وضاحت کرتے آرہے ہیں۔

خلافت راشدہ سے لے کر خلافت عثمانیہ کے خاتمہ (۱۹۲۴ء) تک چونکہ اسلامی احکام و قوانین کا نفاذ کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی سطح پر تسلسل کے ساتھ موجود رہا ہے اس لیے ہر دور میں نئے پیش آمدہ مسائل و مشکلات کا حل بھی ساتھ ساتھ سامنے آتا رہا ہے جس میں قضاۃ کے اجتہادی فیصلوں کے علاوہ ارباب علم اور اصحاب استنباط کی آزادانہ اجتہادی کاوشیں بھی شامل ہیں اور انسانی سوسائٹی کے حالات میں تغیر کے ساتھ ساتھ اجتہادی دائرہ میں ضرورت کے مطابق شرعی احکام و قوانین میں ضروری تغیر و تبدل کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے البتہ خلافت کے زوال و ادبار کے دور میں بدقسمتی سے اجتماعی زندگی کے مسائل و ضروریات کی طرف اہل علم و دانش کی توجہ کم ہوتی گئی اور بیرونی افکار و نظریات اور فلسفہ و تہذیب کے مسلم معاشرے میں فروغ کے باعث اور اس سے پیدا ہونے والی آزادروی کی وجہ سے ارباب فقہ و استنباط تحفظات کا شکار ہو کر ''جمود'' پر قناعت میں عافیت محسوس کرنے لگے تو جدید پیش آمدہ مسائل اور فکری و علمی چیلنجز کے حوالے سے استنباط اور اجتہاد کا وہ تسلسل قائم نہ رہ سکا جو تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے زمانے کی رفتار کا ساتھ دے سکتا اور اگرچہ بہت سے علمی اداروں اور شخصیات نے اس خلا کو پر کرنے کی اپنے اپنے طور پر کوشش کی لیکن

تنفیذی اور اجتماعی اجتہاد و استنباط کے فقدان اور شخصیات و مراکز کے انفرادی اجتہاد و استنباط میں فطری اختلاف کے باعث وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے جو اس اجتہاد و استنباط کا اصل مقصد وہدف تھے اور باہمی ربط و مفاہمت کا کوئی سسٹم موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ نظری وفکری خلفشار کا عنوان بن گئے۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمے اور اقوام متحدہ کے تحت اس کے منشور کے حوالے سے نئے عالمی نظام کے آغاز کے بعد دنیا کی صورتحال یکسر تبدیل ہو گئی تھی اور بین الاقوامی تعلقات کے ساتھ ساتھ ہمارے داخلی اجتماعی نظام کے احکام وقوانین کا بھی ایک بڑا حصہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اجتہاد و استنباط کے ایک نئے اور ہمہ گیر عمل سے گزارے جانے کا متقاضی تھا لیکن عالمی سطح پر ملت اسلامیہ کے پاس اس کا کوئی فورم موجود نہیں تھا، مسلم حکومتوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور انفرادی طور پر اس عمل کا اہتمام کرنے والے مراکز وشخصیات پر علاقائی، گروہی اور طبقاتی رجحانات کا غلبہ فطری امر ہے اس لیے یہ خلا نہ صرف باقی چلا آ رہا ہے بلکہ فطری انداز میں نہ ہونے کی وجہ سے فکری خلفشار اور انتشار کی کیفیت نمایاں نظر آ رہی ہے اور اس وقت ہماری صورتحال یہ ہے کہ:

☆ ایک طرف عالم اسلام میں دینی بیداری کی تحریکات مدوجزر کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں اور وہ مسلم ممالک میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ اور عالمی سطح پر خلافت کے احیا کی خواہاں ہیں۔

☆ دوسری طرف مغرب کے سیکولر فلسفہ، نظام اور ثقافت کی مسلم ممالک میں ترویج ونفاذ کے لیے اقتصادی، سیاسی اور عسکری بالادستی کے ساتھ، نیز مسلمان کہلانے والی حکومتوں کے تعاون سے پیش رفت جاری ہے۔

☆ تیسری طرف کم وبیش تمام مسلم ممالک اقوام متحدہ کے ممبر کی حیثیت سے اور اس کے منشور وقوانین پر دستخط کرنے کے باعث قانونی اور اخلاقی طور پر آج کے عالمی نظام کا حصہ ہیں جس کا بڑا حصہ اپنے مقاصد واہداف اور قوانین وضوابط دونوں حوالوں سے اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔

☆ چوتھی جانب عالم اسلام میں دینی بیداری کے رجحانات، اسلامی تعلیمات کے مراکز،

قرآن وسنت کے ساتھ غیر مشروط اور بے لچک کمٹمنٹ کے جذبات اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے عالمی سطح پر احیا کے لیے اسلامی تحریکات کے عزائم مبینہ دہشت گردی کے خلاف اس عالمی جنگ کا براہ راست ہدف ہیں جس کی فوج کشی کا شکار اسی وجہ سے افغانستان بن چکا ہے اور مذکورہ بالا عزائم و جذبات رکھنے والی ہر تحریک اور ہر طبقہ اس جنگ کی ''ہٹ لسٹ'' میں شامل ہے۔

☆ ان کے علاوہ معروضی حقائق وحالات کا ایک پانچواں دائرہ یہ بھی ہے کہ عالم اسلام کے وسائل خود مسلمانوں کے کنٹرول میں نہیں ہیں، مسلم ممالک اقتصادی اور معاشی طور پر پر بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے تہہ در تہہ جال میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں، مسلم حکومتیں سیاسی، معاشی، عسکری اور انتظامی شعبوں میں کوئی بنیادی فیصلہ کرنے میں آزاد نہیں ہیں اور دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی بھی مسلم حکومت کے اختیارات و معاملات کے گرد ایک غیر مرئی ''ریڈ لائن'' موجود ہے جس کو کراس کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔

اس وسیع تناظر میں دہشت گردی کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ لینا یقیناً ایک اہم بات ہے اور اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس جزوی مسئلہ سے پہلے بہت سے اصولی معاملات اہل علم کی توجہات کے مستحق ہیں اور سب سے زیادہ اہمیت کا حامل یہ مسئلہ ہے کہ عالم اسلام کو اس مخمصہ سے نکالنے اور اس کی آزادی وخود مختاری بحال کرنے کے لیے ہمارے ارباب علم و دانش جہد وعمل کا کون سا خاکہ تجویز کرتے ہیں؟ اور وہ ملت اسلامیہ کو موجودہ صورتحال پر قناعت کرنے یا اس سے جان چھڑانے کے لیے کچھ کر گزرنے میں سے کون سا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں؟ پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دہشت گردی کی اسلامی حیثیت اور اس کے بارے میں شرعی احکام وقوانین کی وضاحت کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ اور اس کی اصل غرض کیا ہے؟ اگر تو اس کا مقصد عالم اسلام کی دینی تحریکات کی راہنمائی کرنا ہے اور ان کو یہ بتلانا ہے کہ ملت اسلامیہ کی خود مختاری کی بحالی، خلافت اسلامیہ کے احیا، عالم اسلام کے وسائل کی بازیابی اور مسلم اقوام وممالک کے گرد عالمی استعمار کے حصار کو توڑنے کے لیے ان کی جدوجہد کو ان شرعی حدود کا پابند رہنا چاہیے اور انہیں ارباب علم ودانش کی راہنمائی کے دائرے سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تو یہ

ایک مفید اور مثبت عمل ہے جس کی ضرورت مسلم ہے اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر اس سارے عمل کی غرض دہشت گردی کے حوالے سے عالمی استعمار کو مطمئن کرنا اور قاعدین و متخلفین کو ان کے قعود و تخلف کے لیے جواز اور اس کے دلائل فراہم کرنا ہے تو اس سے زیادہ قابل نفرین عمل کا موجودہ حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک عالم اسلام کی بعض عسکری تحریکات پر ''دہشت گردی'' کا لیبل چسپاں کرنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ایک اصولی بات ہر شخص کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ عمل کے احکام سے رد عمل کے احکام مختلف ہوتے ہیں اور کسی ایکشن پر جن قواعد وضوابط کا اطلاق ہوتا ہے، اس کے ری ایکشن پر انہی قواعد وضوابط کا کلیتاً اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اصول دنیا کے ہر قانونی نظام میں تسلیم شدہ ہے اور قرآن کریم نے بھی سورۃ النساء آیت ۱۴۸ میں اس اصول کو اس حوالے سے بیان فرمایا ہے کہ کسی شخص کا بری بات کو ظاہر کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے مگر مظلوم کو اجازت ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم وزیادتی کو روا رکھنے والے ظالم کی برائی کو ظاہر کرے۔ گویا جس بات کی ایکشن اور عمل میں شرعاً اجازت نہیں ہے، ری ایکشن اور ردعمل میں قرآن کریم اس کی اجازت دے رہا ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ کوئی مظلوم ردعمل میں کوئی ایسی بات کر گزرتا ہے جس کی عام حالات میں اجازت نہیں ہے تو اس کی مظلومیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس معاملے میں اس سے درگزر کر دینا ہی اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے۔

اس لیے واقعاتی پس منظر کی تفصیل میں جائے بغیر اصولی طور پر یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی جن تحریکات اور گروپوں کو ''دہشت گرد'' قرار دیا جا رہا ہے، ان کے بارے میں اس بات کا جائزہ لے لینا چاہیے کہ اگر وہ غلبہ اور اقتدار کے شوق میں ایسا کر رہے ہیں اور حکمرانی کی حرص نے انہیں ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا ہے تو ان کے ''دہشت گرد'' ہونے میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اگر انہیں کسی طرف سے ہونے والے مظالم اور جبر نے ردعمل کے طور پر اس راستے پر ڈالا ہے اور جبر و استبداد کے حصار کو توڑنے میں دیگر کسی متبادل حربہ اور کوشش میں کامیابی کا کوئی امکان نہ دیکھتے ہوئے ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق وہ ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئے ہیں تو انہیں اس رعایت سے محروم کر دینے کا کوئی جواز نہیں ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء کی آیت ۱۴۸ میں

مظلوموں کے لیے بیان فرمائی ہے۔

ان تمہیدی گزارشات کے بعد ہم ان سوالات کی طرف آتے ہیں جو مذکورہ بالا سوال نامہ میں اٹھائے گئے ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے دہشت گردی کی تعریف

ان میں سے پہلا سوال یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے دہشت گردی کی تعریف کیا ہے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ قرآن کریم نے سورۃ المائدہ کی آیت ۳۳ میں ’’محاربہ‘‘ کا جو حکم بیان فرمایا ہے، ہمیں اس پر غور کر لینا چاہیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو سزا کا مستحق بتایا ہے، ان کے دو وصف بیان فرمائے ہیں:

☆ ایک ”**یحاربون اللّٰہ ورسولہ**“ کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ لڑتے ہیں جس سے مراد ہمارے خیال میں یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے قائم کردہ نظام سے بغاوت کرتے ہیں۔

☆ دوسرا ”**ویسعون فی الارض فسادا**“ کہ وہ زمین میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں جس کا معنی آج کی معروف زبان میں یہ ہوگا کہ وہ امن عامہ کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کی روشنی میں ہمارے ناقص فہم کے مطابق جو لوگ کسی جائز اور قانونی سسٹم کے خلاف ناجائز طور پر بغاوت کرتے ہیں اور عام شہریوں کی جان و مال کے لیے بلاوجہ خطرہ بن جاتے ہیں، وہ ’’دہشت گرد‘‘ کہلائیں گے۔ کسی حکومت کے جائز اور قانونی ہونے کے لیے اس دور کے عرف کو دیکھا جائے گا کہ اس وقت بین الاقوامی تعامل اور عرف کی رو سے کون سی حکومت کو جائز اور قانونی سمجھا جاتا ہے جبکہ بغاوت کے جائز یا ناجائز ہونے میں بھی اسی بین الاقوامی عرف کا اعتبار ہوگا لیکن اس میں ایک بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ عرف اور تعامل اور چیز ہے اور کسی مخصوص مسئلہ پر عالمی برادری کا طرز عمل اس سے بالکل مختلف معاملہ ہے جس کا تجربہ ہمیں حال ہی میں افغانستان کے حوالے سے ہوا ہے کہ وہاں طالبان کی حکومت نے ملک کے ۹۰ فیصد علاقہ کا کنٹرول حاصل کر لیا تھا، دارالحکومت کابل بھی ان کے کنٹرول میں تھا اور ان کے زیر اثر علاقہ میں امن کا قیام اور ان

کے احکام کی عمل داری بھی تسلیم شدہ ہے۔ آج کے بین الاقوامی عرف میں کسی حکومت کو تسلیم کرنے کے لیے یہ باتیں کافی سمجھی جاتی ہیں بلکہ اس سے کم تر اہداف حاصل کرنے والی حکومتیں بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود عالمی برادری نے افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس پر فوج کشی کر کے اسے جبراً ختم کر دیا۔ اس لیے ہمیں حقیقی عرف وتعامل اور وقتی طرز عمل میں فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا اور اب تو یہ فرق اس قدر واضح ہو گیا ہے اور بڑھتا جا رہا ہے کہ بین الاقوامی قوانین وضوابط، اخلاقیات اور عالمی سیاسیات کی بیشتر اقدار وروایات کا مفہوم ومعیار تک بدل کر رہ گیا ہے۔

ریاستی ظلم وجبر

> دوسرا سوال اس حوالے سے ہے کہ کوئی حکومت اپنے ملک کے کسی طبقہ کے ساتھ انصاف نہیں کرتی اور ان کے سیاسی حقوق اور جان و مال تک کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے تو کیا اس حکومت کے ایسے طرز عمل کو بھی ''دہشت گردی'' قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کے جواب میں گزارش ہے کہ کوئی حکومت اپنی رعیت کے کسی طبقے کو اس کے جائز حقوق سے محروم رکھتی ہے اور اس محروم رکھنے میں ریاستی جبر کا ایسا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے جس سے اس طبقہ کے وجود اور اس کے افراد کی جان و مال کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں تو یہ بات یقیناً ''ریاستی دہشت گردی'' کہلائے گی۔

مظلوم رعایا کی جدوجہد

> تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر کسی گروہ یا طبقہ کے ساتھ نا انصافی روا رکھی جاتی ہو تو اس پر احتجاج اور رد عمل کی کیا حیثیت ہے؟ اور کیا مظلوم کا ظالم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا بھی ''دہشت گردی'' کہلائے گا؟

اس سلسلے میں گزارش ہے کہ مظلوم کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا دنیا کے ہر قانون میں حق حاصل ہے اور اسلام بھی اسے یہ حق دیتا ہے۔ اب اس حق کی درجہ بندی کہ یہ جائز ہے یا واجب، اس کا انحصار اس وقت کے حالات پر اور مظلوم کی صواب دید پر ہے۔ اسلام نے اس میں دو درجے

رکھے ہیں: عزیمت اور رخصت۔ اگر وہ عزیمت پر عمل کرتا ہے اور اپنے حق کے لیے ظالم کے خلاف جدوجہد کرتا ہے تو اسے اس کا حق حاصل ہے اور اگر صبر وتحمل کے ساتھ رخصت کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے اس کا جواز بھی ہے چنانچہ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص اپنی جان کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی عزت کی حفاظت میں مارا گیا، وہ بھی شہید ہے۔ اس ارشاد نبویؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ رخصت پر عمل کی اجازت ہے، لیکن ترجیح بہر حال عزیمت ہی کو حاصل ہے۔

باقی رہی بات ہتھیار اٹھانے کی تو فقہائے کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ شخصی اور انفرادی معاملات میں تو قانون کو ہاتھ میں لینے اور ہتھیار اٹھانے کی شرعاً اجازت نہیں ہے اور ایسا کرنا بغاوت کے زمرے میں آئے گا البتہ اجتماعی معاملات میں

(۱) مسلم حکمران کی طرف سے کفر بواح کے ارتکاب، اور

(۲) مسلم اکثریت پر غیر مسلم اقلیت کا جبری اقتدار قائم ہو جانے

کی صورت میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت ہے جو بسا اوقات فرض کا درجہ بھی اختیار کر جاتا ہے جیسا کہ دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہو جانے کے بعد حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اور دیگر اکابر علماء کرام نے جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا۔

حملہ آور قوت کے خلاف اپنی آزادی اور خودمختاری کے لیے ہتھیار اٹھانے کے حق کو دنیا کے ہر قانون میں تسلیم کیا جاتا ہے اور اسے حریت اور آزادی کی جنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسے ''دہشت گردی'' قرار دینا ایسا ہے جیسے یہ کہہ دیا جائے کہ برطانوی استعمار سے آزادی کے لیے جن امریکی حریت پسندوں نے ہتھیار اٹھائے تھے اور اس جنگ میں انہوں نے متعلقہ اور غیر متعلقہ ہزاروں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، وہ حریت پسند نہیں بلکہ ''دہشت گرد'' تھے اور اسی طرح دنیا بھر کی وہ تمام اقوام وممالک دہشت گرد قرار پائیں گے جنہوں نے غیر ملکی قابضین اور نوآبادیاتی حکمرانوں کے خلاف جنگ لڑ کر آزادی حاصل کی ہے۔

غیر متعلقہ لوگوں پر ظلم

چوتھا سوال یہ ہے کہ اگر کسی طبقہ کے کچھ افراد نے ظلم

کیا ہے تو کیا مظلوموں کو یہ حق حاصل ہے کہ اس طبقے کے دوسرے افراد کو انتقام کا نشانہ بنائیں جو اس عمل میں شریک نہیں تھے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ جہاں تک غیر متعلقہ لوگوں کو انتقام کا نشانہ بنانے کا تعلق ہے، اسلام اس کی کسی صورت میں اجازت نہیں دیتا۔ یہ بھی اسی طرح کا ظلم ہوگا جس کا وہ مظلوم خود نشانہ بن چکے ہیں۔ البتہ ظالموں کے خلاف کارروائی کے دوران کچھ لوگ ناگزیر طور پر زد میں آتے ہوں تو ان کا معاملہ مختلف ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے جہاد میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور غیر متعلقہ افراد کو قتل کرنے سے صراحتاً منع کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مسلم شریف کتاب الجہاد میں حضرت صعب بن جثامہؓ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ہم ایک جگہ شب خون مارنا چاہتے ہیں مگر وہاں عورتیں اور بچے بھی ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ ”ھم منھم“ وہ انہی میں سے ہیں۔ یعنی اگر وہ شب خون (چھاپہ مار کارروائی) کی زد میں ناگزیر طور پر آتے ہیں تو وہ انہی میں شمار ہوں گے اور ان کی وجہ سے کارروائی روکی نہیں جائے گی۔

غیر مسلموں کی شہری آزادی

پانچواں سوال یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں جو غیر مسلم شہری آباد ہیں، ان کو اپنے مذہبی معاملات یعنی عقیدہ، عبادت، شخصی قوانین وغیرہ میں کس حد تک آزادی حاصل ہے؟

اس کے جواب میں ہمارا طالب علمانہ نقطہ نظر یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں کوئی مسلم حکومت ایسی نہیں ہے جس پر خالص اسلامی حکومت کا اطلاق کیا جا سکے یا جسے خلافت کا قائم مقام قرار دیا جائے اور اس کے دائرے میں رہنے والے غیر مسلموں کو ذمیوں کا درجہ دینا شرعاً ضروری ہو جبکہ کم و بیش تمام مسلم ممالک اقوام متحدہ کے منشور پر دستخط کرنے کے علاوہ اس حوالے سے دیگر بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی بھی قبول کر چکے ہیں اس لیے جب تک خلافت کا احیا نہیں ہوتا اور خالصتاً اسلامی شرعی حکومت قائم نہیں ہو جاتی، ہم ”میثاق مدینہ“ کی طرز پر بین الاقوامی معاہدات کے پابند ہیں اور ہمیں ان پر عمل درآمد کرنا چاہیے الا یہ کہ ان میں سے کوئی بات کسی مسلمان ملک کی خودمختاری و سلامتی اور مسلمانوں کے ملی مفاد کے لیے صریحاً خطرے کا باعث ہو تو اس میں وہ ملک ضروری

تحفظات اختیار کر سکتا ہے۔

انسدادِ دہشت گردی کے لیے اسلامی ہدایات

چھٹا سوال یہ ہے کہ دہشت گردی کے ہر جگہ کچھ نہ کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ اسلام ان اسباب کے تدارک کے لیے کیا ہدایات دیتا ہے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ دہشت گردی فی الواقع بہت بڑا جرم ہے۔ اسلام تو عام معاشرتی جرائم میں بھی مجرم کے لیے سخت سزائیں تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ جرم کے اسباب وعوامل کے تدارک کا حکم دیتا ہے اور ان دواعی کا راستہ روکتا ہے جو کسی شخص کو جرم تک لے جاتے ہیں۔ اسلام کا یہی اصول دہشت گردی کے بارے میں بھی ہے۔ اس پس منظر میں ہمارے نزدیک دہشت گردی کے حوالے سے دو محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک محاذ یہ ہے کہ جو عالمی قوتیں ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا عنوان اختیار کر کے دنیا بھر کی دینی تحریکات کو ٹارگٹ بنائے ہوئے ہیں، انہیں اس بات کا احساس دلایا جائے کہ جس کو تم دہشت گردی قرار دے رہے ہو، یہ دراصل ردعمل ہے ان مظالم اور جبر و ناانصافی کا جو ان اقوام وممالک اور طبقات پر مسلسل روا رکھے جا رہے ہیں اور اس ردعمل کو جبر اور تشدد کے ذریعے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ اس قسم کی صورتحال میں جبر وتشدد سے مزید منافرت بڑھتی ہے اور جذبات میں شدت پیدا ہوتی ہے اس لیے اگر تم دہشت گردی کو ختم کرنے میں سنجیدہ اور مخلص ہو تو تمہیں جبر وتشدد اور عسکری جنگ کا راستہ ترک کر کے مفاہمت اور مذاکرات کا راستہ اپنانا ہوگا۔ ظالم اور مظلوم کے فرق کو محسوس کرو، مظلوم کی مظلومیت کو تسلیم کرو، ظالم کو ظالم قرار دو اور مسلمہ اصولوں کی روشنی میں مظلوم اقوام وطبقات کو ظلم واستحصال سے نجات دلانے کے لیے سنجیدہ پیش قدمی کرو ورنہ تمہاری یہ جنگ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے نہیں بلکہ اس کے فروغ کے لیے متصور ہوگی اور دہشت گردی کا جواب اس سے بڑی دہشت گردی کے ذریعہ دے کر تم خود سب سے بڑے دہشت گرد قرار پاؤ گے۔

دوسری طرف عالم اسلام کی ان عسکری تحریکات سے بھی گفتگو کی ضرورت ہے جو مختلف محاذوں پر مصروف کار ہیں اور جنہیں دہشت گرد قرار دے کر ان کو کچلنے کا عمل مسلسل جاری ہے۔ ان تحریکات

کی قیادتوں کو دو باتیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ہر مسئلے کا حل ہتھیار نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر جگہ ہتھیار اٹھانا ضروری ہے۔ جہاں کسی مسئلہ کے حل کا کوئی متبادل راستہ موجود ہے، اگرچہ وہ لمبا اور صبر آزما ہی کیوں نہ ہو، وہاں ہتھیار سے کام لینا ضروری نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں شاید شرعاً جائز بھی نہ ہو۔ ہتھیار تو آخری حربہ ہے۔ جہاں اور کوئی ذریعہ کام نہ دیتا ہو اور کسی جگہ مسلمانوں کا وجود اور دینی تشخص حقیقی خطرات سے دوچار ہو گیا ہو تو آخری اور اضطراری حالت میں ہتھیار اٹھانے کی گنجائش نکل سکتی ہے اس لیے اضطرار بلکہ ناگزیر اضطرار کے بغیر ہتھیار کو ہاتھ میں نہ لیا جائے۔

دوسری بات ان سے یہ عرض کرنے کی ہے کہ آزادی، قومی تشخص اور خود مختاری کے لیے اضطرار کی حالت میں قومیں ہتھیار اٹھایا کرتی ہیں۔ یہ زندہ قوموں کا شعار ہے اور آزادی کی عسکری تحریکات سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے لیکن غیر متعلقہ لوگوں کو نشانہ بنانا اور بے گناہ لوگوں کا خون بہانا نہ شرعاً جائز ہے اور نہ ہی دنیا کا کوئی اور قانون و ضابطہ اس کی اجازت دیتا ہے۔ ان تحریکات کو اس حوالے سے شرعی احکام و قوانین کی پابندی کا ایک بار پھر عہد کرنا چاہیے اور شرعی احکام بھی وہ نہیں جو خود ان کے ذہن میں آ جائیں بلکہ وہ قوانین و ضوابط جو امت کے اجماعی تعامل و توارث کے ساتھ تسلیم شدہ چلے آ رہے ہیں اور جنہیں وقت کے اکابر علماء و فقہاء کی طرف سے ضروری قرار دیا جا رہا ہو۔ اس کے بغیر کوئی بھی تحریک اور جدوجہد تمام تر خلوص و جذبہ اور ایثار و قربانی کے باوجود خلفشار پیدا کرنے کا باعث بنے گی اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی ہوگی اس لیے ایسی تحریکات کو کسی بھی ایسی بات سے قطعی طور پر گریز کرنا چاہیے جو:

- ☆ معروف اور مسلمہ شرعی اصولوں کے مطابق نہ ہو۔
- ☆ جس سے مسلمانوں کی مشکلات میں بلاوجہ اضافہ ہوتا ہو۔
- ☆ جو اسلام کے لیے بدنامی کا باعث بن سکتی ہو۔
- ☆ اور جس سے خود ان تحریکات کی قوت کار اور دائرہ عمل متاثر ہوتا ہو۔

جان و مال و آبرو کے تحفظ کی شرعی حیثیت

ساتواں سوال یہ ہے کہ کسی گروہ یا فرد کی جان و مال

اور عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے تو اس کے دفاع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ دفاع واجب ہے یا مستحب؟

اس سلسلے میں اصولی طور پر یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے جب اپنی جان، مال، اور آبرو کی حفاظت میں مارے جانے والے مسلمان کو شہید قرار دیا ہے تو ان تینوں حوالوں سے دفاع کا حق اور اس کی فضیلت میں کسی کلام کی گنجائش نہیں رہ جاتی البتہ ایک اور بات عرض کرنا بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ جان بچانے کو فقہاء کرام نے فرض قرار دیا ہے اور جہاں جان کے تحفظ کا مسئلہ آ جائے، وہاں اضطرار کی حالت میں خنزیر کا گوشت بقدر ضرورت کھانے کو بھی بعض فقہاء نے فرض بتایا ہے تو اس اصول کی رو سے کسی فرد یا گروہ کے لیے یہ بات بھی فرض ہی کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اگر اسے اپنے وجود اور جان کا خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ اسے بچانے کے لیے جو صورت دفاع کی ناگزیر ہو، وہ اسے اختیار کرے اور اس دفاع کی حد بھی وہی ہے جو حالت اضطرار کی دیگر صورتوں میں ہے کہ جتنی کارروائی سے جان بچ سکتی ہو، اسی حد تک اجازت ہے، اس سے زیادہ کی نہیں۔

متحدہ مجلس عمل کی الیکشن ۲۰۰۲ء میں کامیابی

(ماہنامہ یوتھ کانٹیکٹ، گوجرانوالہ۔ دسمبر ۲۰۰۲ء)

(ماہنامہ ’’یوتھ کانٹیکٹ‘‘ گوجرانوالہ کے دسمبر ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ایک انٹرویو کا دستیاب حصہ۔)

آپ کے تاثرات؟

سوال: پاکستان کے حالیہ عام انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی کامیابی کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب: متحدہ مجلس عمل کو میرے خیال میں دو وجہ سے عوام میں پذیرائی ملی۔ ایک ان کے اتحاد کی وجہ سے کہ پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ گواہ ہے کہ دینی حلقوں اور مذہبی مکاتب فکر نے جب بھی متحد ہو کر کسی ملی کاز کے لیے قوم کو آواز دی ہے قوم نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گزشتہ سال امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کو ختم کرنے اور اپنی کٹھ پتلی حکومت مسلط کرنے کے لیے جو قیامت ڈھائی ہے اور افغانستانی عوام کو جس شرمناک طریقے سے درندگی اور دہشت گردی کا نشانہ بنایا ہے، پاکستان بالخصوص صوبہ سرحد اور بلوچستان کے عوام نے الیکشن میں اس کے خلاف اپنی نفرت اور غصے کا بھرپور اظہار کر دیا ہے، اور اس کے ساتھ ان عناصر کے اس منفی پراپیگنڈے کا عملی جواب بھی دیا جو اَب تک یہ کہتے آرہے تھے کہ پاکستان میں دینی جماعتوں کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں اس سے امریکہ اور اس کے سارے حواریوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے اور نوشتہ دیوار پڑھتے ہوئے اپنی پالیسیوں اور طرزِ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔

قومی سیاست کے حوالے سے توقعات

سوال: متحدہ مجلس عمل سے آپ قومی سیاست کے

حوالے سے کیا توقعات رکھتے ہیں؟

جواب: میرے خیال میں متحدہ مجلس عمل کو مرکز میں اقتدار کی کشمکش میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا اور ۱۹۷۳ء کے آئین کے دستور کی بنیادوں کے تحفظ پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھنی چاہیے تھی۔ اس وقت ملک میں حقیقی جمہوریت اور ۱۹۷۳ء کے دستور کی بنیادوں کے تحفظ کے لیے سب سے نمایاں اور مضبوط آواز متحدہ مجلس عمل کی ہے، اس آواز کے ساتھ اقتدار اور وزارتوں کی خواہش کی آمیزش نہ ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ بہر حال پھر بھی غنیمت ہے کہ متحدہ مجلس عمل نے اصولوں پر کسی قسم کی سودے بازی نہ کرنے کا اعلان کیا ہے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ متحدہ مجلس عمل کو اس اصولی موقف پر استقامت اور اس میں سرخروئی سے نوازیں۔ البتہ اس سلسلہ میں ہماری رائے یہ ہے کہ:

(۱) وہ مرکز میں اقتدار کے کھیل سے کنارہ کش رہے اور اپوزیشن میں بیٹھ کر عوام کے جذبات کی ترجمانی کرے۔

(۲) صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت عوامی مسائل کے حل کے ساتھ اسلامی طرز حکومت کا ایسا نمونہ عملاً پیش کرے جو دوسرے صوبوں کے لیے مشعل راہ ہو، اور اگلے الیکشن میں دوسرے صوبوں کے عوام بھی متحدہ مجلس عمل کو موقع دینے پر مجبور ہو جائیں۔

(۳) متحدہ مجلس عمل کو یہ ووٹ افغانستان کے مظلوم عوام کے خون کی برکت سے ملے ہیں اور عالمی استعمار کی ڈٹ کر مخالفت کرنے کی وجہ سے ملے ہیں، اس حوالے سے مجلس عمل کے موقف اور عملی کردار میں کسی قسم کی کوئی لچک نہیں ہونی چاہیے۔

(۴) دینی مکاتب فکر کے اتحاد کو ہر قیمت پر قائم رکھا جائے، باہمی ایثار و اعتماد کے ساتھ اس کے دائرہ کار میں وسعت پیدا کی جائے، اور اس بات سے ہر وقت چوکنا رہا جائے کہ مخالفین کی طرف سے سب سے زیادہ کوشش یہی ہوگی کہ اس وحدت اور باہمی اعتماد میں کسی نہ کسی طرح دراڑیں ڈال دی جائیں۔

(۵) صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت ایک علمی کمیشن قائم کرے جو اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے ان میں سے صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی سفارشات کو الگ کرے اور ان کے عملی نفاذ کے لیے طریق کار تجویز کرے۔

(٦) متحدہ مجلس عمل کے وزراء پروٹوکول اور پرسٹیج کے چکروں سے خود کو الگ تھلگ رکھتے ہوئے سادگی، قناعت، اور کفایت شعاری کا نمونہ پیش کریں، اور اپنے عمل کے ساتھ واضح کریں کہ ایک اسلامی حکومت کے وزراء کس طرح کام کرتے ہیں۔

صدر پرویز مشرف کے دس سوالات کا جائزہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد)

صدر محترم کے خطاب کے حوالے سے پہلے مرحلہ میں ان کے ان دس سوالات پر ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے خطاب کے دوران ''انتہا پسندوں'' سے کیے ہیں اور ایک قومی روزنامہ نے انہیں ''صدر پرویز کے انتہا پسندوں سے دس سوالات'' کے عنوان سے ترتیب وار شائع کیا ہے۔

افغانستان کی جنگوں میں پاکستانیوں کی شرکت

پہلا سوال یہ ہے کہ ''ہزاروں پاکستانیوں کو گمراہ کرکے افغانستان میں مروانے کا ذمہ دار کون ہے؟''

ہمیں صدر محترم کی اس بات سے اتفاق ہے کہ افغانستان کی سرزمین پر ہزاروں پاکستانی جاں بحق ہوئے ہیں البتہ اس عمل کا دورانیہ ہمارے نزدیک گزشتہ پندرہ سال پر محیط ہے۔ پاکستانیوں کو صدر پرویز مشرف کے بقول ''گمراہ کرکے'' افغانستان لے جانے اور وہاں مروا دینے کا عمل گزشتہ پندرہ سال سے جاری ہے۔ یہ عمل اس وقت شروع ہوا تھا جب افغانستان میں سوویت یونین نے فوجیں اتاری تھیں اور افغان علماء اور عوام نے روسی افواج کی آمد کو اپنے ملک کی آزادی اور قومی خودمختاری کے خلاف حملہ تصور کرتے ہوئے مزاحمت شروع کی تھی اور جہاد کا فتویٰ دے کر گوریلا کارروائیوں کا آغاز کر دیا تھا، اس وقت پاکستان کے دینی حلقوں نے اس جدوجہد میں افغان عوام کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور ہزاروں پاکستانی وہاں جا کر اس عسکری مزاحمت میں شریک ہوتے تھے جن میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں نے جام شہادت بھی نوش کیا تھا۔ اس وقت پاکستان کی حکومت، فوج اور امریکہ سمیت تمام مغربی ممالک پاکستانیوں کے افغانستان جا کر روس کے خلاف لڑنے کو ''گمراہ کر کے افغانستان میں مروانے'' کا عمل نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے ''جہاد'' کہا جاتا تھا۔ امریکہ

اسے سپورٹ کرتا تھا، دنیا بھر کی مسلمان حکومتیں اس کی حمایت کرتیں تھیں، پاک فوج اور آئی ایس آئی اس جہاد کی پشت پر تھیں اور روسی فوجوں کے خلاف افغان عوام کی اس عسکری جدوجہد میں ’’دہشت گردی‘‘ کے جراثیم کا کوئی سراغ نہیں پایا جاتا تھا۔

اس لیے جولوگ پاکستانیوں کو افغانستان لے جا کر روس کے خلاف مرواتے تھے وہ امریکہ کے خلاف جنگ میں پاکستانیوں کو وہاں لے جانے کو بھی جہاد سمجھتے رہے، انہیں استعماری مقاصد کے حوالہ سے روس اور امریکہ میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیا اور وہ اپنی اسی پالیسی کے تسلسل پر قائم رہے۔ وہ دراصل یہ فرق نہیں سمجھ پائے کہ روس کے خلاف لڑنا ’’جہاد‘‘ اور اس میں مرنا ’’شہادت‘‘ ہے جبکہ امریکہ کے خلاف لڑنا ’’دہشت گردی‘‘ اور اس میں جان دینا ’’مروا دینا‘‘ ہوتا ہے۔ اس لیے صدر کو اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ان عوامل کو تلاش کرنا چاہیے جو پاکستان کے دینی حلقوں کا صدر پرویز مشرف کے بقول انتہا پسندوں کے لیے اس جہاد اور دہشت گردی کے درمیان فرق کا صحیح ادراک کرنے میں رکاوٹ بنے ہیں۔

پاکستان بطور ایک نظریاتی ریاست

> جنرل پرویز مشرف کا دوسرا سوال ہے کہ ’’کیا پاکستان کو نظریاتی اسٹیٹ بنانا چاہیے؟‘‘

صدر محترم سے گزارش ہے کہ ’’بنانا چاہیے‘‘ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور اس کا مطلب ہم یہ سمجھے ہیں کہ شاید صدر پرویز مشرف پاکستان کے بارے میں از سرِ نو فیصلہ کرنے جا رہے ہیں کہ اسے نظریاتی ریاست ہونا چاہیے یا سیکولر اسٹیٹ بنا دینا چاہیے؟ حالانکہ یہ فیصلہ پاکستان بننے سے پہلے ہو چکا تھا اور فیصلہ کرنے والے خود قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے جنہوں نے اس خطہ کے کروڑوں مسلمانوں کی حمایت سے اعلان کیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگا اور اس کا دستور قرآن وسنت کے مطابق ہوگا۔ پھر پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے ’’قرارداد مقاصد‘‘ کی صورت میں پاکستان کی نظریاتی حیثیت کا واضح طور پر تعین کر دیا تھا، اس کے بعد اس مسئلہ کو ’’ری اوپن‘‘ کرنا پاکستان کے قیام کے نظریاتی اور اخلاقی جواز کو چیلنج کرنا ہے اور قیام پاکستان کو جائز، اصولی اور منطقی سمجھنے والے کسی شخص سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

مذہبی تعلیم اور حکومتی نظام

جنرل پرویز مشرف نے تیسرا سوال یہ کیا ہے کہ ’’کیا مذہبی تعلیم حکومت چلانے کے لیے کافی ہے؟‘‘

جناب صدر کی خدمت میں عرض ہے کہ اس بات کا آج تک کسی نے بھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی کوئی عقل ودانش سے بہرور شخص ایسا کرسکتا ہے، اس سلسلہ میں صدر صاحب نے دینی مدارس سے جو شکایات کی ہیں وہ بھی اسی نوعیت کی ہیں اور بے محل ہیں کیونکہ دینی مدارس تو صرف مساجد و مدارس کے لیے امام، قاری اور استاذ مہیا کرنے کی ذمہ داری نبھا رہے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ وہ اس شعبہ میں رجال کار فراہم کرنے کا کام صحیح طریقہ سے جاری رکھ سکیں۔ مگر صدر صاحب کا اصرار ہے کہ ایک مسجد میں امام بننے کے لیے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ امام مسجد کو سائنس دان اور انجینئر بھی ہونا چاہیے اور کسی مدرسہ میں قرآن پاک پڑھانے والے کو قاری کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بھی بننا چاہیے۔ ورنہ اگر اسی سوال کو اصل تناظر میں دیکھا جائے تو وہ اس طرح بنتا ہے کہ جو کچھ ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا جا رہا ہے کیا یہ تعلیم ایک اسلامی فلاحی ریاست کا نظام چلانے کے لیے کافی ہے؟

پاکستان بطور ایک ترقی پسند رفاہی ریاست

صدر محترم کا چوتھا سوال ہے کہ ’’کیا آپ پاکستان کو ترقی پسند اسلامک ویلفیئر اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں؟‘‘

جناب صدر! ہم بلاشبہ پاکستان کو ترقی پسند اسلامک ویلفیئر اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے پورے شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور مغربی حکومتوں کی پالیسیوں کی تابعداری کر کے کبھی ترقی پسند اسلامک ویلفیئر اسٹیٹ نہیں بن سکتا، اس کے لیے خلفاء راشدینؓ کے طرز حکومت اور نظام حکومت کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ اور صدر پرویز مشرف اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں جس روز انہوں نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نظام حکومت اور ریاستی ڈھانچے کو پاکستان میں عملی طور پر اپنانے کا فیصلہ کیا امریکی بمبار طیاروں کا رخ ان کی طرف بھی اسی طرح ہو جائے گا جس طرح اسی ’’جرم‘‘ میں ملا محمد عمر کو امریکی بمباری کا نشانہ بننا پڑا

ہے۔

انتہا پسند اور افغانستان کی تعمیر نو

> صدر محترم کا پانچواں اور چھٹا سوال یہ ہے کہ ’’کیا مذہبی انتہا پسندوں نے افغانستان کی بھلائی کا سوچا ہے؟ کیا پیسے جمع کر کے افغانستان کی تعمیر نو کا سوچا ہے؟‘‘

میرے خیال میں صدر محترم کو حقائق سے اس حد تک چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے ورنہ دیگر سینکڑوں اداروں اور ہزاروں اصحاب خیر کے علاوہ ’’امہ تعمیر نو‘‘ اور ’’الرشید ٹرسٹ‘‘ نے افغانستان کے مفلوک الحال عوام کی امداد اور افغانستان کی تعمیر نو کے لیے جو مسلسل خدمات سرانجام دی ہیں ان سے صدر پرویز یقیناً بے خبر نہیں ہوں گے، لیکن چونکہ امریکہ بہادر نے ان رفاہی اور تعمیری اداروں کو بھی دہشت گرد قرار دے دیا ہے اس لیے ہمارے صدر محترم کو ان کی خدمات ہی سرے سے دکھائی نہیں دے رہیں۔

اسلام نفرتیں سکھاتا ہے؟

> صدر محترم کا ساتواں سوال ہے کہ ’’کیا اسلام توڑ پھوڑ، نفرتیں پھیلانے کا کام سکھاتا ہے؟‘‘

یقیناً اسلام توڑ پھوڑ اور نفرتوں کا سبق نہیں دیتا اور اگر کہیں اسلام کے حوالہ سے ایسا ہو رہا ہے تو وہ بلاشبہ غلط ہے، لیکن پاکستان میں قومیتوں اور زبانوں کے عنوان سے جو نفرتیں موجود ہیں اور ان کے لیے جو قتل وقتال سالہا سال سے جاری ہے انہیں صدر پرویز مشرف کس کھاتے میں ڈالیں گے اور ان کے بارے میں کچھ کہنا انہوں نے کیوں ضروری نہیں سمجھا؟

تبلیغِ اسلام بذریعہ کردار

> صدر محترم کا آٹھواں اور نواں سوال یہ ہے کہ ’’کیا ہم حضورؐ کی مثال بھول گئے ہیں انہوں نے اپنی مثال سے اسلام پھیلایا تھا اور کیا بزرگان دین نے جبر سے اسلام پھیلایا تھا؟‘‘

بالکل درست ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین نے دین پھیلانے اور اسلام کی دعوت دینے میں کبھی جبر سے کام نہیں لیا اور نہ اس کی اجازت دی ہے، بلکہ اخلاقی برتری اور اصلاحی عمل کے ذریعے اسلام کی دعوت کو عام کیا ہے، لیکن اگر کسی مقام پر کفر وظلم کے کسی گروہ نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی ہے تو وہاں جناب نبی اکرمؐ صرف اخلاق کے ساتھ کافروں کے سامنے نہیں آئے بلکہ تلوار ہاتھ میں لے کر ان کا مقابلہ کیا ہے اور کافر دشمن کے ساتھ رسول اللہؐ اور بزرگان دین نے کبھی نرمی کا معاملہ نہیں فرمایا۔

جہالت، پسماندگی اور بھوک کے خلاف جہاد

> صدر محترم کا آخری اور دسواں سوال یہ ہے کہ ”کیا جہالت، پسماندگی اور بھوک کے خلاف جہاد کا سوچا ہے؟“

صدر جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ وہ خود اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دینی مدارس کسی قسم کی سرکاری امداد کے بغیر لاکھوں نادار بچوں کو خوراک اور ہاسٹل کی بلا معاوضہ سہولتیں فراہم کر رہے ہیں اور انہیں مفت تعلیم بھی دے رہے ہیں، اور خود صدر کے بقول یہ کام کوئی بڑی سے بڑی این جی اوز بھی نہیں کر سکتی، تو محدود ترین وسائل رکھنے والے دینی مدارس سے وہ بھوک اور جہالت کے خلاف اس کے علاوہ اور کون سے جہاد کی توقع کر رہے ہیں؟

جدید معاشرے میں مذہبی طبقات کا کردار

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جولائی ۲۰۰۴ء)

(ہمدرد یونیورسٹی دہلی کے شعبہ اسلامیات کے رکن ڈاکٹر یوگندر سکند کی طرف سے ارسال کردہ سوالنامہ کے جوابات)

ولادت و تعلیم

سوال: آپ اپنے خاندانی پس منظر اور تعلیمی قابلیت کے بارے میں ضروری معلومات سے آگاہ کرنا پسند کریں گے؟

جواب: میری ولادت ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو گکھڑ ضلع گوجرانوالہ میں ہوئی۔ میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں، کم و بیش ساٹھ سال تک تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے شیخ الحدیث رہے ہیں، دیوبندی مسلک کے علمی ترجمان سمجھے جاتے ہیں اور کم و بیش پچاس کے لگ بھگ کتابوں کے مصنف ہیں۔ بحمد اللہ حیات ہیں اور اس وقت ان کی عمر ہجری اعتبار سے ۹۳ برس ہے۔

میں نے ابتدائی تعلیم حفظ قرآن کریم اور صرف و نحو گھر میں والد محترم اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں درس نظامی کی تعلیم پائی۔ ۱۹۶۹ء میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ تب سے مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں خطابت کے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ تدریس کا شغل بھی مسلسل جاری ہے۔ پہلے مدرسہ انوار العلوم مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں تدریسی خدمات سرانجام دیتا رہا ہوں اور چند برسوں سے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں صدر مدرس اور ناظم تعلیمات کی ذمہ داریاں میرے سپرد ہیں۔

دینی وسیاسی ومعاشرتی مصروفیات

سوال: اپنے دینی کام اور معاشرتی مصروفیات، خاص طور پر اپنے تعلیمی ادارے اور جریدے کے حوالے سے کچھ تفصیل بتائیں۔

جواب: سیاسی طور پر جمعیت علماء اسلام پاکستان سے وابستہ ہوں۔ کم وبیش پچیس برس تک صوبائی اور مرکزی سطح پر مختلف عہدوں پر متحرک کردار ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمود کے رفیق کار اور اسسٹنٹ کے طور پر سالہا سال خدمات سرانجام دینے کا موقع ملا ہے۔ اب ایک عام رکن کے طور پر جمعیت علماء اسلام کے ساتھ شریک ہوں جبکہ انتخابی سیاست سے ہٹ کر فکری اور علمی حوالہ سے اسلامائزیشن کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل کے طور پر کام کر رہا ہوں جس کے امیر مولانا فداء الرحمٰن درخواستی آف کراچی ہیں۔ ۱۹۸۹ء سے ماہنامہ ''الشریعہ'' میری ادارت میں شائع ہو رہا ہے جو اسلام اور ملت اسلامیہ کو درپیش معروضی مسائل کے حوالے سے اپنی بساط کے مطابق خدمت کر رہا ہے۔ میرے بڑے فرزند حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ، جو مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے فاضل اور اب اس میں مدرس ہیں اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انگلش ہیں، اس میں میرے معاون ہیں۔ گوجرانوالہ میں الشریعہ اکادمی کے نام سے ایک الگ تعلیمی ادارہ ہم نے قائم کر رکھا ہے جس میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کے امتزاج کا تجربہ کر رہے ہیں اور اس میں مختلف کورسز ہر سال ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ روزنامہ پاکستان لاہور میں ''نوائے قلم'' کے عنوان سے اور روزنامہ اسلام لاہور میں ''نوائے حق'' کے نام سے ہفتہ وار کالم لکھتا ہوں جو حالات حاضرہ کے حوالے سے ہوتے ہیں۔

دینی مدارس کا نظامِ تعلیم

سوال: پاکستانی مدارس کے نظام تعلیم کی اصلاح کے بارے میں خود علما کے حلقے میں داخلی طور پر بھی ایک آواز موجود ہے اور پاکستانی حکومت کے علاوہ مغربی حکومتوں بالخصوص امریکہ کی طرف سے بھی اس قسم کے مطالبات سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: پاکستان کے دینی مدارس کے نظام ونصاب میں اصلاح کے حوالہ سے ہم ایک عرصہ سے خود سرگرم عمل ہیں اور اس سلسلہ میں میرے بیسیوں مضامین مختلف جرائد واخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس حوالہ سے ہمارا اصولی موقف یہ ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ ڈھانچے اور نیٹ ورک کو قائم رہنا چاہیے اور ان کی آزادی وخود مختاری کا تحفظ ہونا چاہیے۔ البتہ دینی مدارس کو عصری تقاضوں کے پیش نظر اپنے نصاب اور تعلیمی طریق کار میں ایسی تبدیلیاں لانی چاہئیں کہ ان کے فضلا آج کے گلوبل ماحول میں وقت کے حالات، ضروریات، تقاضوں اور چیلنجز کو سمجھتے ہوئے آج کی زبان اور اسلوب میں دین کی نمائندگی کر سکیں۔

سوال: موجودہ دینی تعلیمی نظام کی خوبیوں اور خامیوں پر آپ کیا تبصرہ کریں گے؟

جواب: موجودہ دینی تعلیمی نظام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ طالب علم ذہنی، فکری، تہذیبی اور اعتقادی طور پر اپنے ماضی اور اسلاف سے وابستہ رہتا ہے مگر سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ آج کے حالات، تقاضوں اور مستقبل کی ضروریات کے ادراک سے محروم ہو جاتا ہے۔

سوال: کیا آپ کو بھارت کے دینی مدارس کے کچھ ایسے مثبت پہلو دکھائی دیتے ہیں جن کی پیروی پاکستانی دینی مدارس کو بھی کرنی چاہیے؟

جواب: ہمارے خیال میں پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے دینی مدارس کا ماحول، اہداف، طریق کار اور اسلوب کم وبیش یکساں ہے اور تمام خوبیوں اور خامیوں میں وہ برابر کے شریک ہیں۔ البتہ بھارت میں ندوۃ العلماء کی طرز پر جو کام ہو رہا ہے، پاکستان میں وہ کام اس سطح پر نہیں ہو رہا۔ اس کی اپنی افادیت اور ضرورت ہے اور پاکستان میں بھی اس طرز کے ادارے قائم ہونے چاہئیں۔ خود ہم نے اب سے دس بارہ برس قبل گوجرانوالہ میں شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کے نام سے جو پروجیکٹ شروع کیا تھا، اس میں ہمارے پیش نظر ندوۃ العلماء ہی تھا مگر کام کرنے والے دوستوں میں باہمی انڈرسٹینڈنگ قائم نہ رہنے کی وجہ سے ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اب وہاں شاہ ولی اللہ کیڈٹ کالج کام کر رہا ہے اور میڈیکل کالج کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ راقم الحروف اب بھی اس کا ٹرسٹی ہے مگر عملی طور پر متحرک نہیں ہے۔

دینی مدارس اور بین المسالک معاملات

سوال: دینی مدارس نے مختلف مسالک کے مابین اتحاد اور مکالمہ یا کشمکش یا تصادم کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا ہے؟

سوال: آپ کے خیال میں ایک مسلک کے پیروکاروں کا دوسرے مسلک کی ترجمانی اور اس کے پیروکاروں کے ساتھ تعلق کے حوالے سے کیا رویہ ہے اور مسلکی مقابلہ بازی کے فروغ میں اس رویے کا کتنا حصہ ہے؟

سوال: پاکستان میں عوام اور بالخصوص علما کے مابین مسلکی تصادم کی فضا کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟

سوال: پاکستان کے مختلف مسالک خاص طور پر شیعہ سنی، دیوبندی بریلوی اور اہل حدیث حنفی مسلکو ں کے مابین سنجیدہ، تعمیری اور مثبت مکالمہ کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں کی کچھ تفصیلات بتائیں۔

جواب: مسلکی حوالہ سے مدارس کی موجودہ فضا تسلی بخش نہیں ہے اور جس طرح جذباتی اور مناظرانہ انداز میں طلبہ کی ایک دوسرے کے خلاف ذہن سازی کی جاتی ہے، وہ نقصان دہ ہے۔ اس کے بجائے ہر مسلک کے مدارس کو یہ چاہیے کہ وہ اپنے طلبہ کو اپنے مسلک اور اس کے دلائل سے ضرور متعارف کرائیں اور ان کی ذہن سازی بھی کریں مگر یہ مثبت طور پر بریفنگ کے انداز میں ہو اور دوسرے مسالک کے معروضی تعارف کے ساتھ اپنے فضلا کو منطق اور استدلال کی زبان میں گفتگو کی تربیت دیں۔ مسلکی تفریق بالکل ختم تو نہیں ہوسکتی لیکن اگر برداشت کا ماحول پیدا کیا جائے اور جذباتی انداز کے بجائے استدلال اور افہام وتفہیم کا اسلوب اختیار کیا جائے تو اس کے نقصانات میں خاصی کمی آسکتی ہے۔

بیرونی امداد کا کردار

سوال: سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک سے آنے والے پیسے نے بین المسلکی تعلقات کو کس حوالے سے متاثر کیا ہے؟

جواب: سعودی عرب اور بعض دیگر عرب ریاستوں سے مختلف مسلم ممالک میں جو رقوم تقسیم ہوتی ہیں، ان میں مسلکی ترجیحات کا دخل زیادہ چلا آ رہا ہے اور اس کے نقصانات بھی واضح ہیں۔ اس سے باہمی منافرت بڑھی ہے اور خود سعودی حکومت کے بارے میں ذہنوں میں تحفظات نے جنم لیا ہے۔

شیعہ کی تکفیر کا معاملہ

سوال: بعض پاکستانی حلقے مثلاً سپاہ صحابہ شیعہ کو کافر اور دشمن اسلام قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟ ہاں یا نہیں کی صورت میں آپ کی رائے کے وجوہ کیا ہیں؟ اگر آپ اس سے متفق نہیں تو اس نقطہ نظر کی تردید کے لیے آپ نے کیا کردار ادا کیا ہے؟

جواب: ہم نے سپاہ صحابہؓ کے شدت پسندانہ طریق کار سے ہمیشہ اختلاف کیا ہے اور مختلف مضامین میں اس کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس کے راہ نماؤں مثلاً مولانا حق نواز جھنگوی، مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی اور مولانا محمد اعظم طارق کے ساتھ براہ راست گفتگو میں بھی انہیں اپنے موقف سے آگاہ کیا ہے۔ ہم جمہور علماء اہل سنت کے اس موقف سے متفق ہیں کہ جو شیعہ تحریف قرآن کریم کا قائل ہے، اکابر صحابہ کرام کی تکفیر کرتا ہے اور حضرت عائشہؓ پر قذف کرتا ہے، وہ مسلمان نہیں ہے نیز ہم امت کی چودہ سو سالہ تاریخ کے مختلف ادوار میں شیعہ کے سیاسی کردار کے حوالے سے بھی تحفظات رکھتے ہیں لیکن اس کی بنیاد پر ان کے خلاف کافر کافر کی مہم، تشدد کے ساتھ ان کو دبانے اور کشیدگی کا ماحول پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہمارا اس حوالہ سے موقف یہ ہے کہ عقائد اور تاریخی کردار کے حوالہ سے باہمی فرق اور فاصلہ کو قائم رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور استدلال و منطق کے ساتھ اپنا موقف پیش کرنے کا راستہ ہی صحیح اور قرین عقل ہے اور اس حوالہ سے ہمیں امت مسلمہ کے اجتماعی رویہ سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔

غیر مسلموں سے تعلقات اور بین المذاہب مکالمہ

سوال: عام طور پر علما اور مدارس تمام غیر مسلموں کو اسلام کا دشمن سمجھتے ہیں۔ کیا آپ اس تصور سے

متفق ہیں؟ بین المذاہب مکالمہ کے فروغ اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے مابین تعلقات کو بہتر بنانے میں مدارس کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ خالصتاً تبلیغی اور دعوتی کوششوں کے علاوہ کیا آپ ایسی مثالیں بتا سکتے ہیں کہ پاکستانی مدارس نے بین المذاہب مکالمہ کے فروغ میں کوئی متحرک کردار ادا کیا ہو؟

جواب: تمام غیر مسلموں کو دشمن قرار دے کر ان کے خلاف محاذ آرائی کی سوچ درست نہیں ہے اور حکمت عملی کے تقاضوں کے بھی منافی ہے۔ دنیا کی غیر مسلم آبادی کا ایک بڑا حصہ اسلام کی دعوت اور پیغام سننے کے لیے تیار ہے مگر ہم اس طرف متوجہ نہیں ہیں۔ غیر مسلموں کے بہت سے حلقے مسلمانوں کی موجودہ صورت حال میں ان سے ہمدردی رکھتے ہیں اور استعمار دشمنی میں ان کے ساتھ شریک ہیں مگر ہمارا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہے جبکہ اسلام سے دشمنی رکھنے والے اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا اہتمام کرنے والے غیر مسلموں کا تناسب بہت کم ہے لیکن چونکہ سیاست، معیشت، تہذیب وثقافت اور ذرائع ابلاغ پر ان کا کنٹرول ہے، اس لیے ہر طرف وہی دکھائی دیتے ہیں۔ مسلم اہل دانش کو اس صورت حال کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے اور کفر دون کفر (نسبتاً چھوٹی برائی) کے اصول پر دنیائے کفر کے بارے میں اپنی ترجیحات نئے سرے سے طے کرنی چاہئیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے فکری بیداری اور ذہنی تربیت کا ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ علماء کرام، اساتذہ، دانش وروں اور میڈیا سے تعلق رکھنے والے حضرات تک رسائی کی ضرورت ہے اور میرے خیال میں ہمدرد یونیورسٹی اس کے لیے زیادہ بہتر خدمت سرانجام دے سکتی ہے۔ اگر اس سمت میں ہمدرد یونیورسٹی یا اس جیسا کوئی اور مسلم ادارہ مثبت پیش رفت کرے تو اسے میرے جیسے سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسے افراد عالم اسلام میں بکھرے ہوئے ملیں گے جو اس رخ پر سوچتے ہیں مگر کوئی فورم اور مواقع نہ ہونے کی وجہ سے اپنی حسرتوں کا خود اپنے ہاتھوں گلا گھونٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ماہنامہ آبِ حیات، لاہور

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۰۵ء)

خاندانی پس منظر

سوال: سب سے پہلے تو ہم آپ کو اپنے رسالہ ماہنامہ آب حیات کی انتظامیہ کی جانب سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ اب آپ اپنے خاندانی پس منظر کے حوالے سے کچھ بتائیں۔

جواب: ہمارا تعلق ضلع مانسہرہ، ہزارہ میں آباد سواتی خاندان سے ہے جس کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں نقل مکانی کر کے ہزارہ میں آباد ہو گئے تھے۔ ہمارے دادا نور احمد خان مرحوم شنکیاری سے آگے کڑمنگ بالا کے قریب چیڑاں ڈھکی میں رہتے تھے اور زمینداری کرتے تھے۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب دامت برکاتہم اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی مدظلہ العالی چھوٹے بچے تھے کہ ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ یہ دونوں حضرات دینی تعلیم کی طرف آ گئے۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر پنجاب کے مختلف مدارس، بالخصوص مدرسہ انوار العلوم، مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں درس نظامی کا بڑا حصہ پڑھا۔ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۲ء میں دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ والد محترم ۱۹۴۳ء سے گکھڑ ضلع گوجرانوالہ میں مقیم ہیں۔ میری ولادت ۱۹۴۸ء میں ۲۸ اکتوبر کو ہوئی۔ میری والدہ محترمہ کا تعلق راجپوت خاندان سے تھا اور ہمارے نانا مرحوم مولوی محمد اکبر صاحب گوجرانوالہ میں ریلوے اسٹیشن کے قریب تالاب دیوی والا، رام بستی کی ایک مسجد کے امام تھے۔

دینی و دنیاوی تعلیم

سوال: اپنی دینی و دنیاوی تعلیم کے بارے میں ضروری معلومات سے آگاہ کریں۔

جواب: میں نے قرآن مجید گکھڑ کے مدرسہ تجوید القرآن میں مختلف اساتذہ کرام سے حفظ کیا جس میں سب سے آخری اور بڑے استاد محترم قاری محمد انور صاحب ہیں جو کہ آج کل مدینہ منورہ میں تحفیظ القرآن کے استاد ہیں۔ ۱۲۰ کتوبر ۱۹۶۰ء کو میرا حفظ مکمل ہونے پر گکھڑ کی جامع مسجد میں جو تقریب ہوئی، اس میں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی، حضرت مولانا قاری فضل کریم اور حضرت مولانا قاری محمد حسن شاہ صاحب نے شرکت فرمائی تھی اور میں نے آخری سبق ان بزرگوں کو سنایا تھا۔ درسِ نظامی کے بڑے حصہ کی تعلیم میں نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں حاصل کی اور میرے اساتذہ میں حضرت والد محترم مدظلہ اور حضرت عم مکرم مدظلہ کے علاوہ حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی مدظلہ، حضرت مولانا قاضی محمد اسلم صاحب، حضرت مولانا قاضی عزیز اللہ صاحب اور حضرت مولانا جمال احمد بنوی مظاہری مدظلہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم سے میں نے فراغت حاصل کی۔

عملی زندگی کا آغاز

سوال: عملی زندگی میں کب اور کیسے قدم رکھا؟

جواب: دوران زمانہ طالب علمی مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحبؒ کی معاونت کے لیے بطور نائب خطیب میرا تقرر ہو چکا تھا، جبکہ اس سے قبل کم وبیش دو سال تک گتہ مل راہوالی کی کالونی کی مسجد میں خطابت کے فرائض سرانجام دیتا رہا ہوں۔ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے مدرسہ انوار العلوم میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک درسِ نظامی کی تدریس کے فرائض سرانجام دیتا رہا ہوں۔

دینی ومعاشرتی مصروفیات

سوال: اپنے دینی کام اور معاشرتی مصروفیات پر روشنی ڈالیں۔

جواب: ۱۹۸۲ء میں مولانا مفتی عبدالواحدؒ کی وفات کے بعد مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے مستقل خطیب کی حیثیت سے میں نے ذمہ داری سنبھال لی تھی جو کہ بحمد اللہ تعالیٰ اب تک حسب

استطاعت نباہ رہا ہوں۔ مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں تقریباً ۲۰ سال تک تدریسی خدمات انجام دیتا رہا ہوں جبکہ گزشتہ چھ سات سال سے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں تدریسی خدمات میرے سپرد ہیں اور والد محترم مدظلہ کی معذوری کے بعد صدارتِ تدریس اور نظامتِ تعلیمات کا بوجھ بھی میرے ناتواں کندھوں پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نباہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

علاوہ ازیں ۱۹۸۹ء میں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں الشریعہ اکادمی قائم کی جس کا مقصد دعوت اسلام اور دینی تعلیم کے حوالے سے عصری تقاضوں کو اجاگر کرنا اور ان کی طرف دینی حلقوں کو توجہ دلانا تھا۔ بعد میں جی ٹی روڈ پر کنگنی والا بائی پاس کے قریب ہاشمی کالونی میں ایک کنال زمین کسی دوست نے وقف کر دی جہاں باقاعدہ عمارت تعمیر کر کے تعلیم و تربیت کا ایک نظام قائم ہے اور مختلف کلاسوں کے علاوہ درس نظامی کے فضلاء کی ایک سالہ کلاس اس وقت زیر تعلیم ہے جس میں اس سال تیرہ علماء کرام شریک ہیں جنہیں انگریزی و عربی زبانوں اور کمپیوٹر ٹریننگ کے علاوہ بین الاقوامی قانون، تقابل ادیان، تاریخ اسلام اور حجۃ اللہ البالغہ کے منتخب ابواب کی تعلیم کے ساتھ سیاست، معیشت اور نفسیات کے مضامین کا تعارفی مطالعہ کرایا جاتا ہے اور تحقیق و مطالعہ کی عملی مشق کرائی جاتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء سے ماہنامہ الشریعہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جسے علمی حلقوں میں بحمد اللہ تعالیٰ توجہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اس کام میں میرے دو بڑے معاون حافظ محمد عمار خان ناصر اور مولانا حافظ محمد یوسف ہیں۔ عمار خان ناصر میرا بیٹا ہے جو نصرۃ العلوم کا فاضل اور اس میں درسِ نظامی کا مدرس ہے، اس نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا ہے اور بحمد اللہ تعالیٰ تحقیق و مطالعہ کے ذوق سے بہرہ ور ہے۔ مولانا حافظ محمد یوسف بھی نصرۃ العلوم کے فاضل ہیں اور درسِ نظامی کے علاوہ انگلش کے بھی اچھے استاد ہیں۔

صحافتی زندگی میں طالب علمی کے دوران ۱۹۶۵ء میں روزنامہ وفاق لاہور کے نامہ نگار کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اس کے بعد جمعیت علماء اسلام کے آرگن ہفت روزہ ترجمانِ اسلام لاہور کے ساتھ تعلق رہا اور متعدد بار کئی برس تک ایڈیٹر کے طور پر بھی فرائض سرانجام دیے۔ روزنامہ پاکستان اسلام آباد اور روزنامہ اوصاف اسلام آباد میں کئی سال مستقل کالم نگار کے طور پر وابستہ رہا اور ''نوائے قلم'' کے نام سے ہفتہ وار کالم لکھتا رہا، اب یہ کالم روزنامہ پاکستان لاہور میں لکھ رہا

ہوں، جبکہ روزنامہ اسلام لاہور میں بھی ''نوائے حق'' کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھتا ہوں۔

بیرون ملک ختم نبوت کانفرنسوں اور ورلڈ اسلامک فورم کی سرگرمیوں کے علاوہ دیگر تعلیمی، دعوتی اور مطالعاتی مقاصد کے لیے کئی ممالک میں جانا ہوا جن میں سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مصر، بھارت، بنگلہ دیش، ایران، افغانستان، ازبکستان، ترکی، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور کینیا شامل ہیں۔ مدرسہ نصرۃ العلوم کی سالانہ تعطیلات کے دوران شعبان المعظم اور اس کے ساتھ رمضان المبارک کا کچھ حصہ برطانیہ اور امریکہ میں تعلیمی سرگرمیوں میں مصروفیت رہتی ہے اور متعدد دینی اداروں سے مشاورت اور معاونت کا تعلق ہے۔

جماعتوں اور تحریکوں میں کردار

سوال: آپ نے کون سی جماعتوں اور تحریکوں میں سرگرم کردار ادا کیا؟

جواب: سیاسی و تحریکی ذوق طالب علمی کے دور سے ہے۔ جمعیت طلباء اسلام پاکستان کو منظّم کرنے میں حصہ لیا اور جمعیت علماء اسلام میں بتدریج شہر، ضلع، صوبہ اور مرکز کی سطح پر سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے فرائض سرانجام دینے کا موقع ملا۔ مرکزی سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے میرا انتخاب حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی تجویز پر ہوا اور پھر ان کی وفات تک ان کی معاون ٹیم کے ایک متحرک رکن کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۷۴ء اور ۱۹۸۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں عملی حصہ لینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۹۸۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں مرکزی مجلسِ عمل کے سیکرٹری اطلاعات کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد قائم ہوا تو اس کی دستور ساز اور منشور ساز کمیٹیوں اور پارلیمانی بورڈ میں جمعیۃ کی نمائندگی کی۔ پنجاب کا قومی اتحاد کا نائب صدر اور پھر سیکرٹری جنرل رہا۔ ۱۹۸۸ء میں اسلامی جمہوری اتحاد قائم ہوا تو اس میں بھی دستور ساز اور منشور ساز کمیٹیوں میں جمعیت علماء اسلام (درخواستی گروپ) کی نمائندگی کی اور صوبائی نائب صدر رہا۔

ملکی سیاسیات کے حوالہ سے اب بھی جمعیت علماء اسلام پاکستان سے وابستہ ہوں اور اس کا باقاعدہ رکن ہوں مگر متحرک کردار سے کنارہ کش ہوں، البتہ عملی سیاست سے ہٹ کر فکری اور نظریاتی کام کے حوالے سے حضرت مولانا فداء الرحمٰن درخواستی کے ساتھ مل کر ''پاکستان شریعت کونسل''

کے نام سے ایک فکری فورم قائم کر رکھا ہے۔

گزشتہ عشرہ کے اوائل میں لندن میں مولانا محمد عیسیٰ منصوری کے ساتھ مل کر عالمی سطح پر ایک فکری اور علمی فورم ’’ورلڈ اسلامک فورم‘‘ کے نام سے قائم کیا جو کہ علمی اور فکری میدان میں عصر حاضر کے تقاضوں کا احساس اجاگر کرنے میں مصروف ہے اور اس کی سرگرمیوں کا دائرہ برطانیہ، بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ اس وقت مولانا منصوری اس کے چیئرمین جبکہ میں سیکرٹری جنرل کے طور پر کام کر رہا ہوں۔

پاکستان شریعت کونسل کے اغراض ومقاصد

سوال: پاکستان شریعت کونسل بنانے کی وجہ، اس کے اغراض و مقاصد اور اس کی کارکردگی پر روشنی ڈالیں۔

جواب: جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، پاکستان شریعت کونسل کے قیام کا مقصد عملی سیاست سے ہٹ کر خالصتاً فکری اور نظریاتی کام کے حوالے سے جدوجہد کرنا ہے۔ پاکستان شریعت کونسل کے ذریعے اسلامائزیشن اور دیگر ملی و دینی مسائل کے بارے میں دینی حلقوں کو متوجہ کرنے اور رابطہ کا ماحول قائم رکھنے کے لیے ہم سرگرم عمل رہتے ہیں۔ پاکستان شریعت کونسل میں ہمارے ساتھ مولانا عبد الرؤف فاروقی، مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر، مولانا عبد الرشید انصاری، مولانا سیف الرحمٰن ارائیں، مولانا عبد العزیز محمدی، مولانا میاں عصمت شاہ کاکاخیل، مولانا سخی داد خوستی، مولانا قاری محمد الیاس، مولانا محمد نواز بلوچ، مولانا صلاح الدین فاروقی، جناب احمد یعقوب چوہدری، حاجی جاوید ابراہیم پراچہ اور دیگر بہت سے احباب شریک ہیں اور مختلف سیاسی جماعتوں سے وابستگی رکھتے ہوئے بھی ہم علمی و نظریاتی کاموں کے لیے باہمی مشاورت سے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں اور ہمارا دائرۂ کار یہ ہے کہ کوئی مسئلہ سامنے آئے تو اس کے بارے میں متعلقہ لوگوں کو توجہ دلائی جائے، مسئلہ کی نوعیت کو بریفنگ رپورٹ کی صورت میں واضح کیا جائے اور اس کے حل کے لیے مشترکہ محنت کی راہ ہموار کی جائے۔ اس سے زیادہ کوئی کام ہم اپنے ذمہ نہیں لیتے اور کوشش کرتے ہیں کہ کوئی بھی مسئلہ ہو، اس کے متعلقہ لوگوں کو متحرک کر کے اس کے لیے جدوجہد کی راہ نکالی جائے اور ان سے حتی الوسع تعاون کیا جائے۔

قید و بند کے مراحل

سوال: کیا کبھی قید و بند کی نوبت بھی پیش آئی؟

جواب: تحریکِ ختمِ نبوت، تحریکِ نظامِ مصطفیؐ، گوجرانوالہ میں مسجد نور کو محکمہ اوقاف سے واگزار کرانے کی تحریک اور دیگر متعدد تحریکات میں حصہ لینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ بھٹو دور میں کئی بار جیل یاترا کی۔ مسجد نور کی تحریک میں کم و بیش چار ماہ اور تحریکِ نظامِ مصطفیؐ میں ایک ماہ جیل کاٹی۔ اس کے علاوہ بھی متعدد بار تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے جیل جانے کا موقع ملا۔

دینی مدارس کا نظامِ تعلیم

سوال: دینی مدارس کے نظام تعلیم کی اصلاح کے بارے میں آپ کا کیا نقطہ نظر ہے؟

جواب: دینی مدارس کے نظامِ تعلیم کے بارے میں ایک عرصہ سے اس رائے کا اظہار کر رہا ہوں کہ دینی مدارس کی آزادی اور خودمختاری کا بہرحال تحفظ ہونا چاہیے اور انہیں کسی قسم کی سرکاری سرپرستی اور امداد قبول نہیں کرنی چاہیے۔ نیز دینی مدارس کو اپنے بنیادی اہداف میں بھی کوئی تبدیلی قبول نہیں کرنی چاہیے اور انہیں معاشرے میں دینی تعلیم کے فروغ، اسلامی روایات و اقدار کے تحفظ اور دینی خدمت کے لیے رجال کار کی فراہمی کے کام پر ہی بنیادی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ البتہ اپنے اہداف و مقاصد کے حوالے سے انہیں آج کی ضروریات اور تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے ان کی روشنی میں تعلیمی نصاب و نظام میں مناسب ترامیم اور تبدیلیوں سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

سوال: آپ دینی مدارس کے نصاب میں عصری نصاب کی شمولیت کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ نیز حکومت مدارس کے نصاب میں تبدیلی چاہتی ہے، جبکہ مدارس اس کی مزاحمت کر رہے ہیں۔ عام آدمی یہ جاننا چاہتا ہے کہ مدارس یہ مزاحمت کیوں کر رہے ہیں، جبکہ وہ ان مضامین کو داخل نصاب کرتے چلے جا رہے ہیں جو حکومت چاہتی ہے۔

جواب: دینی نصاب تعلیم میں انگلش زبان، کمپیوٹر ٹریننگ، بین الاقوامی قانون، تقابل ادیان، مغربی فلسفہ و تہذیب، تاریخِ اسلام اور ان جیسے دیگر ضروری مضامین کا اضافہ ایک ناگزیر ضرورت

ہے جس سے صرفِ نظر کے نقصانات مسلسل بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح اساتذہ کی فنی اور فکری تربیت کے نظام و نصاب کی بھی ضرورت ہے جس کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔

عصری نظامِ تعلیم کا رُخ

سوال: پاکستان کے عصری نظام تعلیم اور عصری اداروں پر آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

جواب: عصری نظام تعلیم کا تو سرے سے کوئی رخ ہی متعین نہیں ہے اور نہ ہی اہداف طے ہیں۔ وقت کی حکومت اسے اپنے رجحانات کے مطابق جس طرف کھینچنا چاہتی ہے، کھینچتی رہتی ہے۔ اسی کشمکش میں اس کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا ہے اور اب تو اسے آغا خان فاؤنڈیشن کے ذریعے سے عالمی سیکولر ایجوکیشنل سسٹم کا تابع فرمان بنانے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں جس پر عمل درآمد کی صورت میں ہمارے قومی تعلیمی نظام و نصاب میں باقی ماندہ اور رہی سہی دینی علامات و روایات بھی ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ بدقسمتی سے ہماری دینی جماعتوں کے نزدیک اس مسئلہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے ان کی تگ و دو اور سرگرمیوں میں عصری تعلیمی نظام پر نظر اور خرابیوں کی نشاندہی و اصلاح کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔

پاکستان کی سیاسی صورتحال

سوال: پاکستان کی سیاسی صورتحال کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: ملک میں قومی سیاست کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ گروہی، طبقاتی اور علاقائی سیاست کی گرم بازاری ہے۔ مختلف طبقات اور گروہ اپنے اپنے مفادات کی سیاست کر رہے ہیں اور اجتماعی و قومی سیاست کا کوئی ماحول آج تک قائم نہیں ہو سکا جس کی وجہ سے قومی معاملات پر سیاست دانوں کی گرفت نہیں ہے اور وہ دیگر طاقتور قوتوں کے آلہ کار سے زیادہ کوئی کردار اپنے لیے حاصل نہیں کر سکے۔ سیاست دانوں کی اپنی نااہلی کے ہاتھوں ہم قومی خودمختاری سے محروم ہو چکے ہیں اور ہمارے معاملات کا کنٹرول ہمارے پاس نہیں رہا۔ دینی سیاست کی علمبردار جماعتیں بھی

اصولی اور نظریاتی سیاست کے بجائے معروضی سیاست پر آ گئی ہیں اور اس کان نمک میں وہ بھی نمک ہی ہوتی جا رہی ہیں۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت قومی خود مختاری کی بحالی اور سیاسی اداروں کا استحکام ہے، مگر کوئی اس کے لیے آواز اٹھانے اور قربانی دینے کو تیار نہیں ہے۔ ہمارے سیاسی ادارے بلکہ ریاست کے دیگر بنیادی ستون بھی اندھی طاقت کی بھٹی میں پگھل کر رہ گئے ہیں اور قومی خود مختاری، سیاسی مفادات کے دھندلکوں میں غائب ہو گئی ہے۔

امریکہ کا سانحہ گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء

سوال: نائن الیون کے حادثے کے بعد پاکستان نے جو اپنی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں پر یو ٹرن لیا ہے اور پرویز مشرف نے جو دینی و مذہبی جماعتوں اور اداروں کے متعلق سخت رویہ اپنایا ہے، اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: نائن الیون کے حادثہ کے بعد جنرل پرویز مشرف نے خارجہ پالیسی میں جو یوٹرن لیا ہے اور داخلی طور پر دینی قوتوں کو دبانے اور کرش کرنے کی جو پالیسی اختیار کی ہے، وہ ایک طویل پروگرام کا حصہ ہے۔ اس میں کمی یا نرمی کا سر دست کوئی امکان نظر نہیں آ رہا، بلکہ اس ایجنڈے کے مختلف نئے تقاضے سر اٹھاتے جا رہے ہیں۔ دینی حلقوں کو اس امتحان سے بہر حال گزرنا ہوگا اور صبر و حوصلہ کے ساتھ آنے والے حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہمارے اسلاف اور اکابر نے دین اور ملت کے حوالے سے جو ورثہ ہم تک پہنچایا ہے، ہم اسے کسی نقصان کے بغیر اگلی نسلوں تک منتقل کر دیں اور اسے اس کی اہمیت اور نزاکتوں کا صحیح طور پر احساس دلا دیں۔ اگر ہم ایسا کر پائے تو یہ اس مشن میں ہماری کامیابی اور سرخ روئی متصور ہوگی۔ اس سے زیادہ ہمیں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: اس وقت دنیا بھر میں دہشت گردی کی وجہ اور محرکات کیا ہیں؟

جواب: اس وقت جس عمل کو دنیا میں دہشت گردی کہا جا رہا ہے، وہ خود امریکا کا پیدا کردہ ہے۔ امریکہ نے افغانستان میں روس کے خلاف جنگ کے لیے دنیا بھر کے مسلمانوں کو اسلحہ کی ٹریننگ

دی اور روسی جارحیت کے خلاف افغان عوام کی مزاحمتی جنگ کو جہاد تسلیم کرتے ہوئے اس کی سیاسی وعسکری سرپرستی کی۔ اب وہی لوگ مختلف علاقوں میں امریکی بالادستی کے خلاف برسرپیکار ہیں تو انہیں دہشت گرد کہا جارہا ہے۔ ایک امریکی دانشور نے مجھ سے کہا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں جہاد کی تعلیم دی جاتی ہے۔ میں نے گزارش کی کہ بالکل درست بات ہے کہ ہمارے ہاں جہاد کی تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم ہم نے دی ہے مگر عملی ٹریننگ تم نے دی ہے اور اسے عملی عسکریت کا رخ تم لوگوں نے دکھایا ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں جہاں بھی جہاد کی کارروائیاں ہو رہی ہیں، جنہیں دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو اس کی عملی ٹریننگ کا نسب نامہ امریکہ سے جا ملتا ہے۔ اسلحہ اور اس کی ٹریننگ کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے مگر امریکہ اس بات کو قبول کرنے کی اخلاقی جرات سے محروم ہے اور اس کی ذمہ داری بھی دینی مدارس کے کھاتے میں ڈال کر دنیا کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا ہے۔

تہذیبی جنگ اور اقوامِ متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر

سوال: اس وقت امریکہ کی سربراہی میں لڑی جانے والی جنگ دو تہذیبوں کے باہمی تصادم کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ مستقبل قریب میں اس کی کیا صورتحال ہوگی اور عالمی امن پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

جواب: اس وقت دنیا میں جو تہذیبی جنگ مسلسل آگے بڑھ رہی ہے، اس کا آغاز اسی وقت ہو گیا تھا جب مغربی ممالک نے اقوام متحدہ کے نام سے انسانی حقوق کا چارٹر یکطرفہ طور پر منظور کر کے اسے ساری دنیا کے لیے لازمی قرار دے دیا تھا۔ یہ چارٹر اسلام کی بنیادی تعلیمات سے متصادم ہے اور قرآن وسنت کے بیسیوں احکامات کی نفی کرتا ہے، لیکن اسے آج کی دنیا میں انسانی حقوق کا واحد معیار قرار دے کر اسلامی دنیا پر اسے قبول کرنے کے لیے دباؤ بڑھایا جا رہا ہے۔ اس کی بنیاد پر اسلامی تعلیمات کے خلاف لابنگ اور پراپیگنڈا کی ہمہ گیر مہم جاری ہے اور اسی کے حوالے سے قرآن وسنت کے احکام اور مسلمانوں کی دینی روایات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ یہ یک طرفہ تہذیبی جنگ اور ون وے ثقافتی یلغار ہے جس میں سب کچھ ایک ہی طرف سے ہو رہا ہے۔ دوسری طرف

مکمل سناٹا ہے، خاموشی ہے اور خود سپردگی کا مکروہ منظر ہے۔ صرف دینی حلقے اور غریب مسلمان اس حد تک میدان میں کھڑے ہیں کہ وہ اس یلغار کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور مغرب کی تہذیبی بالادستی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے کیمپ کی طرف سے اور کیا ہو رہا ہے؟ یہ انہی دینی حلقوں اور غریب مسلمانوں کی مزاحمتی مدافعت کی برکت ہے کہ مقابلے کی کچھ فضا بنی ہوئی ہے، ورنہ جہاں تک مسلمان ملکوں کے حکمران گروہوں، بالادست طبقات اور دانشوروں کا تعلق ہے، اگر ان کے بس میں ہوتا وہ دینی روایات، اسلامی اقدار اور ملی ورثہ کا لباس اتار کر کب کے اس حمام میں ننگے ہو چکے ہوتے۔

مسلمانوں کے زوال کے اسباب

سوال: مسلمانوں کے موجودہ زوال کے اسباب کیا ہیں؟

جواب: مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے میرے نزدیک سب سے نمایاں باتیں تین ہیں:

(۱) خلافتِ راشدہ کے بعد ہم کوئی مستحکم سیاسی نظام قائم نہیں کر سکے۔ خلافتوں کا وجود غنیمت تھا، لیکن ان کی بنیاد طاقت اور خاندانوں پر رہی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے قیام کو عام مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا اور رائے عامہ پر اعتماد کیا تھا، مگر ہم اس روایت کو قائم نہ رکھ سکے جبکہ یورپ نے اسے اپنا لیا۔

(۲) خلافتِ راشدہ میں فلاحی اور رفاہی ریاست کا جو تصور اجاگر ہو رہا تھا، ہم اس کا تسلسل قائم نہ رکھ سکے اور یہ روایت بھی ہم سے یورپ نے چھین لی۔

(۳) سائنس اور ٹیکنالوجی میں یورپ کو پیش قدمی کا راستہ دکھا کر خود ہم اس راہ سے ہٹ گئے اور میدان یورپ کے حوالے کر دیا جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے اور اس میدان میں مغرب سے پیچھے رہ جانے کی سزا خدا جانے ہم کب تک بھگتتے رہیں گے۔ اس شعبہ میں ہماری بے بسی کا یہ عالم ہے کہ عسکری قوت تو رہی ایک طرف، ہم اپنی روزمرہ ضرورت کی اشیا خود تیار کرنے سے قاصر ہیں اور خود اپنے وسائل سے براہ راست استفادہ کی

صلاحیت سے بھی بہرہ ور نہیں ہیں۔

پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ

سوال: پاکستان کے پاسپورٹ سے مذہب کا خانہ ختم کرنے پر آپ کے کیا ریمارکس ہیں؟

جواب: یہ پاکستان کے نظریاتی تشخص کو ختم کرنے اور قادیانیوں کے خلاف دستوری فیصلہ کو غیر مؤثر بنانے کی کوششوں کا ایک حصہ ہے اور ملک کے دینی حلقوں کو اس پر حکومت سے مؤثر احتجاج کرنا چاہیے۔ بین الاقوامی لابیاں اور غیر ملکی این جی اوز ایک عرصہ سے اس کوشش میں ہیں کہ پاکستان کے دستور میں شامل اسلامی دفعات اور خاص طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے جمہوری فیصلے کو غیر مؤثر بنا دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کے اضافے کا مطالبہ منظور نہیں کیا جا رہا اور اب پاسپورٹ سے بھی مذہب کا خانہ حذف کر دیا گیا ہے جو کہ ملک کے نظریاتی تشخص اور دستور کی اسلامی دفعات سے انحراف ہے۔

موجودہ دور کی تحدّیات اور علماء کرام

سوال: آج کے ماحول میں ہمیں کون کون سے چیلنج درپیش ہیں اور علماء کرام کو اس سلسلہ میں کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟

جواب: آج امتِ مسلمہ کو آگے، پیچھے، دائیں، بائیں، چاروں طرف سے دشمنانِ اسلام کی یلغار کا سامنا ہے۔ اس سلسلے میں بہت کچھ کہنے کی ضرورت اور گنجائش ہے۔ علماء کرام اور دینی کارکنوں سے میری یہی گزارش ہے کہ دینی جدوجہد سے لاتعلق نہ رہیں، کیونکہ اس دور میں، اس ماحول میں دین کی جدوجہد سے کلیتاً لاتعلق رہنے میں مجھے ایمان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ جس شعبہ میں آپ آسانی سے کام کر سکتے ہیں، وہاں کریں، لیکن دینی جدوجہد میں خاموش تماشائی نہ بنیں۔ جو شخص دین کے جس شعبے میں اور دینی جدوجہد کے جس محاذ پر کام کر رہا ہے، اسے کام کرنے دیں۔ اس کی مخالفت نہ کریں، حوصلہ شکنی نہ کریں، آپس میں رابطہ اور مشاورت کا ماحول بنائیں، ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کریں۔ اسی سے قوت پیدا ہوگی اور باہمی اعتماد بڑھے گا۔

ذرائع ابلاغ کی ضرورت واہمیت

سوال: میڈیا کی طرف ہمارے دینی طبقہ کا رجحان کم ہے اور لادین طبقہ پوری طرح میڈیا پر چھایا ہوا ہے۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: میڈیا اور ذرائع ابلاغ نے پوری طرح دنیا کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ایک طرف اسلامی عقائد واحکام اور قوانین کے متعلق پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ دوسری طرف دینی قوتوں اور اسلامی تحریکات کی کردارکشی کی مہم جاری ہے اور انہیں دہشت گرد اور بنیاد پرست قرار دے کران کے خلاف پوری دنیا میں نفرت کا ماحول پیدا کیا جا رہا ہے۔ تیسری طرف بے حیائی، ناچ گانا، عریانی اور سفلی خواہشات کو ابھار کرنئی نسل کو اخلاقی طور پر تباہ کیا جا رہا ہے۔ اس یلغار کا سامنا بھی اہل حق ہی نے کرنا ہے اور یہ بھی علماء کرام اور دینی مراکز کی ذمہ داری میں شامل ہے۔

دینی صحافت سے تعلق رکھنے والے حضرات کے حوالے سے میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ ان کے درمیان مشاورت اور تبادلہ خیال کا کوئی ایسا نظم ضرور قائم ہونا چاہیے جس کے تحت دینی جرائد کے مدیرانِ گرامی اور قلم کار حضرات وقتاً فوقتاً مل بیٹھیں، مسائل پر باہمی تبادلہ خیالات کریں، ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کریں، باہمی تقسیم کار کے ذریعہ مختلف شعبوں میں کام کی صف بندی کریں اور ایک دوسرے کو مختلف حوالوں سے سپورٹ کریں۔

’’آبِ حیات‘‘: رائے اور پیغام

سوال: ’’آبِ حیات‘‘ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ماہنامہ آب حیات وقتاً فوقتاً میری نظروں سے گزرتا رہتا ہے اور میں مولانا محمود الرشید حدوٹی کی صلاحیتوں اور جوش عمل کا معترف ہوں۔ وہ جس حوصلہ اور جذبات کے ساتھ دینی حلقوں کے جذبات کی ترجمانی کررہے ہیں، وہ قابل داد ہے اور اس سے نوجوان علماء کرام کو حوصلہ ملتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ رب العزت مولانا محمود الرشید حدوٹی اور ان کے رفقاء کرام کے حوصلہ اور عزائم میں برکت دیں اور ذوق، سلیقہ، توفیق، قبولیت اور نتائج وثمرات سے بہرہ ور فرماتے رہیں۔ آمین یارب العالمین۔

سوال: ”آب حیات“ پڑھنے والوں کے نام کوئی پیغام؟

جواب: ماہنامہ آب حیات ایک مقدس اور اصلاحی تحریک ہے۔ قارئین اس کو پھیلانے کی حتی الوسع کوشش کریں۔ خود بھی پڑھیں اور اپنے متعلقین کو بھی اس کے مطالعہ کی ترغیب دیں۔

آب حیات: ہم اپنی طرف سے، مدیر اعلیٰ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب اور ادارہ ”آب حیات“ کی جانب سے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی قیمتی مصروفیات میں سے ہم کو وقت دیا۔

ماہنامہ قومی ڈائجسٹ، لاہور

(دسمبر ۲۰۰۷ء)

(ماہنامہ قومی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا انٹرویو ضروری اصلاح و ترمیم اور مولانا راشدی کی نظر ثانی کے ساتھ یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ انٹرویو نگار پروفیسر خالد ہمایوں تھے۔)

پیش لفظ از پروفیسر خالد ہمایوں

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی طویل عرصے تک خارزارِ سیاست میں آبلہ پائی کرنے کے بعد اب کئی سالوں سے علمی اور تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ دنیا کی دوسری تہذیبوں سے مکالمہ کرتے اور ان پر اسلام کی حقانیت واضح کرتے ہیں۔ وہ قدیم اسلامی علوم میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں اور دورِ جدید کے سیاسی، معاشی، اور عمرانی مسائل کی مبادیات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ہم نے ان کے سیاسی تجربات اور قومی حوادث کے بارے میں بھی استفسار کیا اور اسلامی دنیا کی بحرانی کیفیت پر بھی کئی سوالات اٹھائے۔ ان کے لب و لہجے کی شائستگی اور گفتگو کے عالمانہ وقار سے ہم بھی متاثر ہوئے، ہمیں یقین ہے کہ قارئین بھی ان کے خیالات سے لطف اٹھائیں گے۔ ہم مولانا شبیر احمد میواتی کے شکر گزار ہیں کہ ان کی وساطت سے سوال و جواب کی یہ نشست انعقاد پذیر ہوئی۔

خاندانی پس منظر

سوال: مولانا آپ اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جواب: ہمارا خاندانی پس منظر یہ ہے کہ ہزارہ میں مانسہرہ سے آگے سواتی برادری بہت بڑی تعداد میں آباد ہے۔ کسی زمانے میں ہمارے آباؤ اجداد سوات سے ہزارہ آ گئے تھے اور وہ اسی طرح وہاں سواتی کہلاتے ہیں جیسے لاہور اور گوجرانوالہ میں کشمیر سے آنے والے لوگ کشمیری کہلواتے

ہیں۔ میرا تعلق اسی سواتی برادری سے ہے اور ہمارے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ہم یوسف زئی پٹھان ہیں۔ سوات میں کسی زمانے میں باہم جھگڑے ہوئے ہوں گے جن کی وجہ سے کچھ لوگ وہاں سے نکل کر ہزارہ چلے آئے۔ یوسف زئی خاندان کا وہ حصہ جو ہزارہ کے علاقے میں سواتی برادری کے نام سے معروف ہے، شنکیاری سے ایک میل آگے اچھڑیاں ایک گاؤں ہے، وہ آج کل ہمارے خاندان کا ہیڈکوارٹر ہے۔ اس سے تھوڑا آگے جائیں تو کوٹلی بالا ہے جس کے قریب ایک گاؤں ہے کڑمنگ۔ یہ پہاڑ کی چوٹی پر ہے، وہ ہمارے دادا مرحوم نور احمد خان مرحوم کا مسکن تھا، وہ چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ ان کے والد تھے گل احمد خان مرحوم، کڑمنگ سے آگے چیڑ ھاں ڈھکی ہے، ہمارے دادا جی کا وہاں مکان ہوتا تھا اور وہاں چھوٹی موٹی زمینداری کرتے تھے۔ میرے والد محترم حضرت مولانا سرفراز خان صفدر ہیں اور چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی، ان دونوں بھائیوں کی والدہ محترمہ یعنی ہماری دادی صاحبہ ان کے بچپن ہی میں وفات پا گئی تھیں۔

جب ہمارے دادا نے وفات پائی تو والد صاحب غالباً نو سال کے اور صوفی عبدالحمیدؒ سواتی چھ سال کے تھے، یہ یتیم بچے تھے، صرف سوتیلی والدہ حیات تھیں جو اپنے میکے چلی گئیں۔ اب یہ دونوں بھائی ادھر رہ گئے۔ بٹل سید برادری کا علاقہ تھا۔ والد صاحب کی پھوپھی وہاں کے ایک سید گھرانے میں بیاہی گئی تھیں وہ ان دونوں بھائیوں کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ پھر والد صاحب کے پھوپھی زاد بھائی مولانا سید فتح علی شاہ صاحبؒ انہیں اپنے ہاں لے گئے جو کہ بٹل سے مغرب کی جانب ایک گاؤں لمی میں مسجد کے امام تھے۔ پیچھے دادا مرحوم کی زمین پر لوگوں نے قبضہ کر لیا۔ اس زمانے میں کاغذات وغیرہ تو تھے نہیں۔ ہمارے پردادا کے زمانے میں زمینوں کا بندوبست ہوا تھا۔ مانسہرہ میں جب انگریز افسر آ کے بیٹھا تو لوگوں نے پردادا کو توجہ دلائی کہ تم بھی کاغذات وغیرہ بنوا کر زمین اپنے نام لکھوالو۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں انگریز افسر کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ چنانچہ پردادا نہیں گئے، ان کے نام کاغذات بھی نہیں بنے۔ میرے چھوٹے بھائی ایک دفعہ وہاں گئے تھے، کہتے ہیں کہ جہاں ہمارے دادا کا مکان تھا وہاں کوئی فیکٹری لگی ہوئی ہے، البتہ کچھ نہ کچھ کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔

والد صاحب جن کے ہاں رہے وہ کام بھی کراتے اور تھوڑا بہت پڑھا بھی دیتے تھے۔ زمانہ وہ تھا کہ بچوں پر سختی بھی ہوتی تھی۔ علاقہ کے کسی سمجھدار بندے نے دیکھا کہ یہ یتیم بچے ان حالات میں رہتے ہوئے ضائع ہو جائیں گے، اس نے بچوں کو وہاں سے نکلنے کی ترغیب دی اور پھر نزدیک کے ایک گاؤں بفہ کے ایک دینی مدرسے میں چھوڑ آئے۔ یہ مدرسہ مولانا غلام غوث ہزارویؒ کا تھا جہاں سے ان دونوں بھائیوں کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ جبکہ ان کے پہلے استادِ مکی کے مولانا سید فتح علی شاہ صاحبؒ تھے۔ کچھ دیر بفہ میں رہے لیکن مزید تعلیم کی جستجو انہیں کئی مدرسوں میں لے گئی۔ ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں وڈالہ سندھواں میں بھی رہے، جہانیاں منڈی میں بھی رہے۔ پرانے زمانے میں یہ رواج تھا کہ جہاں کسی قابل استاد کے بارے میں اطلاع ملتی طالب علم وہاں اس کے پاس جا پہنچتا تھا۔ البتہ زیادہ تعلیم ان بھائیوں نے مدرسہ انوار العلوم مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں حاصل کی جہاں آج کل میں خطیب ہوں۔ اس مدرسے کو حضرت مولانا عبد العزیز صاحبؒ نے ۱۹۲۶ء میں قائم کیا تھا اور شہر کا قدیم ترین دینی مدرسہ یہی ہے۔ یہاں ایک بزرگ حضرت مولانا عبد القدیر صاحبؒ پڑھاتے تھے جو کہ چھچھ کے علاقے کے تھے اور جیّد عالم دین تھے۔ ابھی چند سال پہلے انہوں نے وفات پائی ہے۔ آخری دور میں وہ دار العلوم تعلیم القرآن، راجہ بازار، راولپنڈی میں شیخ الحدیث تھے۔ میرے والد اور چچا نے زیادہ تعلیم انہی سے حاصل کی اور دونوں بھائیوں کو ان سے بہت قربت ہو گئی۔ اس مدرسہ میں انہیں مولانا مفتی عبد الواحدؒ سے بھی اکتسابِ فیض کا موقع ملا۔

یہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء کا دور تھا، پھر ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء میں یہ دیوبند چلے گئے تھے۔ دورۂ حدیث کے حوالے سے وہاں ان کے استاد تھے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا اعزاز علی، اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ دیوبند سے انہیں سند ملی۔ حضرت مولانا مدنیؒ اپنی طرف سے بھی طالب علم کو ایک سند دیا کرتے تھے، وہ بھی انہیں ملی۔

سوال: دونوں بھائیوں نے گویا اکٹھے ہی تعلیم حاصل کی۔

جواب: جی ہاں۔ تقریباً تمام تعلیمی مراحل میں اکٹھے ہی رہے۔ ۱۹۴۲ء میں والد صاحب دیوبند سے سیدھے گوجرانوالہ آ گئے کیونکہ وہ اس شہر سے مانوس تھے۔ گکھڑ منڈی میں بٹ دری فیکٹری

کے مالک حاجی اللہ دتہ بٹ مرحوم تھے، ہم انہیں دادا جی کہا کرتے تھے۔ وہ گوجرانوالہ آئے تو اساتذہ نے ان کی فرمائش پر والد صاحب کو ان کے ہمراہ گکھڑ بھیج دیا کہ وہاں دین کی اشاعت کریں۔ چنانچہ والد صاحب نے وہاں امامت بھی کی اور مدرسہ بھی بنالیا۔

سوال: کیا آپ کے والد صاحب کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی؟

جواب: جمعیت علمائے ہند سے تعلق تھا۔ حضرت مدنیؒ کی گرفتاری کے بعد دیوبند کے طلباء جو مظاہرے وغیرہ کرتے تھے، والد صاحب ان کی قیادت کرتے رہے۔ جمعیۃ کے ساتھ ساتھ والد صاحب کا مجلسِ احرار کے ساتھ بھی تعلق رہا ہے۔ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بھی گکھڑ تشریف لائے، وہاں احرار کے جلسے ہوتے اور والد صاحب ان سرگرمیوں میں حصہ لیتے۔ اگرچہ ان کا بنیادی مزاج تعلیم وتدریس کا رہا ہے۔

سوال: صوفی عبد الحمید صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کیا کیا؟

جواب: وہ حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں جامعہ طبیہ نظامیہ میں داخلہ لے لیا اور تین سال کا کورس کر کے حکیم حاذق کی سند لے لی۔ اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے جہاں مولانا عبدالشکور لکھنوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ان سے مناظرے کا کورس کیا۔ وہ فرنگی محلی علماء کا مرکز تھا۔ گویا صوفی صاحب دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے تین چار سال بعد گوجرانوالہ آئے۔ پہلے پہل حکمت کا مطب شروع کیا جو کہ اہلِ حدیث عالم دین حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کی مسجد کے ساتھ واقع تھی۔ والد صاحب نے ایک دن خوشگوار موڈ میں بتایا کہ ہم تو دوائیاں گھوٹ گھوٹ کر تھک جاتے اور یہ حضرت صاحب وہ دوائیاں دوستوں کو مفت بانٹ دیتے تھے۔ یعنی ان کا مزاج دکان اور کاروبار چلانے والا نہ تھا۔

جہاں آج جامعہ نصرۃ العلوم ہے وہاں اس دور میں ایک بہت بڑا جوہڑ ہوتا تھا۔ صوفی صاحب نے اس کے کنارے پر مٹی وغیرہ ڈلوا کر مدرسے کی بنیاد رکھ دی۔ نزدیک کے محلے توتیاں والا کی مسجد میں دو علماء خطیب وامام تھے مولانا عبدالقیوم ہزاروی اور مولانا محمد یوسف ہزاروی جو کہ دیوبند مکتبِ فکر سے متعلق تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے اس مسجد میں مولانا غلام اللہ خان صاحبؒ کی تقریر

کروائی۔ مولانا اپنی ہی طرز کے خطیب تھے، انہوں نے توحید اس طور سے بیان کی کہ اہلِ محلّہ ناراض ہو گئے اور دونوں کو مسجد سے نکال دیا۔

سوال: بریلوی مکتبِ فکر والوں نے دیوبندی عالم کو کیسے بلا لیا؟

جواب: اس دور میں رواداری بہت تھی۔ مفتی عبدالواحد صاحبؒ کہتے ہیں کہ ہم نے سوچا اس علاقے میں کسی دیوبندی عالم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں صوفی صاحبؒ کے ہاتھوں وہاں مدرسہ نصرۃ العلوم کی بنیاد رکھوائی۔ میں نے وہ دور دیکھا ہوا ہے، مسجد اور مدرسے کے کمرے کچے ہوتے تھے۔ وہاں مقامی لوگوں کا ایک حلقہ بن گیا اور والد صاحب روزانہ گکھڑ سے وہاں آکر پڑھاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس تالاب کو بھرواتے رہے تا آنکہ آج وہاں ہم جامعہ نصرۃ العلوم جیسا بڑا دارالعلوم دیکھ رہے ہیں۔ ایک دفعہ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ وہاں تشریف لائے اور مسجد و مدرسہ میں وسعت دیکھی تو وہیں عوامی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ مولوی کو تو بس پاؤں رکھنے کی جگہ چاہیے، آگے پھر سب کچھ بن جاتا ہے۔

تعلیمی و تربیتی مرحلہ

سوال: آپ کا تعلیمی سفر کیسے شروع ہوا؟

جواب: میری ولادت گکھڑ منڈی کی ہے۔ اب تو بٹ دری فیکٹری کا ماحول مختلف ہے، اس دور میں کام ابھی محدود تھا۔ اس کے اوپر ایک چوبارہ تھا جس میں والد صاحب رہتے تھے۔ سامنے مسجد تھی۔ میرے ننھیال گوجرانوالہ شہر ہی کے تھے۔ کشمیر محل سینما کے عقب میں تالاب دیوی والا ہے جو محلّہ رام بستی کہلاتا تھا، وہاں ایک چھوٹی سی مسجد تھی جہاں میرے نانا مولوی محمد اکبر مرحوم امام تھے۔ راجپوت جنجوعہ برادری سے ان کا تعلق تھا۔ اصلاً وہ لالہ موسیٰ کے قرب و جوار کے رہنے والے تھے، وہاں سے قرآن مجید پڑھنے کے بعد یہاں آگئے تھے۔ بڑے باذوق آدمی تھے، باقاعدہ عالم نہ تھے اور قرآن کریم کا کچھ ہی حصہ انہیں حفظ تھا۔ البتہ قرآن کریم پڑھنے کا انداز بہت اچھا تھا۔ ان کے ذوقِ مطالعہ کا اندازہ اس بات سے کریں کہ اس زمانے کے نمایاں علمی رسالے مثلاً البرہان (دہلی)، النجم، اور الفرقان (لکھنؤ) وغیرہ میں نے سب سے پہلے انہی کے ہاں دیکھے تھے۔ لاہور

ریلوے اسٹیشن کے سامنے آسٹریلیا مسجد کے ساتھ ایک ادارہ ہے ''اصلاح وتبلیغ''، اس کی طرف سے جمعہ کا خطبہ چھپا کرتا تھا۔ اب وہ خطبات کتابی شکل میں چھپ گئے ہیں، نانا جی مرحوم ان خطبات سے جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ تو یہ علمی ماحول تھا جو مجھے بچپن میں ملا۔

سوال: کیا زاہد الراشدی آپ کا اصل نام ہے؟

جواب: میرا پورا نام ''محمد عبدالمتین خان زاہد'' ہے۔ حروفِ ابجد کے حساب سے اس کے عدد ۱۳۶۷ بنتے ہیں جو ہجری لحاظ سے میرا سن پیدائش ہے۔ میں نے زاہد گکھڑوی کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا اور ابتدائی چند سال تک میرے مضامین اسی نام سے شائع ہوتے رہے۔ پھر حضرت مولانا عبیداللہ انور رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیعت کا تعلق ہو جانے کی وجہ سے ان کے روحانی سلسلہ ''عالیہ قادریہ راشدیہ'' کی مناسبت سے راشدی کی نسبت اختیار کر لی اور زاہد الراشدی کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ جبکہ ۱۹۷۵ء میں بڑے بیٹے محمد عمار خان ناصر کی ولادت کے بعد ''ابوعمار'' کی کنیت بھی ساتھ شامل کر لی۔

سوال: کیا آپ کی جائے پیدائش گوجرانوالہ ہی ہے؟

جواب: جی نہیں، میں گکھڑ میں اکتوبر ۱۹۴۸ء میں پیدا ہوا۔ مجھ سے ایک سال بڑی میری ہمشیرہ ہیں۔ والد صاحب کو یہ شدید احساس تھا کہ انہیں اپنی حقیقی والدہ کی خدمت کا موقع نہیں ملا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سوتیلی والدہ کو اپنے پاس بلا لیا جو تا حیات والد صاحب کے پاس ہی رہیں اور یہیں فوت ہو کر بٹ دری فیکٹری کے عقبی قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان کا چہرہ تو یاد نہیں رہا البتہ ذہن میں ایک ہیولا سا ہے۔ اور اس دور کی چند دھندلی سی یادیں ہیں جو ۱۹۵۳ء کی اینٹی قادیانی تحریک سے متعلق ہیں۔ مثلاً ہم بچے مرزا قادیانی اور خواجہ ناظم الدین کے خلاف نعرے لگاتے تھے۔ والد صاحب کی گرفتاری کا منظر بھی یاد ہے کہ کئی دن سے پولیس ان کا پیچھا کر رہی تھی اور وہ ہاتھ نہیں آ رہے تھے۔ بالآخر ایک دن صبح ہی صبح وہ تیار ہو کر گھر سے نکلے، اس روز گھر میں حلوہ پکا ہوا تھا۔ والد صاحب جب سیڑھیاں اتر رہے تھے تو میں نے والدہ صاحبہ سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ والدہ صاحبہ بس اتنا کہا کہ وہ نیکی کے کام پر جا رہے ہیں۔ ایک شخص نے ان کا بستر بھی اٹھایا ہوا تھا، وہ سیدھا پولیس چوکی میں پہنچے اور گرفتاری دے دی۔

سوال: والد صاحب کتنا عرصہ قید رہے؟

جواب: کوئی دس مہینے کے لگ بھگ ملتان میں رہے۔ جیل جانے سے پہلے انہوں نے ایک اور نکاح کیا تھا۔ والد صاحب کی دوسری اہلیہ کو ہم چھوٹی امی کہہ کر بلاتے تھے، وہ والد صاحب کی چچا زاد تھیں۔

سوال: آپ کی والدہ نے احتجاج نہیں کیا؟

جواب: کیا ہوگا، ہم تو بچے تھے۔ البتہ آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ شروع سے آخر تک دونوں والدہ اکٹھی رہیں اور دونوں کی اولاد ایک ہی گھر میں رہی۔ بڑی امی کی اولاد سے ہم کل پانچ ہیں، تین بھائی اور دو بہنیں۔ ایک بھائی مولانا عبد القدوس خان قارن ہیں جو جامعہ نصرۃ العلوم میں مدرس ہیں۔ دوسرے بھائی عبدالحق خان بشیر ہیں جو مسجد و مدرسہ حیات النبی گجرات کے خطیب و مہتمم ہیں۔ بڑی بہن اچھڑیاں مانسہرہ جبکہ چھوٹی بہن جہلم میں بیاہی گئیں۔ چھوٹی امی سے ہمارے چھ بھائی اور ایک بہن ہیں۔ ایک بھائی وفات پا چکے ہیں۔ اکٹھا رہنے سے باہم چھوٹا موٹا اختلاف تو کبھی کبھار ہوا، جیسا کہ انسان ہونے کے ناطے سے ہوتا ہی ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ کبھی تقسیم تک نوبت نہیں پہنچی اور وقت اچھا گزر گیا۔ چھوٹی امی کی اولاد سے بھی مجھے بہت پیار ہے بلکہ ان چھوٹے بھائیوں کے گھروں میں مجھے زیادہ پروٹوکول ملتا ہے۔ ہمایوں صاحب! ہمارے معاشرے کی اخلاقی حالت جس نہج پر جا پہنچی ہے اس سے آپ بھی واقف ہیں، لیکن الحمد للہ ہمارے گھروں میں اب بھی باہمی احترام اور محبت کی فضا موجود ہے۔

سوال: آپ نے تعلیم کا سفر کیسے شروع کیا؟

جواب: میرے پہلے پہل استاد تو والدین ہی ہیں۔ والدہ گھر پر محلے کے بچوں اور بچیوں کو قرآن مجید پڑھاتی تھیں۔ وہ حافظہ تو نہ تھیں لیکن دو درجن کے لگ بھگ بچیوں نے ان سے باقاعدہ قرآن کریم حفظ مکمل کیا تھا۔ ان کے شاگردوں میں سابق صدر جناب رفیق تارڑ بھی ہیں، پولیس افسر احمد نسیم بھی ہیں، اور آرمی کے ایجوکیشن کور کے بریگیڈیئر محمد علی چغتائی بھی ہیں۔ میں نے قرآن کریم کی ابتدائی تعلیم والدہ صاحبہ سے حاصل کی جبکہ والد صاحب مجھ سے تختی لکھواتے تھے۔

سوال: کیا آپ سکول بھی گئے؟

جواب: جی ہاں۔ قریب ہی پرائمری سکول تھا جہاں سے میں نے چار جماعتیں پاس کیں۔ اس کے بعد مجھے گکھڑ کے مدرسہ تجوید القرآن میں داخل کر دیا گیا۔ آپ راہوالی کی گتہ فیکٹری کے بارے میں جانتے ہوں گے۔ اس کے مالک حاجی محمد یوسف سیٹھی نومسلم باپ کے بیٹے تھے۔ انہیں قرآن مجید کی تعلیم سے گہری محبت تھی، وہ مختلف جگہوں پر جاتے اور وہاں کے مقامی لوگوں کو ترغیب دیتے کہ قرآن مجید کے حفظ کا مدرسہ کھولو، استاذ کی آدھی تنخواہ میں دوں گا۔ وہ ایک دفعہ گکھڑ آئے اور نماز جمعہ کے بعد لوگوں کو ترغیب دی جس پر گکھڑ میں مدرسہ قائم ہوگیا۔ پہلے استاذ قاری اعزاز الحقؒ جن کا اس مدرسہ میں تقرر ہوا ان کا تعلق امروہہ سے تھا۔ محمد یوسف سیٹھی صاحب کو قرآن کی تجوید وحفظ سے جو عشق تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ایک دفعہ میں نے ان کے ٹرسٹ کے انچارج ابراہیم خان سے پوچھا کہ آپ کی امداد سے کتنے مدرسے چل رہے ہیں، انہوں نے بتایا کہ پورے ملک میں ایسے گیارہ سو مدرسے چل رہے ہیں۔ بلکہ آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ سعودی عرب میں بھی تجوید اور حفظ کے مدارس کا آغاز سیٹھی صاحب مرحوم ہی نے کیا تھا اس سے پہلے وہاں اس طرز کے مدرسے نہیں ہوتے تھے۔ مسجد الحرام میں تجوید وحفظ کرانے کا پہلے پہل فریضہ قاری خلیل احمد صاحب کے ہاتھوں انجام پایا۔ میری معلومات کی حد تک سیٹھی صاحب کی کوششوں سے جب ایسے مدارس کی تعداد تین سو تک پہنچی تب سے یہ سارا انتظام سعودی حکومت نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ امامِ کعبہ شیخ عبداللہ السبیل بھی قاری خلیل صاحب کے شاگرد بتائے جاتے ہیں۔

سوال: آپ نے گکھڑ ہی سے قرآن مجید حفظ کیا؟

جواب: جی ہاں۔ پہلے پہل کئی اساتذہ آتے رہے لیکن کچھ عرصہ ٹھہر کر وہ چلے جاتے۔ البتہ استاذِ محترم قاری محمد انور صاحبؒ ٹک گئے۔ یوں سمجھیے کہ قرآن کریم از سرِ نو میں نے انہی سے حفظ کیا۔ قاری محمد انور صاحبؒ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے تعلق رکھتے ہیں اور لاہور مدرسہ تجوید القرآن کوچہ کندی گراں میں قاری سید حسن شاہ صاحبؒ سے پڑھے ہوئے ہیں۔ بعد میں سیٹھی صاحب ہی کے نظم کے تحت قاری صاحب پہلے یوگنڈا رہے پھر سعودی عرب چلے گئے۔ اب وہ مدینہ منورہ میں ہیں اور حفظ وتجوید کے ایک معروف استاد ہیں۔ میں جب کبھی جاؤں تو انہی کا مہمان ہوتا ہوں۔ اس سے

بڑی سعادت کیا ہوگی کہ اٹھائیس سال سے مدینہ منورہ میں قرآن مجید کے حفظ کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ انہیں کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ اب ان کی عمر ۸۰ برس کے لگ بھگ ہے۔ میں نے اکتوبر ۱۹۶۰ء میں حفظ مکمل کیا تھا۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ میری زندگی کے اکثر اہم واقعات ماہ اکتوبر میں ہی پیش آئے۔ مثلاً میری پیدائش ۲۸ اکتوبر کی ہے، قرآن کریم کے حفظ کا سلسلہ ۲۰ اکتوبر کو مکمل ہوا، جب میری مدرسہ کی تعلیم مکمل ہوئی تو اکتوبر کا مہینہ تھا، میری شادی ۲۵ اکتوبر کو ہوئی، اکتوبر ۱۹۹۰ء میں میری اکلوتی بیٹی کی شادی ہوئی، اور میں دادا بھی اکتوبر کے مہینے میں بنا۔

سوال: حفظ کے اختتام پر تقریب وغیرہ ہوئی تھی؟

جواب: جی ہاں۔ والد صاحب نے باقاعدہ جلسہ کیا جس میں حضرت مولانا عبداللہ درخواستیؒ تشریف لائے تھے۔ لاہور سے حضرت قاری فضل کریمؒ اور مولانا قاری حسن شاہؒ بھی تشریف لائے تھے، دونوں بڑے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان سب بزرگوں نے مجھے دعاؤں سے نوازا۔ حفظ کی تکمیل کے بعد ایک سال تک والد صاحب نے گھر پر مجھے صرف ونحو کی تعلیم دی۔ پھر میں ۱۹۶۲ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ آیا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک میرا طالب علمی کا دور تھا میں نے اس دوران درسِ نظامی کی تعلیم مکمل کی، ۱۹۶۹ء میں دورۂ حدیث کیا۔

صحافت اور تدریس کا آغاز

سوال: دورِ طالب علمی میں سیاسی ہنگاموں میں بھی حصہ لیا؟

جواب: جی ہاں۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتا رہا۔

سوال: اس دور میں اکثر وہابی سنی کا جھگڑا رہتا تھا، مناظروں میں بھی کبھی گئے؟

جواب: میرا مناظرے کا کبھی ذوق نہیں رہا۔ البتہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں طلباء کی تنظیم سازی کا آغاز کرنے والا میں ہی ہوں۔ والد صاحب کے استاذ اور پھوپھی زاد بھائی مولانا سید فتح علی شاہؒ کے بیٹے سید عطاء اللہ شاہ شیرازی وہیں زیر تعلیم تھے، وہ ہمارے سینئر تھے اور میرے کزن بھی تھے۔

ہم نے مل کر مدرسے کے طلباء کی یونین بنائی۔ شیرازی صاحب صدر بنے جبکہ میں سیکرٹری تھا۔ ہم ہر جمعرات کو اجلاس منعقد کرتے جس میں طلباء کو تقریر کی تربیت دی بھی جاتی تھی۔ اس کے بعد میں جمعیت طلباء اسلام میں شامل ہو گیا۔ یہ ۱۹۶۴ء یا ۱۹۶۵ء کی بات ہے جب میں نے گکھڑ میں ''انجمن نوجوانانِ اسلام'' بنائی جو تین چار برس تک فعال رہی۔ ہم مشاعرے کرتے تھے اور ایک لائبریری بھی قائم کی تھی۔ اس دوران میرا رابطہ بادشاہی مسجد کے خطیب مولانا عبدالرحمان جامیؒ سے بھی رہا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دنوں میں وہ شہری دفاع کے ''علماء وِنگ'' کے چیف وارڈن رہے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا اور جنگ کے دوران میں نے سول رضا کار کے طور پر کئی راتیں پہرے دیے۔ بھارت کے ساتھ ان دنوں رن کچھ کی جھڑپیں شروع ہو چکی تھیں اور جنگ کا خطرہ برابر موجود تھا۔ جس رات کی صبح بھارت نے حملہ کیا اسی رات ہم نے انجمن نوجوانانِ اسلام کا جلسہ کیا جس میں خون اکٹھا کرنے کا پروگرام بنایا۔ البتہ میں نے سب کو توجہ دلائی کہ سول ڈیفنس کی تربیت اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ جنگ کے دوران بھارتی جنگی طیاروں نے گکھڑ ریلوے اسٹیشن پر گولے برسائے جہاں ہمارے ایک دوست صفدر باجوہ شہید ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب میں نے لکھنا شروع کر دیا تھا اور ہفت روزہ ترجمانِ اسلام میں خبریں اور رپورٹیں وغیرہ لکھا کرتا تھا۔

سوال: یوں صحافت کے کوچے میں آنکلے؟

جواب: میری صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز روزنامہ وفاق کی نامہ نگاری سے ہوا۔ جمیل اطہر اس وقت وہاں ایڈیٹر تھے۔ صفدر باجوہ کی شہادت پر میں نے روزنامہ وفاق میں ایک فیچر لکھا اور پھر صحافت کے ساتھ ساتھ سیاست کے کوچے میں بھی آنکلا۔ جمعیت طلباء اسلام میں ایک دو برس کام کرنے کے بعد میں جمعیت علماء اسلام میں شامل ہو گیا جس کا میں گوجرانوالہ ضلع اور ڈویژن تنظیم کا سیکرٹری اطلاعات رہا۔ انہی دنوں روزنامہ کوہستان کے ادارتی صفحہ پر میرا ایک مضمون شائع ہوا جو کہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ یہ ۱۹۶۴ء کا دور تھا، انہی اشغال میں ایک سال بیت گیا، پڑھائی کی طرف توجہ کم ہو گئی جس پر والد صاحب نے میری لاپروائی کا سخت نوٹس لیا اور مجھے گکھڑ لے گئے۔ اس وقت تک مجھے گوجرانوالہ کی ادبی محفلوں میں بیٹھنے کا چسکا پڑ چکا تھا۔ اس زمانے میں یہاں جو اہلِ قلم تھے ان میں اثر لدھیانوی، ارشد میر، بیکس فتح گڑھی، پروفیسر عبداللہ جمال، جناب

افضل سہیل، پروفیسر افتخار احمد ملک، راز کاشمیری، سید سبط الحسن ضیغم، رفیق چودھری، اور راشد بزمی نمایاں تھے۔ اس دور میں ریلوے اسٹیشن کے سامنے واقع خیام ہوٹل میں یہ لوگ بیٹھتے تھے اور وہاں مجلسِ فکر و نظر کے تحت ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔ کوئی صاحب مقالہ پڑھتے، نظم یا غزل پیش کرتے تو اس پر تنقید ہوتی تھی۔ میں نے وہاں آنا جانا شروع کر دیا۔

ایک دفعہ محفل میں پوچھا جا رہا تھا کہ اگلی دفعہ مقالہ کون پڑھے گا؟ کوئی بھی ہامی نہیں بھر رہا تھا۔ کسی نے ایسے ہی مجھ سے پوچھ لیا، آپ پڑھ دیں گے؟ ممکن ہے طنزیہ طور پر ہی پوچھا ہو کیونکہ میری وضع قطع ایک مولوی کی تھی۔ میں نے ہامی بھری تو ساری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ انہوں نے پھر پوچھا، آپ پڑھ دیں گے نا؟ میں نے کہا، سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں ضرور پڑھ دوں گا۔ پوچھنے لگے کیا پڑھیں گے؟ ان دنوں میں نے فلپ کے ہٹی (Phillip Khuri Hitti) کی ''ہسٹری آف دی عربز'' کا ترجمہ پڑھ رکھا تھا جو دہلی سے تازہ تازہ چھپا تھا۔ میں نے اس کے کچھ نوٹس بھی لے رکھے تھے۔ میں نے کہا کہ اس کتاب پر تنقیدی مقالہ پڑھوں گا، پوری مجلس کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کہنے لگے ٹھیک ہے مولوی صاحب۔ چنانچہ میں نے مقالہ لکھا اور وہاں پڑھا، ہٹی کی کتاب میں کوئی پانچ سات واقعاتی غلطیاں تھیں ان کی نشاندہی کی۔ میرا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ہٹی نے اسلام کو بحیثیت تحریک پیش کیا ہے حالانکہ اسلام تحریک نہیں دین ہے۔ اس پر میں نے دلائل دیے کہ تحریک داخلی چیز ہوتی ہے جبکہ دین آسمان سے نازل ہوتا ہے وغیرہ۔ محفل کی صدارت پروفیسر اسرار احمد سہاروی کر رہے تھے اور اسٹیج سیکرٹری ارشد میر صاحب تھے۔ میرا مقالہ بہت پسند کیا گیا اور اس پر بحث ہوئی۔ پھر ارشد میر صاحب سے میری دوستی ہوگئی۔ سید سبط الحسن ضیغم اور افتخار احمد ملک سے بھی دوستانہ تعلق شروع ہوگیا۔

اس کے بعد مجھ سے ایک اور مقالہ لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ افتخار ملک صاحب نے کہا کہ ہم اجتہاد کے بارے میں کنفیوژن کا شکار ہیں، اس پر لکھیں۔ میں نے دو ہفتے کی محنت کے بعد کوئی بتیس فل اسکیپ صفحات پر مشتمل مقالہ وہاں پڑھا۔ مجھے یاد ہے وہاں شیخ ایز د مسعود ایڈووکیٹ بھی تھے، وہ اچھے خاصے دانشور آدمی ہیں۔ افتخار ملک نے مجھ سے وہ مقالہ پڑھنے کے لیے لیا، فوٹو اسٹیٹ کا تب رواج نہ تھا، وہ لے گئے اور کہیں گم ہوگیا۔

سوال: آپ اپنی لکھنے پڑھنے کی سرگرمیاں بتاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ شروع ہی میں آپ کا کتاب کے ساتھ بہت مضبوط تعلق قائم ہوگیا تھا۔

جواب: خدا کا شکر ہے کہ مجھے بچپن ہی سے مطالعہ کرنے کی عادت پڑ گئی۔ والد صاحب بھی تحقیقی ذوق رکھتے ہیں، اب تک ان کی تقریباً چالیس کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ وہ کوئی کتاب لکھ رہے ہوتے تو ان کے گرد کتابیں بکھری ہوتی تھیں۔ کسی کتاب سے حوالہ لینا ہوتا تو پکارتے کہ بیٹا فلاں فلاں الماریوں سے فلاں فلاں کتابیں نکال لاؤ۔ میرا بڑی ہمشیرہ سے مقابلہ ہوتا تھا کہ کون پہلے کتاب ڈھونڈ کرلاتا ہے۔ تب سے کتابوں کے ساتھ میرا تعلق قائم ہے۔

سوال: مطالعے کی خاص فیلڈ کونسی ہے؟

جواب: میرا مطالعہ متنوع قسم کا ہے۔ ناول بھی بہت پڑھے ہیں اور ہر قسم کے پڑھے ہیں۔ ساری ساری رات مطالعہ کیا ہے۔ جلسوں میں بھی جاتا رہا ہوں اور جن حضرات کو بڑے شوق سے سننے جاتا تھا ان میں صاحبزادہ سید فیض الحسنؒ اور مولانا محمد حسین شیخوپوریؒ نمایاں ہیں۔ مولانا شیخوپوری کی تو خیر میں پنجابی سننے جاتا تھا۔ مولانا عبدالرحمان جامیؒ کو بھی بہت سنا ہے اوران سے باقاعدہ رابطہ رہا۔ مولانا جامیؒ کو میں نے شیعہ حضرات کے جلسے میں بھی سنا ہے جہاں وہ واحد مقرر ہوتے تھے جو کئی گھنٹے بولتے تھے۔ مثلاً اس ماحول میں کہ دسویں محرم کی شب ہے، چوک گھنٹہ گھر ہے، ہزاروں کا مجمع ہے، اورصدارت کی کرسی پر مفتی جعفر حسین بیٹھے ہیں۔ مولانا جامیؒ نے گفتگو کا آغاز ان الفاظ سے کیا کہ ''اج میرا دل کردا اے گل اوتھوں شروع کراں جتھوں ٹری سی'' (آج میرا جی چاہتا ہے کہ بات وہاں سے شروع کروں جہاں سے چلی تھی)۔ یہ کہنے کے بعد انہوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت اور مظلومیت بیان کی۔ اس موضوع پر ایسے مجمع میں ایک سنی عالم کا بولنا بہت بڑی بات تھی۔ کوئی بیس منٹ کے بعد پھر کہا کہ ''چلو ہن کربلا ول چلیے'' (چلو اب کربلا کی طرف چلتے ہیں)۔ تو یہ انداز تھا اس وقت مولانا جامیؒ کی تقریر کا۔ اس زمانے میں ایک دوسرے کے خلاف علماء بولتے تھے، لوگ اعتراض کرتے تھے، رقعے بھی لکھے جاتے تھے، لیکن یہ آج والا فسادی قسم کا ماحول نہ تھا۔

سوال: آپ نے دیکھا کہ کبھی حکومت بھی علماء کو باہم

لڑانے کی کوشش کرتی تھی؟

جواب: یہ بھی ہوتا تھا۔ لیکن اس بات کا اندازہ تب نہیں ہوا بلکہ بہت بعد میں ہوا۔ معلوم ہوا کہ ایشوز کھڑے کرنے والے اور لوگ ہوتے ہیں، پھر ان ایشوز پر بات بڑھانے والے اور لوگ ہوتے ہیں۔ یعنی کچھ لوگ اپنے مخصوص مقاصد کے لیے فرقہ وارانہ اختلافات کی آگ بھڑکاتے تھے۔

سوال: آپ کا زندگی بھر تعلق چونکہ دینی حلقے سے رہا ہے، اس لیے پوچھنا چاہوں گا کہ کیا سول انتظامیہ خفیہ طور پر بعض علماء سے رابطہ رکھتی ہے کہ جنہیں وہ اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکے؟

جواب: میرے عملی تجربے میں یہ بات تو نہیں آئی لیکن سنا ضرور ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔ البتہ لوگوں سے کہلواتے ہوں گے۔ مجھے گوجرانوالہ کی مرکزی جامع مسجد میں خطابت کے فرائض ادا کرتے ہوئے ۳۷ سال ہوگئے ہیں، بعض لوگ عقیدت مندی ظاہر کر کے ترغیب دیتے ہیں کہ حضرت فلاں مسئلے پر کچھ کہیے، لیکن میں بھانپ لیتا ہوں کہ کہنے والا کیوں یہ بات کہہ رہا ہے۔

سوال: ارشد میر گوجرانوالہ کی ایک معروف ادبی شخصیت تھے اور وہ رہتے بھی آپ کے ہمسائے میں تھے۔

جواب: جی ہاں، ان سے بہت دوستی رہی، وہ باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ کچہری میں ان کے دفتر میں بھی گپ شپ ہوتی تھی اور مرکزی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد میرے دفتر میں جو مختصر محفل جمتی اس میں وہ کبھی کبھی بیٹھتے تھے۔ ان کے واسطے سے پروفیسر افتخار ملک سے بھی گپ شپ تھی جو بہت پہلے وفات پا گئے تھے۔ راشد بزمی بھی اچھا لکھنے والے تھے۔

سوال: مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں آپ کیسے آئے؟

جواب: مرکزی جامع مسجد شیرانوالہ باغ ۱۳۰۱ھ ہجری میں بنی اور شہر کی قدیم جامع مسجد ہے۔ شروع میں یہاں مولانا سراج الدین مرحوم ہوتے تھے۔ ۱۹۴۴ء سے مولانا مفتی عبد الواحدؒ نے خطابت کے فرائض سرانجام دینا شروع کیے۔ جب وہ تبلیغی جماعت سے منسلک ہوئے تو کبھی کبھار چار ماہ کے لیے دورے پر نکل جاتے جس سے مسجد کا نظام گڑبڑ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ مسجد کی انتظامیہ

نے والد صاحب سے میرے بارے میں بات کی اور میرا یہاں ۱۹۶۹ء میں بطور نائب خطیب تقرر کروالیا۔ اس مسجد کی ایک تاریخ ہے اور یہ ہمیشہ تحریکات کا مرکز رہی ہے۔

سوال: مفتی عبد الواحد صاحب کا کس جماعت سے تعلق تھا؟

جواب: وہ جمعیت علماء اسلام ہی سے تعلق رکھتے تھے، سہال کے رہنے والے تھے جو کہ اٹک اور راولپنڈی کے درمیان کہیں واقع ہے۔ ۱۹۶۹ء میں جب میں یہاں آیا تو ابھی طالب علم تھا، ۱۹۷۰ء میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد پھر یہیں ٹک گیا۔ اسی مسجد کے ساتھ مدرسہ انوار العلوم ہے جہاں میں نے ۱۹۹۰ء تک پڑھایا ہے۔ تدریس کو میں نے مستقلاً کبھی نہیں چھوڑا۔ ۱۹۸۲ء میں جب مفتی عبد الواحد صاحبؒ وفات پا گئے تو میں مستقل خطیب مقرر ہو گیا۔ ویسے تو ان کی موجودگی میں بھی اکثر جمعہ میں ہی پڑھاتا تھا، وہ میرے والد صاحب کے استاذ بھی تھے اور شہر میں ان کی بہت قدر و منزلت تھی۔

عالمی نظام پر نقطۂ نظر

سوال: یہ جو ہمارے ملک میں اسلام اور سوشلزم کی لڑائی کا دور رہا، آج اسے آپ کس طرح سے دیکھتے ہیں؟

جواب: اس لڑائی کا اصل پس منظر یہ ہے کہ ہمارے مغرب اور شمال کی طرف سوویت یونین ایک بڑی طاقت کے طور پر موجود تھا۔ کمیونسٹ چین بھی ہمسائے میں تھا لیکن اس کے عزائم توسیع پسندانہ نہیں تھے۔ جبکہ سوویت یونین نے پہلے مشرقی یورپ میں اور پھر ادھر افغانستان کی طرف پھیلاؤ کی پالیسی اختیار کی۔ اس کے مقابلے میں مغرب کا ایجنڈا یہ تھا کہ یہاں سے کوئی ملک مذہب کی بنیاد پر سوویت یونین کے پھیلاؤ کی مزاحمت کرے۔

سوال: کیا مغرب والوں نے یہاں مذہب کے گہرے اثرات دیکھ کر کمیونزم کو روکنے کے لیے یہ پالیسی اپنائی؟

جواب: مغرب والوں کی یہ سوچ تھی کہ اگر ایشیا میں کمیونزم کو کوئی روک سکتا ہے تو یہ مذہب ہی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ادبی حلقوں کے ذریعے سے وہ کمیونسٹ نظریات کے پھیلاؤ کے خلاف مہم اٹھائے ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ آزادی سے پہلے یہاں ترقی پسند تحریک منظّم ہوئی تھی اور وہ

اشتراکی نظریات پھیلانے کا ایک بڑا ذریعہ بن گئی تھی۔ اہلِ مغرب کی اگر یہ اپروچ تھی کہ کمیونزم کو مذہب کے حوالے سے روکا جا سکتا ہے تو یہ ان کا ایجنڈا تھا، لیکن خود یہ ہماری بھی مجبوری تھی۔ اس لیے کہ روس نے وسط ایشیائی ریاستوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور اب وہ افغانستان میں پاؤں جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ روس نے جو کچھ وہاں کے مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ کیا تھا، وہ ہم یہاں برپا ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس طرح سے گویا سوشلزم کی مخالفت میں ہم ایک ہو گئے تھے۔ مغرب کا اپنا مفاد تھا، ہمارا اپنا مفاد تھا۔ ہم اس صورت سے دوچار نہیں ہونا چاہتے تھے جو صورت وسط ایشیائی ریاستوں پر روس کے غلبے کے بعد بنی تھی۔ یہ فکری محاذ ابتدا میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے سنبھالا تھا۔ ہم جمعیت علماء اسلام والے غیر جانبدار تھے۔

جمعیۃ ۱۹۵۷ء میں ''جمعیت علماء اسلام پاکستان'' کے نام سے دوبارہ باقاعدہ طور پر منظّم ہوئی تھی۔ یہ دراصل جمعیت علماء اسلام ہند کی ہی ایک نئی شکل تھی۔ آزادی سے پہلے ہم نے، جنہیں نیشنلسٹ علماء کہا جاتا تھا، برطانوی استعمار کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے دیکھا کہ اب یہاں امریکہ پاؤں جمانے کی کوشش کر رہا ہے تو ہماری ترجیحات کچھ اس طرح تھیں کہ امریکہ روس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

سوال: آپ نے امریکہ کو زیادہ خطرناک کیوں سمجھا؟

جواب: ہم امریکہ کو اس خطے میں برطانیہ کا جانشین سمجھتے تھے۔ ہم نے برطانیہ کے خلاف ڈیڑھ سو سال تک جنگ لڑی تھی، باقاعدہ مسلح جنگیں بھی لڑیں، قربانیاں دیں، گرفتاریاں دیں، تحریکیں برپا کیں۔ اور مصر کے جمال عبدالناصر سے ہماری قربت بھی اسی وجہ سے تھی کہ ہم عالمی سطح پر امریکہ کو برطانیہ کا جانشین سمجھتے تھے۔ تب دو ہی امکانات تھے کہ امریکہ کی مدد سے روس کے ساتھ لڑائی لڑی جائے، یا پھر روس کی مدد سے امریکہ کے ساتھ لڑائی لڑی جائے۔ لیکن میں اس حوالے سے مولانا مودودیؒ کو کریڈٹ دیتا ہوں کہ انہوں نے کمیونزم کے خلاف ایک بھرپور فکری جنگ لڑی ہے۔ ہم ان کے ساتھ نہیں تھے جس پر ہمیں سوشلسٹ علماء بھی کہا گیا۔ ہم ان کے مقابلہ میں اس وقت بائیں بازو کی تائید کرتے تھے۔ بھٹو کے خلاف جب ۱۱۳ علماء کا فتویٰ آیا۔ مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے کہا ہم نہیں مانتے ایسے فتووں کو۔ جمعیت علماء اسلام نے اس فتوے کو

مسترد کر دیا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ جمال عبد الناصر نیشنلزم کے قائل تھے اور یہ نیشنلزم مغربی استعمار کے مقابلے میں تھا۔ نیشنلزم کے دراصل دو پہلو ہیں۔ ترکی میں نیشنلزم بمقابلہ اسلام تھا، ہم اس کی بات نہیں کرتے تھے۔ عرب نیشنلزم بمقابلہ برطانوی استعمار تھا، ہم اس کی حمایت کرتے تھے۔

سوال: جماعتِ اسلامی جمال عبد الناصر کے نیشنلزم کی مخالف تھی؟

جواب: ایک ہے اصولی موقف کہ ہم نے نیشنلزم کو بطور اصول اور نظریے کے نہیں بلکہ بطور حکمتِ عملی کے لیا۔ متحدہ ہندوستان میں بھی ہم نے نیشنلزم کے تحت آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ اگر مسلمان اور ہندو اکٹھے نہ ہوتے تو وہ یہ جنگ نہ جیت سکتے تھے۔ اگر پہلے ہی باہم لڑ پڑتے تو آزادی کی تحریک آگے بڑھ ہی نہ سکتی۔ ہم نے مذہب کے مقابلے میں نیشنلزم کو کبھی سپورٹ نہیں کیا۔ لیکن نیشنلزم کے نام پر جب استعمار کے خلاف جنگ لڑی گئی ہے تو ہم اس کے سپورٹر رہے ہیں۔ اور یہ تب تک لڑی گئی جب تک افغانستان میں روس نہیں آیا۔ جب تک روس افغانستان کی سرحدوں سے باہر رہا ہماری پوزیشن وہ رہی۔ جبکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ جب روس افغانستان میں آکر بیٹھا تو پھر ہم بھی اسی کیمپ میں چلے گئے۔

سوال: روس افغانستان میں آیا تو آپ کو اس کیمپ میں آنا پڑا جس میں مولانا مودودیؒ تھے؟

جواب: جہادِ افغانستان کو ان سے زیادہ ہم نے سپورٹ کیا ہے۔ مجھے وہ مکالمہ یاد ہے جو ولی خان اور مولانا مفتی محمودؒ کے درمیان ہوا تھا۔ جب افغانستان میں روس کے آنے کے بعد فتویٰ جاری ہوا کہ روس کے خلاف لڑنا جہاد ہے تو ان دنوں مولانا عبد اللہ درخواستیؒ نے سرحد کا طوفانی دورہ کیا تھا۔ ساری قبائلی پٹی میں مولانا کے معتقدین کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ مولانا مفتی محمودؒ نے جگہ جگہ تقریریں کیں۔ جناب ولی خان نے اعتراض کیا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں، جو کچھ کر رہے ہیں غلط کر رہے ہیں کہ یہ تو امریکہ کی جنگ ہے۔ جواب میں مولانا مفتی محمودؒ نے دو باتیں کہیں، یہ غالباً مردان کے جلسے کی بات ہے۔ مفتی صاحب نے ایک بات یہ کہی کہ یہ جنگ افغانستان کی نہیں بلکہ ہم پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ روس اس سے آگے پاکستان آنا چاہتا ہے کہ اسے گرم پانیوں تک رسائی درکار ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب ہم پر برطانوی استعمار نے قبضہ کیا اور ہم نے یہاں

سے ہجرت کی تو افغانستان ہمارا بیس کیمپ بنا تھا، افغانستان والوں نے ہمیں دھکے نہیں دیے تھے۔ آج ان پر بپتا آئی ہے اور وہ ہمارے پاس آئے ہیں تو ہم ان سے بے وفائی نہیں کریں گے۔ مفتی صاحب نے جناب ولی خان سے کہا کہ تم پٹھان ہو، پٹھانی روایات کو تو قائم رکھو۔ بحیثیت مسلمان ہم آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یوں ہم بھی اس کیمپ میں چلے گئے۔

سوال: اس زمانے میں بائیں بازو کا کہنا یہ تھا کہ روس سے اصل خطرہ ہمارے جاگیرداروں، سرمایہ داروں، اور اسٹیبلشمنٹ کو ہے۔

جواب: خطرے ان کی طرف بھی تھے لیکن ہمیں تو ازبکستان کی ویران مسجدیں نظر آ رہی تھیں کہ مسجدوں کو تالے لگے ہوئے تھے، وہ منظر بھی ہمارے سامنے ہی تھا۔ ہم بھی پہلے یہ باتیں نہیں مانا کرتے تھے، اب جو یہ پردہ اٹھا ہے تو بہت کچھ سامنے آیا ہے۔ میں ۱۹۹۰ء کے عشرے میں خود تاشقند گیا ہوں اور وہاں جو ماحول میں نے دیکھا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ میں نے سمرقند، تاشقند کے شہر خود دیکھے ہیں۔ میں وہاں وفد کے ساتھ گیا تھا۔ تاشقند کے جس مدرسے میں ہم ٹھہرے وہ چالیس سال تک سیمنٹ کا گودام بنا رہا۔ سمرقند کی مرکزی جامع مسجد جہاں ہم ایک رات رہے وہ پچاس سال تک سینما ہال بنی رہی۔ ہم جانتے تھے کہ افغانستان میں روس کے آ جانے سے خطرات تاجروں کو بھی ہیں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو بھی ہیں، لیکن ہم نے روسی قبضے میں جانے والے مدرسوں اور مسجدوں کا جو حال دیکھا تھا اسے بھی ہم بھلا تو نہیں سکتے تھے۔ خطرات سب کے لیے تھے کہ روس اگر یہاں آ گیا تو کیا ہوگا؟

سوال: آپ نے ان ریاستوں کے جو مسلمان دیکھے وہ کس طرح کے تھے؟

جواب: اصل بات یہ ہے کہ وسطِ ایشیا میں روس کے آنے سے دیندار مسلمان زیرِ زمین چلے گئے تھے۔ میں تاشقند اور سمرقند دونوں جگہ گیا۔ میرے ساتھ مفتی محمد جمیل شہید، مولانا فداء الرحمٰن درخواستی، اور مفتی نظام الدین شامزئی شہید بھی تھے۔ وہاں ایک مدرسہ میں ہم استاد ذاکر جان سے ملے، بہت فصیح عربی بولتے تھے۔ مجھے تعجب ہوا، میں نے سوچا کہ ایک زمانے میں ان کے تعلقات جمال عبد الناصر سے رہے ہیں ممکن ہے وہاں جا کر پڑھتے رہے ہوں۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے

کہ مدرسوں کا قیام غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔ وہ ہمیں اپنے مکان کے پچھلے حصے میں لے گئے جہاں باغیچہ تھا۔ اس باغیچے میں بیس پچیس فٹ زیرزمین ایک غارنما کمرے میں لے گئے اور بتایا کہ ہم یہاں رات کو بارہ سے دو بجے تک قرآن مجید پڑھتے تھے۔ ہم نے یہیں درسِ نظامی کا کورس پڑھا تھا۔ اس قسم کے زیرزمین مدرسے آپ کو تاشقند میں بہت ملیں گے۔ داڑھیاں غائب ہوگئی تھیں۔ ہمارا ایک اندازہ تھا کہ وسط ایشیا کی یہ ریاستیں آزاد ہوئی ہیں تو ان کا سب سے بڑا تقاضا کیا ہوگا۔ ہم اس لیے گئے تھے کہ وہ لوگ ہم سے مسجدوں کے لیے امام اور حافظ وغیرہ مانگیں گے۔ لیکن کہیں سے بھی یہ مطالبہ سامنے نہیں آیا۔ ان کے پاس امام بھی تھے، خطیب بھی تھے۔ البتہ ان کا مطالبہ تھا کہ ہمیں قرآن مجید بھیجو کیونکہ یہاں قرآن کریم رکھنا قانونی طور پر جرم رہا ہے۔ چنانچہ سعودی عرب اور مصر کے علاوہ ہماری تنظیم مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت نے بھی بہت بڑی تعداد میں وہاں قرآن مجید بھجوائے اور میں انہی کے وفد میں وہاں گیا تھا۔

ایک واقعہ سے آپ حیران ہوں گے کہ امام بخاریؒ کا مزار خرتنگ میں ہے جو کہ سمرقند سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم وہاں فاتحہ پڑھ کر پلٹ رہے تھے، ہمارے پاس ایک بڑی ویگن تھی۔ اچانک ایک بڑھیا ہماری ویگن کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ کانپ رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی ''مصحف شریف، مصحف شریف''۔ ہم نے ترجمان سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے؟ اس نے بتایا کہ اسے کہیں سے خبر ملی ہے کہ آپ لوگ قرآن مجید بانٹ رہے ہیں۔ ہم متذبذب تھے کہ ہمارے پاس قرآن کریم محدود تعداد میں تھے۔ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ فلاں فلاں مدرسے میں قرآن مجید دینے ہیں۔ ہم نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ بضد تھی۔ آخر ہم نے ایک نسخہ دیا تو وہ اسے سینہ سے لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ کہنے لگی کہ ستر سال بعد قرآن مجید کی زیارت نصیب ہوئی ہے، بچپن میں نانی کے ہاتھ میں دیکھا کرتی تھی، حسرت سے سوچا کرتی تھی کہ دوبارہ کبھی زیارت ہوگی یا نہیں۔

دیکھیں، امریکہ روس کے خلاف مزاحمت کرنا چاہتا تھا، لیکن ہمارے اپنے مقاصد تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ نتائج امریکہ سمیٹ کر لے گیا کہ وہ طاقتور تھا اور ہم کمزور تھے۔ ہمارے مقامی اونچے طبقوں نے بھی مفادات حاصل کیے۔ رہے ہم، تو ہم اسی کیفیت میں ہیں۔ افغانی بے

چارے کل روسی فوجوں سے لڑتے رہے، آج امریکیوں سے نبرد آزما ہیں۔ فرق کچھ نہیں پڑا۔

سوال: آپ کے کالموں میں بیرونی دنیا کا بہت ذکر ملتا ہے، لگتا ہے آپ نے بہت دنیا دیکھی ہے۔

جواب: جن ممالک میں اب تک تبلیغی، تعلیمی اور مطالعاتی حوالے سے گیا ہوں وہ ہیں: سعودی عرب، مصر، متحدہ عرب امارات، ترکی، بنگلہ دیش، بھارت، ازبکستان، ایران، افغانستان، کینیا، امریکہ، کینیڈا، برطانیہ وغیرہ شامل ہیں۔ کینیا کے ایک سفر میں مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے ساتھ بھی شامل رہا ہوں۔

قومی سیاست اور تحریکات میں کردار

سوال: یہ ضیاء الحق سے تعاون کا فیصلہ کیسے ہوا تھا یعنی جب اتحاد والے وزارتوں میں گئے۔ حالانکہ مولانا شاہ احمد نورانی، شیر باز مزاری، اور اصغر خان وغیرہ راضی نہیں تھے۔ کیا ان سیاسی رہنماؤں کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ مارشل لاء حکومت میں اصل اختیارات تو جرنیلوں کے پاس ہوتے ہیں، یہ تعاون کرنے والے کیا حاصل کریں گے؟

جواب: اس حوالے سے بات کرنا ایک خطرناک مرحلہ ہے لیکن میں اس پر بات کروں گا۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک سیاسی ورکر کے طور پر اس وقت بھی میری سوچ یہی تھی اور آج بھی ہے کہ ہم نے ضیاء الحق کے مارشل لاء کو قبول کر کے غلطی کی تھی۔ بھٹو نے لاہور میں مارشل لاء لگوایا تھا تو Withdraw ہو گیا تھا۔ اگر ہم اکٹھے رہتے اور جدوجہد جاری رکھتے تو ضیاء الحق کبھی مارشل لاء کو طول نہ دے سکتا اور انہیں واپس جانا پڑتا۔ میں نے جمعیۃ کی شوریٰ میں یہ رائے بھی دی تھی۔ میں یہ بات بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ قومی اتحاد کا مارشل لاء کو قبول کرنا صحیح نہیں تھا۔ میری رائے تھی کہ ہم ایک دو مہینے مزید قربانیاں دے کر مارشل لاء سے جان چھڑا لیں، لیکن اتحاد نے وہ مارشل لاء قبول کر لیا۔

قومی اتحاد جب وزارتوں میں گیا تو ان دنوں راولپنڈی میں جمعیۃ کی شوریٰ کا اجلاس تھا جس میں مفتی محمود صاحبؒ بھی موجود تھے۔ وہاں میرے اور مولانا قاضی عبداللطیف صاحب کے درمیان

طویل مکالمہ ہوا۔ وہ بھی مرکزی ناظم تھے اور میں بھی مرکزی ناظم تھا۔ میرا موقف یہ تھا کہ ہمیں وزارتوں میں نہیں جانا چاہیے جبکہ قاضی صاحب جانے کے حق میں تھے۔ یوں سمجھیے کہ اچھا خاصا مناظرہ ہوا ہمارے درمیان۔ شوریٰ والے اور مفتی صاحب ہمیں دیکھے جا رہے تھے اور ہم اپنے اپنے موقف کے حق میں دلائل دے رہے تھے۔

سوال: آپ نے دلیل کیا دی؟

جواب: میں نے دو باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ ہم مارشل لاء حکومت کا حصہ نہ بنیں۔ مارشل لاء لگ گیا ہے، ہم اسے روک تو نہ سکے لیکن اس کا حصہ بننا درست نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ لوگ ہمیں کچھ نہیں کرنے دیں گے، خواہ مخواہ کی بدنامی ہوگی اور رسوائی اٹھائیں گے۔ شوریٰ نے مجموعی طور پر وزارتوں میں جانا طے کرلیا تو میں نے مفتی صاحب سے کہا کہ اس فیصلے کے ساتھ میرا اختلافی نوٹ درج کیا جائے۔ مفتی صاحب نے کہا، ٹھیک ہے یہ آپ کا حق ہے۔ چنانچہ اس فیصلے پر میرا اختلافی نوٹ شوریٰ کی کارروائی میں موجود ہے۔

میرے نزدیک پاکستان کی تاریخ میں دو ایسے مرحلے آئے جب رخ بدل سکتا تھا لیکن دونوں مرحلوں پر ہم سے غلطی ہوئی:

(۱) ایک جب سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بقیہ پاکستان پر ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت قائم ہوئی، اس وقت بھٹو صاحب اتنی سیاسی طاقت رکھتے تھے کہ وہ سول بیوروکریسی اور ملٹری بیوروکریسی کو لگام ڈال سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر بھٹو صاحب اسٹیبلشمنٹ کے ہتھے نہ چڑھ جاتے تو یہاں سیاسی عمل پوری آزادی سے رواں دواں رہتا۔ لیکن بدقسمتی سے اسٹیبلشمنٹ نے بھٹو کو شکار کرلیا۔ مولانا مفتی محمود اور خان عبدالولی خان کے ساتھ بھٹو کا جو سہ فریقی معاہدہ ہوا تھا سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں کے حوالے سے، میرے نزدیک پاکستان کی تاریخ میں اس سے بہتر معاہدہ اور اس سے بہتر ٹیم نہیں آسکتی۔ میں ایک سیاسی ورکر کے طور پر سوچتا تھا کہ بھٹو، ولی اور مفتی صاحب کی صورت میں ایسی ذہین اور محبِّ وطن ٹیم آگئی ہے کہ جو ملک کو ایک نئے رخ پر ڈال سکتی ہے، لیکن اسٹیبلشمنٹ نے بھٹو کو گھیرے میں لے لیا۔

(۲) دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر پاکستان قومی اتحاد ضیاء الحق کے مارشل لاء کو قبول نہ کرتا یا کم از کم وزارتوں میں شریک نہ ہوتا بلکہ مقابلے میں اسٹینڈ لیتا تو پھر بھی جلد ملٹری رجیم سے نجات حاصل کی جا سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

سوال: بعد میں مفتی صاحب کو احساس ہوا اس بات کا؟

جواب: جی ہاں بعد میں احساس ہو گیا تھا مفتی صاحب کو۔ انہوں نے وزارتوں سے نکلنے کے بعد سیاسی جماعتوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ وہ ابھی اس کام میں مصروف ہی تھے کہ وفات پا گئے۔

سوال: پھر ایم آر ڈی کی تحریک چل پڑی؟

جواب: اس کی ابتدا مفتی صاحب ہی نے کی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ''قومی اتحاد'' سے پہلے ''متحدہ جمہوری محاذ'' بنا تھا جس کے پیر پگاڑا صاحب صدر تھے۔ تب میں محاذ کا پنجاب کا نائب صدر تھا۔ جب قومی اتحاد بنا تو میں پنجاب کونسل میں تھا، حمزہ صاحب صدر تھے، اور پیر اشرف جنرل سیکرٹری تھے۔

سوال: آپ اس ساری جدوجہد میں شامل رہے ہیں، آپ بتائیں کہ کیا شروع میں یہ طے تھا کہ اتحاد نظامِ مصطفیٰ کے لیے بنایا جا رہا ہے، یا بعد میں یہ نعرہ اختیار کیا گیا؟ کیونکہ اتحاد میں ولی خان ایسے سیکولر مزاج رہنما بھی موجود تھے۔

جواب: پہلے میں اپنی پوزیشن واضح کر دوں کہ جب قومی اتحاد بنا تو میں پنجاب کے پارلیمانی بورڈ میں جمعیۃ کا نمائندہ تھا۔ مرکز کی دستور کمیٹی میں بھی جمعیۃ کا نمائندہ تھا اور میں منشور بنانے والوں میں شامل تھا۔ ایم انور بار ایٹ لاء اس کمیٹی کے صدر تھے اور ان کے ساتھ سیدہ عابدہ حسین اور ظہور الحسن بھوپالی مرحوم تھے۔

بات یہ ہے کہ تحریک تو شروع ہوئی تھی دھاندلیوں کے خلاف لیکن اس سے پہلے جس منشور پر قومی اتحاد الیکشن لڑ چکا تھا اس میں نظامِ مصطفیٰ کا باقاعدہ پروگرام شامل تھا بلکہ اسی نعرہ پر الیکشن لڑا گیا تھا اور سب پارٹیوں نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔

سوال: کسی پارٹی نے اعتراض نہیں کیا؟

جواب: بنیادی مخالفت نہیں ہوئی، رجحان یہ تھا کہ ہم اس کے بغیر نہیں چل سکیں گے۔ اگرچہ تحریک جو چلی تھی وہ دھاندلیوں کے خلاف تھی۔ اس میں نظامِ مصطفیٰ کا جو نعرہ لگا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اتحاد اسی نعرے کی بنیاد پر الیکشن لڑ چکا تھا۔ تب میں پنجاب کا نائب صدر تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب تحریک کے عین درمیان میں رفیق احمد باجوہ صاحب نے بھٹو صاحب سے خفیہ ملاقات کی تو انہیں جنرل سیکرٹری کے عہدے سے ہٹا دیا گیا، اس پروگرام میں پیر اشرف صاحب بھی ان کے ساتھ تھے چنانچہ انہیں بھی ہٹا دیا گیا۔

سوال: جماعت میں رہتے ہوئے بھی وہ کچھ مشکوک تو ہوچکے ہوئے تھے؟

جواب: بہرحال وہ جماعت ہی کی طرف سے قومی اتحاد پنجاب کے جنرل سیکرٹری بنے تھے۔ لیکن باجوہ صاحب کو بھٹو سے ملاقات کے نتیجے میں ان کے ساتھ پیر صاحب کو بھی اتحاد سے فارغ کر دیا گیا تو مجھے پنجاب کا جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔ اتحاد کی پنجاب ٹیم میں میرے ساتھ اکبر ساقی، اقبال احمد خان، علامہ احسان الٰہی ظہیر، اور مولانا فتح محمد تھے، تحریکِ استقلال کے معین الدین بھی تھے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان کے دفتر میں ہمارا دفتر ہوتا۔ ہفتہ کے دوران دو تین روز وہاں جانا ہوتا تھا بلکہ تحریک کے دوران تو میں وہیں رہتا تھا۔ اس دوران نوابزادہ صاحب سے بے تکلفی ہوگئی اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔ میں نے جن تین شخصیتوں سے سیاست سیکھی ہے وہ ہیں مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا مفتی محمودؒ، اور نوابزادہ نصر اللہ خان۔ نوابزادہ صاحب عابد شب زندہ دار تھے، پانچ وقت کے نمازی تھے، عقیدے کے مضبوط تھے۔ آدمی کسی کے قریب آ کر یا تو بھاگ جاتا ہے یا پھر اور قریب ہو جاتا ہے۔ میں قریب ہونے والوں میں ہوں اور ان کی کئی باتوں سے متاثر ہوا ہوں۔

سوال: نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب کی کونسی خوبی زیادہ پسند آئی؟ وہ بہت محتاط تھے، پریس کانفرنس ہو یا جلسہ عام ہو بہت کھلتے نہیں تھے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: وہ جو بات ایک دفعہ طے کر لیتے تھے تو پھر اِدھر اُدھر نہیں ہوتے تھے اور کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کونسی بات کہنی ہے اور کونسی نہیں، ان میں ایک اچھے

سیاستدان والی خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں اور موجودہ بحران میں تو وہ بہت یاد آتے ہیں۔

پی این اے کی جو مرکزی کونسل گرفتار ہوئی تھی اس میں اکبر ساقی بھی تھے اور میں بھی تھا۔ لاہور میں قومی اتحاد کی مرکزی کونسل کے اجلاس کے دوران ہمیں گھیرا ڈال کر گرفتار کر لیا گیا تھا۔ محمود علی قصوری مرحوم تھے، جماعتِ اسلامی کے عبد الوحید خان تھے، اتفاق سے رانا نذر الرحمان، حمزہ صاحب اور میں پنڈی سے آ رہے تھے۔ جبکہ والد صاحب مولانا سرفراز خان صفدر اس سے پہلے گوجرانوالہ سے گرفتار ہو چکے تھے اور وہ ایک ماہ جیل میں رہے۔ والد صاحب کے ساتھ تو یہ ہوا کہ ان دنوں بھٹو صاحب نے نیم فوجی تنظیم فیڈرل سیکیورٹی فورس بنا رکھی تھی جس سے وہ تحریک کو روک رہے تھے۔ گکھڑ میں جمعہ کی نماز کے بعد جلوس نکلا کرتا تھا جس کی قیادت والد صاحب کیا کرتے تھے۔ ایف ایس ایف کے کمانڈر نے جلوس کے سامنے سڑک پر لکیر کھینچ دی کہ جو اسے عبور کرے گا اسے گولی مار دی جائے گی۔ والد صاحب یہ کہہ کر اس لکیر کو عبور کر گئے کہ مسنون عمر پوری کر چکا ہوں، اب شہادت کی تمنا ہے، مل جائے تو خوش قسمتی ہوگی۔ مدینہ والے میرے استاذ قاری محمد انور صاحبؒ بھی وہاں موجود تھے، جے یو پی (جمعیت علماء پاکستان) کے سید احمد ڈار بھی تھے، وہ بھی عبور کر گئے۔ ایف ایس ایف کے کمانڈر حیران پریشان رہ گئے۔ ہم پنڈی سے آ رہے تھے، گکھڑ پہنچے تو میں نے رانا نذر الرحمان سے کہا کہ یار گاڑی روکو میں والد صاحب کا پتہ کر لوں کہ جیل میں ہیں یا باہر۔ والد صاحب ایک دن پہلے رہا ہوئے تھے اور دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ شام کو قومی اتحاد کی مرکزی کونسل کی میٹنگ تھی۔ حمزہ صاحب مجھے ڈیوس روڈ پر یہ کہہ کر اتار گئے کہ آپ چلیں ہم دس منٹ میں آتے ہیں۔ میں اندر گیا تو مجھے گرفتار کر لیا گیا جبکہ یہ لوگ بچ گئے۔

میں قومی اتحاد کے پارلیمانی بورڈ میں بھی رہا ہوں۔ پیر پگاڑا صاحب سے بھی مجھے کچھ عقیدت تھی۔ میں جو ''راشدی'' کہلاتا ہوں تو اس کی وجہ پیر صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ تھے شاہ محمد راشدؒ، ان کی نسبت سے کہلاتا ہوں۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، دین پور کی گدی، اور امروٹ شریف کی گدی سب ان سے وابستہ ہیں۔ اسی نسبت سے ہم راشدی کہلاتے ہیں۔ جب ہم لاہور ٹھہرے ہوئے تھے تو ایک دن میں نے بات چھیڑ دی کہ میں بھی راشدی ہوں۔ پیر صاحب نے سنی اَن سنی کر دی۔ میں نے تو ایسے ہی اظہار کیا تھا کہ مجھے آپ کے بڑوں سے ایک

نسبت ہے، عقیدت ہے۔ جب دیکھا کہ انہیں میری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو میں بھی خاموش ہوگیا۔

ایک دفعہ ایک تلخ تجربہ بھی ہوا کہ رمضان کا مہینہ تھا لیکن پارلیمانی بورڈ کی میٹنگ میں پیر صاحب سگار پیتے رہے۔ ظہور الحسن بھوپالی مرحوم سے میری کافی انڈرسٹینڈنگ تھی، وہ جے یو پی کے تھے اور میں جے یو آئی کا تھا۔ جہاں کوئی مسئلہ ہوتا ہم باہم صلاح مشورہ کر کے ایک رائے بنا لیتے، کبھی مولانا فتح محمد صاحب کو بھی ملا لیتے۔ پیر صاحب کی سگار نوشی پر ہم نے طے کیا کہ بات کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک دن ہم نے کہہ ہی دیا کہ پیر صاحب! رمضان میں آپ کا سگار پینا افسوسناک ہے۔ کہنے لگے، چھوڑو۔ گویا سنی اَن سنی کر دی اور کوئی توجہ نہ دی۔ آخر ہم نے مفتی صاحب سے کہا کہ یہ افسوسناک امر ہے کہ رمضان المبارک میں پارلیمانی بورڈ کا اجلاس ہو رہا ہوتا ہے اور بورڈ کے چیئرمین صاحب سگار پینا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے کہنے سے صرف اتنا فرق پڑا کہ میٹنگ دن کی بجائے رات کو ہونے لگی۔ بہرحال اس دور کی سیاست میں میرا ایک متحرک کردار رہا ہے۔

سوال: آپ کتنا عرصہ گرفتار رہے؟

جواب: پہلی دفعہ تو میں ۱۹۷۵ء میں گرفتار ہوا تھا۔ گوجرانوالہ میں جمعیت علماء اسلام کا آل پاکستان کنونشن ہوا تھا جس میں ہم نے پرائیویٹ شرعی عدالتوں کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ اس پر حکومت نے جمعیۃ کی پوری قیادت پر مقدمات بنائے تھے۔ اکتیس علماء پر مقدمے بنے تھے۔ پارٹی نے فیصلہ کر لیا کہ ہم ضمانتیں نہیں کروائیں گے، قبل از گرفتاری ضمانت نہ کروانے کا فیصلہ تھا۔ میں دو ہفتے گرفتار رہا پھر میری ضمانت ہوگئی۔ دوسری دفعہ میں ۱۹۷۶ء میں گرفتار ہوا تھا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر کے ساتھ مسجد نور میں یہ کنونشن ہوا تھا جس میں ملک بھر سے پانچ ہزار علماء نے شرکت کی تھی۔ گوجرانوالہ سے ایک صاحب رانا محمد اقبال اوقاف اور جیل خانہ جات کے وزیر تھے۔ ان ہی دنوں محکمہ اوقاف نے اس مسجد اور مدرسہ کو اپنی تحویل میں لینے کا اعلان کر دیا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم کے متعلق نوٹیفیکیشن جاری ہوگیا۔ اس میں مدرسہ کا نام نہیں لیا گیا تھا بلکہ لکھا تھا کہ مسجد نور مع ملحقہ پینتالیس کمروں کے۔ اس وقت نوید انور نوید گوجرانوالہ کے نوجوان وکیل تھے۔ ہم نے مزاحمت

کرنے کا فیصلہ کیا اور احتجاجی تحریک شروع کر دی۔ ساڑھے چار مہینے لگاتار ہم نے تحریک چلائی، ڈیڑھ پونے دوسو ورکر گرفتار ہوئے، میں خود بھی تین مہینے جیل میں رہا، نوید انور نوید مرحوم بھی جیل میں رہے۔

سوال: اس مہم میں دوسرے مکاتبِ فکر نے بھی ساتھ دیا؟

جواب: بالکل دیا۔ خواجہ وارث شیعہ رہنما تھے وہ بھی ہماری تحریک میں شامل رہے۔ ہماری مسجد میں جلسہ ہو رہا تھا، رانا اقبال کے خلاف قرارداد پیش کی گئی تو خواجہ صاحب نے اٹھ کر کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ ہوں، پھر وہ گرفتار بھی ہوئے۔

سوال: اس کے بعد کب گرفتار ہوئے؟

جواب: میں تیسری بار قومی اتحاد کی تحریک میں گرفتار ہوا تھا۔ آرمی ایکٹ کے تحت ہم پر کیس چلا۔ لیفٹیننٹ کرنل نصیر احمد تھے، لاہور کیمپ جیل میں عدالت لگتی تھی۔ وہاں کچھ دلچسپ باتیں ہوئیں۔ ایک تو یہ ہوا کہ میاں محمود علی قصوری ہمارے ساتھ قید بھی تھے اور سمری کورٹ میں ہمارے وکیل بھی تھے۔ ایم انور بار ایٹ لاء ہماری سپورٹ کے لیے آتے تھے لیکن کورٹ میں ہماری طرف سے قصوری صاحب ہی پیش ہوتے تھے۔ قصوری صاحب کی آواز بہت بھاری تھی، وہ جب بولتے تو کرنل صاحب میز بجانے لگتے اور ساتھ کہتے کہ آہستہ بولو، عدالت میں بول رہے ہو۔ Contempt Of Court (توہین عدالت کی دفعہ) لگ جائے گی۔ قصوری صاحب آواز دھیمی کرنے کی کوشش تو کرتے لیکن پھر بھی اونچی رہتی۔ دو تین دفعہ کرنل صاحب لال پیلے ہوئے کہ ان کے حکم کی تعمیل نہیں ہو رہی۔ اس پر ایم انور صاحب نے آگے بڑھ کر کہا کہ جناب یہ آہستہ ہی بول رہے ہیں، آپ کی توہین نہیں کر رہے۔ ان کا لہجہ ہی اس طرح کا ہے۔

دوسرا واقعہ کافی خوفناک تھا۔ ہوا یہ کہ پولیس انسپکٹر وہاں پیش تھا اور اس پر جرح ہو رہی تھی کہ کب گرفتار کیا، کہاں سے گرفتار کیا، روزنامچے میں کیا لکھا وغیرہ وغیرہ۔ اس نے کہا کہ یہ بات روزنامچے میں لکھی ہوئی ہے۔ ہمارے وکیل نے اعتراض کیا کہ روزنامچے میں اگر یہ لکھا گیا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ درست بھی ہو۔ اس پر انسپکٹر کے منہ سے نکل گیا کہ ہمارے لیے تو یہ قرآن کی طرح ہی ہے۔ یہ سن کر ہماری طرف سے ایک نوجوان کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا کہ یہ کیا بکواس کر

رہا ہے۔ کرنل نے بات گول کرنے کی کوشش کی، کچھ اپنی کرنیلی کا رعب بھی دکھانا چاہا۔ لیکن نوجوان نے کہا کہ چھوڑیں، کرنل ہوں گے آپ۔ میں قرآن مجید کی یہ توہین برداشت نہیں کرسکتا۔ مولانا محمد اجمل خان مرحوم بھی ہمارے ساتھ تھے، وہ اٹھ کھڑے ہوئے، انہوں نے ایسی خطابت دکھائی کہ کرنل کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہاں موجود چند نوجوان عالمِ دیوانگی میں دیواروں سے سر ٹکرانے لگے کہ یہ انسپکٹر روزنامچے کو قرآن کہہ کر کتنی بڑی توہین کر رہا ہے۔ اس کے بعد عدالت ایسی برخاست ہوئی کہ پھر نہیں بیٹھی۔ ادھر عدالت عالیہ کے جسٹس زکی الدین پال نے مارشل لاء کو غیر قانونی قرار دے دیا، مارشل لاء ودڈرا ہو گیا اور ہم بھی رہا ہو گئے۔

میری رہائی کا واقعہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ عدالتِ عالیہ میں مجھے پیش کیا گیا تو عدالت نے مجھے بری کر دیا۔ اس پر ڈی ایس پی نے یہ کہہ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا کہ ان کے خلاف اور کیس بھی ہیں۔ جیسا کہ مجھے یاد ہے ایک کیس وزیر آباد کا تھا، ایک گکھڑ کا تھا، ایک گوجرانوالہ کا تھا، اور توڑ پھوڑ کے دو کیس تھے۔ جسٹس نے ڈی ایس پی سے پوچھا، تعمیل ہو گئی ہے؟ کہا، ہو گئی ہے جیل میں۔ جسٹس صاحب نے ڈی ایس پی کو حکم دیا کہ آپ یہاں کھڑے رہیں۔ اور مجھے کہا کہ آپ جائیں۔ میں ہائی کورٹ سے نکلا تو جیل میں اپنا سامان لینے نہیں گیا۔ رکشہ پکڑا اور بادامی باغ کا رخ کیا، بس پر بیٹھا اور سیدھا گکھڑ جا پہنچا۔ میرا سامان دو تین روز بعد مولانا امجد خان لے کر آئے۔ مارشل لاء تک تو کہانی یہی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں ایک مرتبہ دفعہ ۱۴۴ توڑنے پر سرگودھا میں گرفتار ہوا تھا لیکن چند گھنٹوں بعد رہا کر دیا گیا۔

بات ہو رہی تھی کہ مفتی محمود صاحبؒ اپنی زندگی کے آخری حصے میں کسی نہ کسی طرح فوجی حکومت سے نجات پانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قومی اتحاد اور پیپلز پارٹی اکٹھے مل کر ضیاء الحق کا سامنا کریں۔ اس کے لیے گفتگو جاری تھی، کئی اجلاس ہوئے، شیرانوالہ میں بھی ایک میٹنگ ہوئی۔ کراچی کے شیخ حنیف صاحب کے واسطے سے بیگم نصرت بھٹو سے بات چیت چل رہی تھی۔ مفتی صاحب ان ایام میں اتنے غصے میں تھے کہ انہوں نے کھلم کھلا ضیاء الحق کو قادیانی کہنا شروع کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق کے خلاف پوری تقریر کیا کرتے تھے۔ میں نے ایک دن کہا کہ حضرت وہ قادیانی ہے یا منافق، آخر لائے تو ہم ہی ہیں۔ کراچی میں ایک دفعہ جلسہ تھا، مفتی

صاحب سے پہلے مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی نے تقریر کی، تقریر کے دوران انہوں نے ضیاء الحق کو قادیانی نواز کہا۔ مفتی صاحب پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، فوراً بولے کہ سیدھا قادیانی کہو، قادیانی نواز کیا ہوتا ہے۔ مولانا چنیوٹی نے کہا کہ میں تو قادیانی نہیں کہتا کہ وہ قادیانی نہیں ہے۔ مفتی صاحب پھر گرجے کہ کہنا پڑے گا، آخر میں یہی کہو گے۔ یعنی وہ اس حد تک غصے میں تھے ان دنوں۔

سوال: جب قومی اتحاد نے وزارتیں جوائن کیں تو سننے میں آیا کہ وزارتوں کے سیکرٹریوں نے ان وزیروں کا باہر آکر استقبال نہ کیا، اس پر اچھا خاصا جھگڑا بھی ہوا؟

جواب: بہت کچھ ہوا، لمبی داستان ہے۔ جمعیۃ کے تین وزیر تھے۔ میر صبح صادق کھوسو، حاجی فقیر محمد خان، اور حاجی زمان خان اچکزئی۔ کھوسو وزیر صحت تھے، اچکزئی وزیر بلدیات تھے، اور حاجی فقیر محمد خان قبائلی امور اور کشمیر کے وزیر تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں قبائلی علاقے میں آپریشن ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے ایک دوست مولانا نور محمد وہاں جیل میں تھے۔ میں نے ایک دن حاجی فقیر محمد خان سے کہا کہ آپ کے پاس قبائلی امور کی وزارت ہے، ہمارے دوست مولانا نور محمد جیل میں ہیں، انہیں رہا کروانا چاہیے۔ اسی طرح ان دنوں بلوچستان کے گورنر صاحب قادیانی تھے۔ میں نے مفتی صاحب سے کہا کہ عجیب بات ہے کہ ہم لوگ وزارتوں میں ہوں اور بلوچستان کا گورنر قادیانی ہو، آپ نے ضیاء الحق سے بات نہیں کی؟ مفتی صاحب نے جواب دیا، کئی دفعہ کی ہے، وہ سنتا ہی نہیں۔

ایک دفعہ میں حاجی فقیر محمد خان کے گھر ٹھہرا ہوا تھا، ہم دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ صبح ناشتہ کر رہے تھے کہ ٹیلی ویژن سے خبر نشر ہوئی کہ سردار عبد القیوم کو آزاد کشمیر کی صدارت سے برطرف کر کے ان کی جگہ بریگیڈیئر محمد حیات کو ایڈمنسٹریٹر تعینات کر دیا گیا ہے۔ میں نے حاجی صاحب سے پوچھا کیا یہ واقعہ رات کو آپ کے علم میں نہیں تھا؟ کہنے لگے خدا کی قسم میں تو آپ کے ساتھ ہی یہ خبر سن رہا ہوں، مجھے پہلے سے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ یعنی یہ حال تھا ان وزیروں کا کہ ان کی وزارت کے معاملات سے بھی انہیں بے خبر رکھا جاتا۔

سوال: علماء نے پاکستان کی ہر بڑی تحریک میں بھرپور حصہ لیا ہے، چاہے وہ دستور سازی کی تحریک تھی،

بحالئ جمہوریت کی تحریک تھی، یا اینٹی قادیانی تحریک تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا کہ کیا فرق پڑا؟ حالات تو روز بروز بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ علماء نے آخر کیا کامیابیاں حاصل کیں اتنی زیادہ بھاگ دوڑ کے بعد؟

جواب: دیکھیے دو تین باتیں ہیں۔ یہ سوال کیا تھا میں نے حضرت مفتی محمودؒ سے۔ حیدرآباد کے ایک جلسے میں ہم اکٹھے تھے، نصف شب کے قریب واپس کراچی پہنچے۔ شیخ محمد حنیف چنیوٹی صاحب مفتی صاحب کے میزبان ہوتے تھے۔ میں نے مفتی صاحب سے کہا کہ ہم ۱۹۵۷ء سے انتخابی سیاست میں ہیں، اس سیاست کے فائدے کیا ہیں اور نقصانات کیا ہیں، کبھی اس پر بیٹھ کر غور نہ کرلیا جائے؟ مفتی صاحب نے پوچھا، تم کیا سوچتے ہو؟ میں نے جواب دیا، میں فائدے کم اور نقصانات زیادہ دیکھ رہا ہوں۔ کہنے لگے، ہاں اس پر بات کرنی چاہیے۔ میں نے پوچھا، کب؟ اس وقت مفتی صاحب ضیاء الحق کے خلاف تحریک اٹھانے کے موڈ میں تھے۔ داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے، ایک دفعہ اس سے نپٹ لینے دو، پھر سوچ لیں گے اس بات پر۔

ایک اور بات مفتی صاحب کے حوالے سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ ایک دفعہ راولپنڈی میں جامعہ اسلامیہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت اکرام الحق شیخ نوائے وقت راولپنڈی کے رپورٹر ہوتے تھے، وہ مفتی صاحب سے ملنے آگئے۔ شیخ صاحب نے پوچھا، مفتی صاحب جب تک علماء کی خالص حکومت نہ یہاں آجائے، کیا اسلام کے نفاذ کی توقع ہوسکتی ہے؟ یعنی حکومت میں شراکت نہ ہو اور آپ اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہوں، کیا ایسی حکومت کے بغیر اسلام نافذ ہوسکتا ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا، نہیں۔ شیخ صاحب نے پوچھا، کیا آپ انتخابی سیاست کے ذریعے علماء کو آگے لا سکتے ہیں؟ مفتی صاحب نے جواب دیا، نہیں۔ شیخ صاحب نے پوچھا، پھر آپ کیا کر رہے ہیں؟ مفتی صاحب نے جواب دیا، بات یہ ہے کہ ہم اس پوزیشن میں تو نہیں کہ ہم حکومت بنا سکیں، لیکن اس پوزیشن میں ضرور ہیں کہ کسی کو آرام سے حکومت نہ کرنے دیں، اور یہ کام ہم کر رہے ہیں۔

ہمایوں صاحب! آپ نے پوچھا ہے کہ علماء کو سیاست سے کیا ملا؟ میں اس بارے میں یہ کہوں گا کہ انتخابی سیاست سے ہمارے مقاصد پورے نہیں ہوئے، لیکن ایک بات ہے کہ انتخابی سیاست

میں حصہ لینے سے اور اسمبلیوں میں بیٹھنے سے بہت سی باتوں میں ہم رکاوٹ ضرور بنے ہیں۔ مثلاً قادیانی مسئلہ اگر اسمبلی میں نہ جاتا تو کبھی حل نہ ہوتا۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلامی دفعات نہ ہوتیں اگر علماء اسمبلیوں میں نہ ہوتے۔ ضیاء الحق کے دور میں دستور میں جو ترامیم کا سلسلہ شروع ہوا، جو کہ اب تک چلا آرہا ہے، اگر علماء اسمبلیوں میں نہ ہوتے تو یہ اسلامی دفعات بھی باقی نہ رہتیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہم کچھ کر نہیں پا رہے لیکن بہت سے غلط کاموں کے راستے میں رکاوٹ ضرور بنے ہیں۔

میں عملی سیاست میں ۱۹۶۲ء میں آیا تھا اور ۱۹۹۰ء تک مسلسل متحرک رہا۔ ہماری اصل کمزوری یہ ہے کہ ہماری سیاست نعرے بازی کی ہے، ہوم ورک کی نہیں ہے۔ یہ ہوم ورک نہ نظریاتی ہے اور نہ سیاسی۔ دینی جماعتیں اب بھی دس گنا زیادہ پیشرفت کر سکتی ہیں اگر یہ معروضی سیاست اور نظریاتی سیاست میں تھوڑا سا بیلنس قائم رکھیں۔ دوسرا یہ کہ ہوم ورک کریں، نظریاتی بھی اور سیاسی بھی۔

سوال: جمعیت علماء اسلام میں دھڑے بندی ہوتی رہی ہے، اس بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: ۱۹۸۰ء میں مولانا مفتی محمودؒ کے انتقال کے بعد جمعیت علماء اسلام دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک گروپ حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ کے ساتھ تھا جو کہ ’’درخواستی گروپ‘‘ کہلاتا تھا۔ جبکہ دوسرا گروپ مولانا فضل الرحمٰن کے ساتھ تھا جو ’’فضل الرحمٰن گروپ‘‘ کے نام سے موسوم تھا۔ فضل الرحمٰن گروپ ضیاء الحق مرحوم کے خلاف بننے والے سیاسی اتحاد ایم آر ڈی میں شامل ہو گیا تھا مگر درخواستی گروپ نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

سوال: آپ لوگوں کا کیا موقف تھا؟

جواب: نوابزادہ نصر اللہ خان نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح پوری جمعیۃ ایم آر ڈی کا حصہ بن جائے لیکن ہم مسلسل انکار کرتے چلے جا رہے تھے۔ نواب صاحب نے مجھے بلایا اور مخالفت کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا، کچھ ڈیڑھ سال پہلے تو ہم نے پیپلز پارٹی کے خلاف تحریک چلائی تھی، قربانیاں دی تھیں، جیلیں کاٹی تھیں، گولیاں کھائی تھیں، اب جو ہم کارکنوں کو آواز دیں تو انہیں کیا کہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ ضیاء الحق کے خلاف تحریک چلانے کے نتیجے میں اگر نورانی صاحب آگے

آجائیں، آپ آجائیں، بلکہ نوستاروں میں سے کوئی ایک بھی آجائے تو میں حاضر ہوں۔ لیکن اگر نصرت بھٹو آگے آتی ہیں تو ہمارے لیے مشکل ہوگا۔ آپ میرے بزرگ ہیں، آپ ہی بتائیں اس تحریک کے نتیجے میں کیا ہوگا؟

میں اس دھڑے بندی میں مولانا درخواستیؒ کے ساتھ تھا اور درخواستی گروپ کا متحرک کردار تھا۔ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ، حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ، حضرت مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ۱۹۹۰ء میں دونوں گروپوں میں اتحاد ہوا جس کے تحت حضرت مولانا عبد اللہ درخواستیؒ کو متحدہ جمعیت علماء اسلام کا امیر اور مولانا فضل الرحمٰن کو سیکرٹری جنرل چنا گیا، جبکہ مجھے سیکرٹری اطلاعات منتخب کیا گیا۔ مگر حضرت مولانا سمیع الحق نے اس اتحاد کو تسلیم نہ کرتے ہوئے ''سمیع الحق گروپ'' کے نام سے جمعیت علماء اسلام کا ایک الگ گروپ قائم کرلیا۔

سوال: اوپر فوج سارے اختیارات سنبھالے بیٹھی ہو اور نیچے سیاسی جماعتیں شریکِ اقتدار ہو جائیں تو آخر اس عمل کی کیا افادیت ہو سکتی ہے؟

جواب: میں یہ نہیں کہتا کہ معروضی سیاست چھوڑ دیں، سوال صرف بیلنس قائم رکھنے کا ہے۔ نظریاتی سیاست چلی گئی ہے اور صرف معروضی سیاست رہ گئی ہے۔ ہمارے پاس آخر قوت کونسی تھی؟ ایک اسٹریٹ پاور تھی جو ہم نے کھودی ہے۔ اسٹریٹ پاور پر ہماری گرفت نہیں رہی۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہفتہ وار رسالہ ترجمانِ اسلام میں اعلان آتا تھا کہ فلاں مسئلے پر فلاں تاریخ کو ہماری جماعت مظاہرہ کرے گی۔ اس اعلان پر کم از کم پچاس ساٹھ شہروں میں مظاہرے ہو جاتے تھے۔ اب ہم چیختے چلاتے رہتے ہیں لیکن سوائے ہمارے دینی مدرسوں کے طالب علموں کے اور کوئی نہیں آتا۔ غضب تو یہ ہے کہ ہم اس تبدیلی کا تجزیہ کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ آخر ہم نے اسٹریٹ پاور کیوں کھودی ہے، اس کے اسباب کیا ہیں؟

سوال: آخر یہ کیا سیاست ہے کہ دینی جماعتیں بار بار استعفیٰ دینے کی بات کرتی ہیں لیکن دیتی نہیں۔ عوام کیا سوچتے ہوں گے کہ دینی جماعتوں کا یہ کیا انداز سیاست ہے؟

جواب: افسوسناک بات ہے۔ جب یہ آئے روز استعفوں کی بات چل رہی تھی تو میں نے کہا

تھا کہ مفتی صاحب کو صوبہ سرحد کی وزارتِ اعلیٰ اور ارباب سکندر کو گورنری چھوڑتے ہوئے پندرہ منٹ لگے تھے۔ اس وقت جب بھٹو نے بلوچستان میں جمعیت علماء اسلام اور نیشنل عوامی پارٹی کی مشترکہ حکومت کو برطرف کیا تھا، سردار عطاء اللہ مینگل کو وزارتِ اعلیٰ سے اور غوث بخش بزنجو کو گورنری سے ہٹایا تھا تو پندرہ بیس منٹ بعد مفتی صاحب اور ارباب سکندر کے استعفے بھٹو کی میز پر تھے۔ بھٹو صاحب نے مفتی صاحب کو بلا کر رام کرنا چاہا لیکن انہوں نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے ساتھ کی پارٹی کو آپ نکال دیں اور میں کرسی سے چمٹا رہوں، یہ اصول کے خلاف ہے۔

اب کی سیاست دیکھیں کہ مہینے گزر گئے لیکن فیصلہ نہیں ہو پایا کہ استعفے دینے ہیں یا نہیں۔ یہ ہے نظریاتی اور معروضی سیاست کا قصہ۔ مفتی صاحب کو ایک ہفتہ بعد تک بھی بھٹو صاحب سمجھاتے رہے کہ مفتی صاحب! چھوڑیں کیا کرتے ہیں، آپ کو کون چھیڑتا ہے، آپ وزارت سنبھالے رکھیں۔ مفتی صاحب کا ایک ہی جواب تھا کہ میں یہ بے اصولی نہیں کرسکتا، میرا نیشنل عوامی پارٹی سے معاہدہ ہے، اگر آپ بلاوجہ اس کو فارغ کرتے ہیں تو میں کیوں اندر رہوں؟

علمی وفکری اور تعلیمی ونظریاتی جدوجہد

سوال: سیاست سے کیوں رشتہ توڑ لیا؟

جواب: ۱۹۹۰ء میں جمعیت علماء اسلام پاکستان کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات کے منصب سے مستعفی ہوکر میں نے انتخابی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور اعلان کیا تھا کہ جمعیت علماء اسلام کا ''غیر فعال'' ممبر رہوں گا مگر اقتدار کی سیاست اور انتخابی عمل میں حصہ دار نہیں بنوں گا۔ البتہ نفاذِ اسلام کے حوالے سے فکری اور علمی محاذ پر بدستور سرگرم عمل رہوں گا۔ اس مقصد کے لیے حضرت مولانا فداء الرحمٰن درخواستی، حضرت مولانا منظور احمدؒ چنیوٹی، اور دیگر حضرات کے ساتھ مل کر ''پاکستان شریعت کونسل'' کے نام سے ایک فورم تشکیل دے رکھا ہے جس پر ہم اقتدار اور الیکشن کی سیاست سے الگ تھلگ رہتے ہوئے اسلامائزیشن کے لیے نظریاتی اور فکری نوعیت کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ جبکہ انتخابی سیاست میں ہم کسی بھی جماعت کی حمایت کے لیے آزاد ہیں، البتہ اس کے لیے پاکستان شریعت کونسل کا فورم استعمال نہیں کرتے۔ پاکستان شریعت کونسل

کے امیر مولانا فداء الرحمٰن درخواستی ہیں اور میں اس کا سیکرٹری جنرل ہوں۔کونسل کا ہیڈ آفس جامعہ انوار القرآن، آدم ٹاؤن، نارتھ کراچی میں ہے۔ پنجاب شریعت کونسل کے امیر میرے چھوٹے بھائی مولانا عبدالحق خان بشیر جبکہ سیکرٹری جنرل مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر ہیں اور پنجاب کا ہیڈ آفس جامع مسجد امن، باغبانپورہ، لاہور میں ہے۔

میں نے اکتوبر ۱۹۸۹ء میں گوجرانوالہ سے ماہنامہ الشریعہ کا اجرا کیا جو مسلسل شائع ہو رہا ہے، میں اس کا چیف ایڈیٹر ہوں۔ جبکہ میرا بڑا بیٹا مولانا حافظ محمد عمار خان ناصر ایڈیٹر ہے۔عمار خان ناصر نے درسِ نظامی میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے فراغت حاصل کی، وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے ''الشہادۃ العالمیہ'' کا فاضل ہے، اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انگلش ہے۔ مدرسہ نصرۃ العلوم میں کم وبیش دس سال تک درسِ نظامی کی تدریس کی ہے،اب میرے ساتھ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر اور ماہنامہ الشریعہ کے ایڈیٹر کے طور پر فرائض سرانجام دے رہا ہے۔

سوال: آغا شورش کاشمیری سے بھی تو ملاقاتیں رہی ہوں گی؟

جواب: جی ہاں، بہت دفعہ۔ میں نے انہیں سب سے پہلے گوجرانوالہ میں دیکھا تھا۔ میاں افتخار الدین وفات پا گئے تھے، ان کی یاد میں جلسہ تھا جس میں مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ اور شیخ حسام الدین بھی شریک ہوئے۔ ایوب خان کا آئین آ چکا تھا اور سیاسی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس جلسے کی دو باتیں اب تک ذہن پر نقش ہیں۔ ایک تو یہ کہ آغا صاحب نے تقریر کے شروع میں ایک جملہ کہا تھا جو مجھے یاد رہ گیا۔ کہنے لگے، ''صدر ایوب چار سال صدر بنے بیٹھے رہے اور ہم صبرِ ایوب بنے بیٹھے رہے۔''

آغا صاحب سے پہلے شیخ حسام الدین تقریر کر چکے تھے، انہوں نے گوجرانوالہ کے ڈی سی شیخ اکرام کا ذکر کیا تھا کہ اس نے شیخ صاحب کو بلاوجہ دفتر سے باہر لمبا انتظار کرایا تھا۔ آغا صاحب نے پہلے تو کہا کہ ڈی سی صاحب اچھے دوست ہیں، حسام الدین صاحب کو خواہ مخواہ شکایت پیدا ہو گئی ہے ان سے۔ بس اس کے بعد پھر آغا صاحب کی تقریر غیظ وغضب میں ڈوب گئی، آزادی کی تحریک

کے رہنماؤں کے ساتھ سول بیوروکریسی کے نامناسب رویوں کے حوالے سے آغا صاحب برستے چلے گئے۔

سوال: یہ بتائیں کہ مشرف حکومت ہاتھ دھو کر دینی مدرسوں کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے؟

جواب: جہادِ افغانستان کے بارے میں مغرب کو ایک بڑی غلط فہمی تھی، ان کا خیال تھا کہ یہ مجاہدین ہماری وجہ سے لڑ رہے ہیں، جنگ ختم ہوگئی تو ہم انہیں فارغ کر دیں گے۔ مغرب کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ ہمارے لیے کام کر رہے ہیں جب ہم پیچھے ہٹ جائیں گے تو یہ خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ مغرب اپنی جنگ لڑ رہا تھا، یہ اپنی جنگ لڑ رہے تھے۔ افغانستان سے روس نکل گیا تو امریکہ نے مڈل ایسٹ میں محاذ کھول لیا۔ سوال یہ تھا کہ کل افغانستان میں روس کا آنا غلط تھا تو آج امریکہ کا عراق پر قبضہ کرنے کا کیا جواز ہے؟ یہ لوگ اکڑ گئے کہ ٹھیک ہے ہماری تربیت امریکہ نے کی ہے، اسامہ بن لادن امریکہ کے ساتھ مل کر لڑ رہا تھا، لیکن امریکہ کے لیے نہیں لڑ رہا تھا بلکہ یہ اس کی اپنی جنگ تھی۔ چنانچہ ہوا یہ کہ جب روس ہٹا تو انہوں نے امریکہ سے کہا کہ تم بھی ہٹو، اس پر امریکہ سے تصادم ہو گیا۔ اس کے بعد امریکہ کو اندازہ ہوا کہ یہ تو اپنی جنگ لڑ رہے ہیں اور اس پر ڈٹے ہوئے بھی ہیں۔ طالبان بھی کھڑے ہیں، اسامہ بھی کھڑا ہے اور یہ ہمارے مقابلے پر ہیں۔

افغانستان کے جہاد سے پہلے اور بعد کی صورتحال آپ دیکھ لیں۔ دنیا بھر میں مسلمان جہاں کہیں بھی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے انہیں جہادِ افغانستان سے حوصلہ ملا، تقویت لی۔ مثلاً کشمیر میں مسلمان لڑ رہا تھا، الجزائر میں بھی نبرد آزما تھا، فلسطین میں بھی جنگ جاری تھی، اریٹریا میں بھی برسر پیکار تھا۔ بوسنیا میں آخر کون لڑا ہے؟ چنانچہ افغانستان کی جنگ کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ جہاد پھیل گیا اور چیچنیا و فلپائن تک بھی اس کے اثرات پہنچ گئے۔ جب مغرب نے دیکھا کہ یہ جنگ ساری دنیا میں پھیل رہی ہے تو اس پر مغرب نے تجزیہ کیا کہ اس کا بیس کیمپ کہاں ہے؟ مغرب اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس ساری مہم جوئی کی بنیاد دینی مدرسہ ہے اور یہ اس کی فکری تربیت ہے جس نے جہاد کے نظریے کو زندہ رکھا ہوا ہے۔

برطانیہ سے شائع ہونے والے ''دی انڈیپینڈنٹ'' اخبار میں کوئی دس سال قبل ایک تفصیلی رپورٹ چھپی تھی جس کے لکھنے والے نے لکھا کہ ''شر'' کے اصل مراکز جنوبی ایشیا کے دینی مدارس ہیں، اوران میں بھی خاص طور پر دیوبندی مدارس۔ اس رپورٹ پر دو تصویریں شائع کی گئی تھیں۔ ایک دارالعلوم دیوبند کی اور دوسری بستی نظام الدین دہلی کے تبلیغی مرکز کی۔ ان دنوں برمنگھم میں ختم نبوت کی سالانہ کانفرنس ہو رہی تھی، خاصا بڑا اجتماع تھا، لوگ پریشان تھے کہ ہمارے خلاف بہت خطرناک رپورٹ چھپی ہے۔ میں نے وہاں یہ کہا تھا کہ آپ لوگ اسے چارج شیٹ سمجھ کر پریشان ہو رہے ہیں جبکہ میں اسے کریڈٹ سمجھ رہا ہوں اور خوش ہو رہا ہوں اور ''دی انڈیپینڈنٹ'' کا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔ یہ تو تاریخ کا اعتراف ہے، مغرب کو محسوس ہو گیا ہے کہ اس کے سامنے کون کھڑا ہے۔

مغرب اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اس ساری فکری لہر کا منبع مدرسہ ہے، لیکن وہ اس مسئلہ پر ایک ڈنڈی مار رہے ہیں۔ وہاں اس مسئلہ پر ایک مذاکرہ ہوا، میں نے اس میں کہا کہ مغرب یہ کہتا ہے کہ یہ مدارس جہاد پڑھاتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہم بخاری کی کتاب الجہاد بھی پڑھاتے ہیں، ترمذی کی بھی کتاب الجہاد پڑھاتے ہیں، مغازی بھی پڑھاتے ہیں، اور قرآن کریم کی جہاد والی آیات بھی پڑھاتے ہیں۔ لیکن مغرب یہ نہیں بتاتا کہ جہاد پڑھاتے تو یہ مدارس ہیں مگر سکھایا امریکہ نے ہے۔ وہ اپنے رول کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ ہمیں بالکل انکار نہیں کہ ہم جہاد پڑھاتے ہیں، ہم تو یہ پڑھاتے رہے ہیں اور پڑھاتے رہیں گے۔ لیکن اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جدید اسلحے کی ٹریننگ امریکہ نے دی ہے۔ اسامہ بن لادن کو کمانڈو ٹریننگ کس نے دی اور مجاہدین کو کس نے تربیت دی؟ دنیا بھر میں جہاد کے نام سے جو لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں، یہ اگر مدارس نے پڑھائی ہیں تو سکھائی امریکہ نے ہیں۔ اگر یہ جرم ہے تو پھر ہم برابر کے شریک ہیں۔ اگر امریکہ کے نزدیک افغانستان پر روس کا قبضہ ناجائز تھا تو اسے یہ اصول تسلیم کرتے ہوئے مسلم ممالک سے نکل جانا چاہیے، اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

سوال: آپ بیرون ملک جاتے رہتے ہیں، سننے میں آتا ہے کہ یورپی لوگ اسلام کی طرف آرہے ہیں، حقیقت کیا ہے؟ کیا واقعی وہ اس تعداد میں مسلمان ہو رہے ہیں جو اکثر بتائی

جاتی ہے؟

جواب: خیر اتنی تعداد کے ساتھ تو لوگ مسلمان نہیں ہو رہے، ہم ایسے ہی خوش فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن بہت سے افراد مسلمان ہو رہے ہیں۔ میں ابھی ماہ شعبان میں امریکہ میں تھا، رمضان شروع ہونے سے ایک ہفتہ قبل نیویارک اسٹیٹ کے ایک پولیس آفیسر نے پریس کانفرنس کر کے اسلام قبول کیا۔ ہم نے وہ پریس کانفرنس ماہنامہ الشریعہ میں بھی شائع کی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہے، یہ زندگی کے عملی معاملات میں بہت اچھی رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ تعصب سے ہٹ کر سنجیدگی کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔

سوال: مطلب یہ ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ غور و فکر کرتا ہے تو اس میں سے کچھ لوگ اسلام کی طرف آجاتے ہیں۔

جواب: ہمارا ایک پلیٹ فارم ہے ''ورلڈ اسلامک فورم'' کے نام سے۔ ۱۹۹۲ء میں لندن میں اس کا آغاز ہوا، میں ہی اس کا بانی ہوں۔ میرے ساتھ بھارت کے مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور مولانا مفتی برکت اللہ ہیں۔ ابھی کل ہی آسٹریلیا سے طارق گیلانی صاحب آئے ہوئے تھے، وہ بھی اس فورم میں ہیں۔ ڈربن، جنوبی افریقہ سے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے فرزند ڈاکٹر سلمان ندوی ہیں۔ لکھنؤ سے مولانا سلیمان ندوی ہیں۔ پاکستان سے ڈاکٹر محمود احمد غازی ہیں۔ یہ ہمارا فکری حلقہ ہے، ہم سال میں ایک آدھ دفعہ اکٹھے ہوتے ہیں، لکھنے پڑھنے کا کام آپس میں تقسیم کرتے ہیں۔

ایک بات میں نے یہ محسوس کی ہے کہ دینی حلقوں کے خلاف مغرب والے جو کچھ کر سکتے ہیں، اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں؟ اس کے باوجود ان کو محسوس ہو رہا ہے کہ دینی حلقوں کی کمٹمنٹ میں کمی نہیں آئی۔ دوسری بات یہ ہے اس کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ مغرب کے ایکشن کا ری ایکشن ہو رہا ہے۔ پڑھے لکھے حلقوں میں بھی ہو رہا ہے اور وہ سوچنے لگے ہیں کہ اصل بات کیا ہے۔ میں نے رمضان المبارک کا پہلا عشرہ واشنگٹن ڈی سی کے علاقہ میں گزارا ہے۔ وہاں کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے لوگ بھی یہ سوچ رہے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یہ مدرسہ کیا کر رہا ہے؟ میں نے کہا کہ میں اس مسئلے پر بات کرنے پر تیار ہوں لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ ترجمان میری مرضی کا ہوگا کہ

میں انگریزی بول سمجھ نہیں سکتا۔ طے ہوا کہ اگلے دورے میں گفتگو ہوگی، کم از کم دو دن درکار ہوں گے اس کے لیے، میں نے ہامی بھرلی۔

میں نے کہا، آپ نے جو فیصلہ کیا تھا کہ مذہب کا سوسائٹی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، ہم اس کو غلط سمجھتے ہیں۔ ہم نے اپنے ہاں یہ تعلق ٹوٹنے نہیں دیا اور آپ کے ہاں بھی اسے دوبارہ جوڑنے کی کوشش کررہے ہیں۔ مدرسے کا ایجنڈا یہ ہے کہ مغرب نے جو مذہب کو عملی زندگی سے اور مختلف اداروں سے نکال دیا ہے، ہم اپنی سوسائٹی میں ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ آپ حکومتوں کو کنٹرول کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تعلق ٹوٹ گیا ہے۔ حکومتوں کا مذہب سے تعلق ٹوٹنے سے سوسائٹی کا تعلق نہیں ٹوٹا۔ میں نے کہا کہ آپ فقط حکومتوں کا، حکمرانوں کا تعلق مذہب سے توڑنے میں کامیاب ہوئے ہیں، سوسائٹی کا تعلق مذہب سے نہیں ٹوٹا بلکہ پہلے سے مضبوط ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں اس حوالے سے کام ہورہا ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے مذہب سے مکمل لاتعلقی اختیار کر کے غلطی کی تھی۔

سوال: مغربی عورت کا بھی ادھر رجحان ہے؟

جواب: رجحان ہورہا ہے لیکن اس میں ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم صحیح اپروچ کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔ میں اس کی ایک مثال دوں گا۔ لیسٹر، برطانیہ میں ایک ادارہ ہے اسلامک فاؤنڈیشن کے نام سے جس کے سربراہ پروفیسر خورشید احمد ہیں۔ بہت اچھا ادارہ ہے اور میں وہاں جاتا رہتا ہوں۔ وہاں ایک مذاکرہ ہوا جس میں برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر جم مارشل نے ایک فکر انگیز بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کی بات سننے کو تیار ہیں، سننا چاہتے ہیں، لیکن ایک کنفیوژن ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کی تین الگ الگ تصویریں ہمارے سامنے آتی ہیں:

(۱) ایک تو وہ تصویر ہے جو ہمارے بڑوں نے پیش کی تھی۔

(۲) دوسری تصویر وہ ہے جو ہم اسلام کے بنیادی ذرائع سے حاصل کرتے ہیں۔

(۳) لیکن آج کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو ایک تیسری تصویر بن جاتی ہے۔

جب تک آپ اس کنفیوژن کو حل نہیں کرتے آپ کی بات نہیں سنی جائے گی۔ مغرب آپ کی بات سننے کے لیے بالکل تیار ہے لیکن پہلے یہ گیپ دور کریں۔

سوال: وہاں کا خالص مذہبی طبقہ کیا سوچ رکھتا ہے، ان سے بھی مکالمہ ہوا؟

جواب: جی ہاں، یہ بات بھی میرے دوروں کا حصہ ہوتی ہے۔ مثلاً نوٹنگھم کے لارڈ پادری صاحب سے میں تین چار سال قبل ایک وفد کے ساتھ ملا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے معاشرے میں یہ جو بدکاری عام ہے، سود ہے، خاندانی نظام ٹوٹ گیا ہے، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کہنے لگے، یہ بہت غلط ہو رہا ہے۔ میں نے پوچھا، کوئی حل سوچا آپ نے؟ کہنے لگے کہ ہمارے پاس کوئی حل نہیں ہے، ہم تو آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ہم اس سوسائٹی کو اب واپس نہیں لا سکتے، وہ چمک جو اس سوسائٹی کو درکار ہے وہ ہمیں آپ کی آنکھوں میں دکھائی دیتی ہے، ہم اس سے محروم ہو چکے ہیں۔ چنانچہ یہ احساس پیدا ہو رہا ہے لیکن ہماری رکاوٹ یہ ہے کہ ہم وہاں بھی یہ جنگ نہیں لڑ رہے بلکہ آپس کی جنگیں لڑ رہے ہیں۔

سوال: یہ جو ہم کبھی کبھی مسجدوں پر قبضے والی بات سنتے ہیں تو کیا یہ سلسلہ اب بھی ہے؟

جواب: اب کم ہوتا جا رہا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ حکومتوں کو اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جو بڑی بڑی یونیورسٹیاں ہیں، وہاں اس حوالے سے کوئی کام نہیں ہو رہا۔ اور ہمارے جو دینی حلقے وہاں جاتے ہیں تو وہ اس ادراک ہی سے تہی ہیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ کام کرنے والے اکا دکا لوگ ہیں مگر انفرادی سطح کی کوششیں کوئی بڑا نتیجہ نہیں پیدا کرتیں۔

سوال: دینی حلقوں سے حکومت کا یہ جو ٹکراؤ ہوا ہے تو یہ بات تکرار کے ساتھ کہی گئی کہ ہمارے علماء کو بدلتے ہوئے حالات کا ادراک کر لینا چاہیے۔ کم از کم مدرسوں کا نصاب ہی بدل لیں۔ آپ کا کیا خیال ہے، کیا اس امر کی ضرورت ہے؟ اور یہ کہ کیا علماء نے ادھر توجہ دی ہے یا وہ ضرورت ہی نہیں سمجھتے تبدیلی کی؟

جواب: اصل میں تبدیلی کے دو الگ الگ ایجنڈے ہیں:

(۱) ایک سوچ یہ ہے کہ دینی مدارس کا الگ تشخص ختم کر دیا جائے اور معاشرے کے عام تعلیمی نظام میں انہیں ضم کر دیا جائے۔ یہ بات مدارس کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ اس لیے کہ مدرسہ کا مقصد دین کی تعلیم دینا ہے اور وہ اسی کی تعلیم دے گا۔ اگر انجینئرنگ کالج

انجینئرنگ کی تعلیم دیتا ہے، میڈیکل کالج میڈیکل کی تعلیم دیتا ہے، اور لاء کالج صرف لاء پڑھاتا ہے تو دینی مدرسے کا یہ حق ہے کہ وہ صرف دین پڑھائے۔

(۲) دوسرا ایجنڈا یہ ہے کہ دینی مدارس آج کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اپنے آپ کو زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے اپنے نصاب کی اصلاح کریں، معاصر ضروریات کو شامل کریں، اور آج کے چیلنجز کے مقابلے کے لیے اپنے آپ کو تیار کریں۔ اس کے ہم خود مدعی ہیں، میں ۲۵ سال سے خود یہ جنگ لڑ رہا ہوں۔

سوال: آپ کو کتنی کامیابی ہوئی ہے اس میں؟

جواب: اتنی کامیابی ہوئی ہے کہ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ ہم بے وقوف لوگ ہیں۔ مگر اب ہماری باتیں سنی جاتی ہیں اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہماری رہنمائی کریں۔ اس کی میں ایک چھوٹی سی مثال دوں گا۔ ہم باتیں کیا کرتے تھے کہ نصاب میں تبدیلی لاؤ تو کہتے تھے کہ یار کیا باتیں کرتے ہو؟ لیکن الحمد للہ وفاق المدارس نے تخصصات کے نصاب (Specializations) کی ازسرِ نو تشکیل کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی ہے میں اس کا چیئرمین ہوں اور اپنا کام کر رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے تنہا یہ جنگ لڑی ہے، بلکہ جن لوگوں نے اس سلسلہ میں کوشش جاری رکھی میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ البتہ ہم نے اس دوران یہ پیشِ نظر رکھا ہے اور مدارس سے یہ کہا ہے کہ ہم آپ کی جنگ لڑ رہے ہیں، آپ سے جنگ نہیں لڑ رہے۔ چنانچہ مدارس ہم پر اعتماد کر رہے ہیں اور جدوجہد کے ثمرات اب سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔

سوال: اسلام کا مستقبل آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟

جواب: جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا کہ مغرب اخلاقی انارکی کا اس حد تک شکار ہے کہ اسے مذہب کی طرف پلٹنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا۔ اس کا خاندانی سسٹم تباہ ہو چکا ہے، بدکاری بہت عام ہے، مادہ پرستی نے انہیں روحانی سکون سے محروم کر دیا ہے، اب وہ مذہب کی طرف آنا چاہتے ہیں لیکن مذہب اصل حالت میں تو صرف اسلام کے پاس ہی ہے۔ اصل مذہب نہ ہندومت کے پاس ہے، نہ یہودیت اور عیسائیت کے پاس ہے۔ اصل مذہب اسلام ہے اور یہ آپ کو مدرسوں سے ملے گا۔

نوٹنگھم میں ایک لیکچر کے دوران میں نے مغرب سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ لوگ سمجھدار ہیں اور بہت دور کی سوچ رکھتے ہیں۔ آپ کی اعلیٰ درسگاہوں میں بحث ہو رہی ہے کہ کیا آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی کا کوئی راستہ ہے؟ شہزادہ چارلس کے خطبات میں سے ایک خطبہ ہم نے ماہنامہ الشریعہ میں بھی شائع کیا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ جسے ہم مذہب کہتے ہیں آپ اسے وجدانیات کا نام دیتے ہیں۔ فرق تو اصطلاح کا ہی ہے۔ اگر آپ لوگ بیس پچیس سال بعد بھی مذہب کی طرف لوٹ ہی آؤ تو یہ بتاؤ کہ یہ سودا کس دکان سے ملے گا؟ مذہب کو اس کی اصل شکل میں کس نے سنبھال رکھا ہے؟ اس دکان کو بند کرنے کے درپے کیوں ہو گئے ہیں جس کی آپ کو بعد میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اپنا آپشن تو باقی رکھیں۔

اسلام اور شہری حقوق و فرائض: غیر مسلم معاشرے کے تناظر میں

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ جولائی ۲۰۰۸ء)

(برطانیہ کے ایک تحقیقاتی فورم کی طرف سے موصولہ سوالنامہ کے جواب میں حسب ذیل گزارشات پیش کی گئی ہیں۔ یہ ذاتی مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں جن کے کسی بھی پہلو سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ راشدی)

جمہوریت اور انصاف

سوال ۱: سماجی زندگی پر اثر انداز ہونے کے لیے فیصلہ سازی اور انتخابی عمل میں فعال حصہ لینے، ایک شہری کی حیثیت سے متحرک کردار ادا کرنے اور جمہوریت کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب: اسلام ایک مسلمان کو اور کسی اسلامی مملکت کے ایک شہری کو سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں حصہ لینے اور سوسائٹی کی بہتری کے لیے کردار ادا کرنے کا نہ صرف حق دیتا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ قرآن کریم میں "**تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان**" کے تحت جو ہدایت دی گئی ہے، وہ اس کی واضح علامت ہے، اس لیے کہ بر و تقویٰ اور اثم و عدوان کا اطلاق صرف ذاتی نیکی اور بدی پر نہیں ہوتا بلکہ سوسائٹی کا اجتماعی خیر و شر اور نفع و ضرر بھی اس کے دائرے میں شامل ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک سے جو مسلمان نقل مکانی کر کے مغربی ممالک میں گئے ہیں اور انہوں نے ان ممالک کو اپنا وطن بنا لیا ہے تو جہاں وہ ان ممالک کے وسائل اور سہولتوں سے استفادہ کر رہے ہیں، وہاں اس سوسائٹی کا بھی ان پر حق ہے کہ وہ اسے کچھ دیں۔ اس ملک اور سوسائٹی نے

مسلمانوں کو بہت کچھ دیا ہے اور وہ اسے بھرپور طریقے سے وصول کر رہے ہیں، لیکن صرف لینا اور لیتے ہی چلے جانا انصاف کی بات نہیں ہے اور اس سوسائٹی کو کچھ دینا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

اس سلسلے میں احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ہمارے پاس بہت کچھ ہے اور ہم انہیں بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے پاس دنیا کے وسائل اور سہولتوں کی فراوانی ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے اور یہ ہمیں ان سے بہرہ ور کر رہے ہیں، لیکن ان کے پاس روح کا سکون اور آخرت کی نجات کا سامان نہیں جو بحمد اللہ تعالیٰ تمام تر خرابیوں کے باوجود ہمارے پاس موجود ہے، وہ ہم انہیں دے سکتے ہیں اور یہ ہماری دینی ذمہ داری بھی ہے کہ ہم وہ انہیں مہیا کریں۔ میں نے چند سال قبل نوٹنگھم برطانیہ میں ایک بڑے پادری صاحب سے اس سلسلے میں بات کی اور ان سے پوچھا کہ مغربی سوسائٹی میں خاندانی سسٹم کی بربادی اور روحانی سکون کے فقدان کے حوالے سے جو صورت حال ہے، کیا وہ اس سے مطمئن ہیں؟ انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ یہ صورت حال ہمارے لیے بڑی پریشان کن ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک اس کا حل کیا ہے؟ تو انہوں نے بڑے صاف انداز میں یہ بات کہہ دی کہ ''ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے، ہم تو آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں''۔

جمہوریت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ:

☆ حکومت کی تشکیل عوام کی رائے اور مشورہ سے ہوگی، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جانشین نامزد کرنے کی بجائے اس کا انتخاب لوگوں کی اجتماعی صواب دید پر چھوڑ دیا تھا۔

☆ حکومت خاندانی نہیں ہوگی، جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں بننے والے خلفاء حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا نسبی وارث نہیں تھا۔

☆ حکومت عوام کے سامنے جوابدہ ہوگی، جیسا کہ حضرت ابوبکر نے اپنے پہلے خطبے میں عام لوگوں کا یہ حق تسلیم کیا کہ ''میں سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔'' یا جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں اور بعد میں بھی عام لوگ خلفاء کے طرز عمل پر

کھلے بندوں انہیں ٹوک دیا کرتے تھے اور خلفاء کو بعض اوقات اپنے فیصلے واپس بھی لینا پڑتے تھے۔

☆ حکمران اپنے معاملات عوام کے مشورہ سے چلائیں گے۔ عوامی معاملات عام لوگوں کے مشورہ سے اور علمی و فنی معاملات اہل علم و فن کی مشاورت سے چلانے کے بارے میں خلفائے راشدینؓ کے طرز عمل کا ذکر تاریخ کی بہت سی روایات میں موجود ہے، بلکہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے امور میں جن میں وحی نازل نہیں ہوتی تھی، عام لوگوں یا متعلقہ لوگوں سے مشاورت کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ اپنی رائے کے خلاف عمومی مشاورت کی رائے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمائی ہے، جیسا کہ غزوۂ احد کے موقع پر ہوا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر حملہ آور لشکر کا مقابلہ کیا جائے، لیکن نوجوان صحابہ کے اصرار پر آپ نے مدینے سے باہر نکل کر جنگ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

☆ ایک اسلامی ریاست میں قرآن وسنت کی بالادستی کو تسلیم کرنا اور ان کے واضح احکام کی پابندی حکمرانوں اور رعیت، دونوں کے لیے ضروری ہے اور ان میں سے کوئی بھی قرآن و سنت کے صریح احکام سے انحراف کا مجاز نہیں ہے، نیز قرآن وسنت کے صریح احکام کو بطور قانون نافذ کرنا مسلمان حکمرانوں کی منصبی ذمہ داری ہے، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا تھا کہ

''اپنے حکمران کی اطاعت کرو، اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، جب تک کہ وہ تم میں کتاب اللہ کے احکام کو نافذ کرے''،

اور خلیفہ اول سیدنا ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں اعلان کیا تھا کہ

''میری اطاعت تم پر واجب ہے، جب تک میں قرآن وسنت کی پابندی کروں اور اگر اس سے انحراف کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔''

سوال ۲: اسلام اس بات کی کیسے حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ (سیاسی دائرے میں) مختلف صورت حال میں جائز اور ناجائز کے مابین امتیاز ہوجائے، تاکہ نوجوان درست

فیصلہ کر سکیں؟

جواب: اسلام ہر شخص کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ جس بات کو قانون کے حوالے سے غلط اور باہمی حقوق کے حوالے سے زیادتی سمجھتا ہو، اس کے خلاف آواز اٹھائے بلکہ سوسائٹی کے اجتماعی نقصان کی صورت میں یہ آواز اٹھانا اور معروف ذرائع سے اس کے سدباب کی عملی کوشش کرنا اس کے مذہبی فرائض میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی میں خیر کے فروغ اور شر کے سدباب کے لیے محنت کرنا بھی ہر شخص کا حق بلکہ اس کی ذمہ داری ہے۔

ایک اسلامی ریاست میں قرآن وسنت کی خلاف ورزی اور غیر مسلم ریاست میں مسلمہ دستور و معاہدات کی خلاف ورزی پر ایسا کرنے والوں کو ٹوکا جا سکتا ہے اور جہاں حق تلفی ہو رہی ہو اس کی نشان دہی کی جا سکتی ہے، اور اس روک ٹوک، نشان دہی اور احتجاج کے لیے وہ سب ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں جو اس دور اور علاقے میں معروف اور تسلیم شدہ ہوں۔ حضرت معاویہؓ رومیوں کے ساتھ جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم ہونے سے پہلے اپنا لشکر لے کر روم کی سرحد کی طرف جا رہے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ مدت ختم ہونے تک سرحد تک پہنچ جائیں گے اور مدت ختم ہوتے ہی حملہ کر دیں گے، لیکن حضرت عمرو بن عبسہؓ نے انہیں روک دیا اور کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی رو سے اگر کسی قوم کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ ہو تو جنگ بندی کی میعاد ختم ہونے سے پہلے اس کے خلاف فوجوں کو حرکت میں لانا درست نہیں۔ حضرت معاویہؓ یہ سن کر راستے سے ہی واپس آ گئے اور فوج کو چھاؤنی میں بھیج دیا۔ اس طرح کے درجنوں واقعات خلفائے اسلام کے مختلف ادوار میں ملتے ہیں۔

سوال ۳: ایک جمہوری ڈھانچے میں انصاف کے حوالے سے اسلام کا تصور کیا ہے؟ (کیا عمومی عدالتی نظام قابل قبول نہیں اور مسلمانوں کی علیحدہ عدالتیں قائم کرنا ضروری ہے؟)

جواب: جمہوری ڈھانچے میں انصاف کے حوالے سے اسلام کا تصور حالات اور زمینی حقائق کی روشنی میں مختلف دائروں میں تقسیم ہے:

☆ جہاں مسلم اکثریت یا مسلم اقتدار ہے، وہاں اسلامی عدالتوں کا قیام ضروری ہے جو قرآن

وسنت کے مطابق لوگوں کو انصاف فراہم کریں، مگر غیر مسلم اقلیتیں اپنے خاندانی معاملات اور مذہبی معاملات میں ان عدالتوں کی پابند نہیں ہوں گی اور ان کے فیصلے ان دو حوالوں سے ان کے مذہب و روایات کے مطابق کیے جائیں گے جس کے لیے عدالتی نظام بھی ان کے اطمینان کے مطابق فراہم کیا جائے گا۔

☆ جن ممالک میں مسلمان اکثریت یا اقتدار میں نہیں ہیں، وہاں چونکہ وہ ایک سماجی معاہدے کے تحت رہ رہے ہیں، اس لیے اس سماجی معاہدہ (نیشنیلٹی کے قوانین) کی پابندی ان کے لیے ضروری ہے جو وہاں کی ریاستی عدالتوں کے ذریعے ہی ہوگا، البتہ مذہبی معاملات اور خاندانی احکام وقوانین میں ان کے مذہب کے مطابق عدالتی نظام کا فراہم کیا جانا ان کا حق ہے۔ اس حق کے لیے وہ کوشش کرتے رہیں گے اور اس کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کریں گے۔ نیز اس ملک کے عمومی قوانین میں اگر کوئی بات قرآن و سنت کے صریح احکام اور مسلمانوں کے کسی اجماعی عقیدہ سے ٹکراتی ہے تو وہ اس کے خلاف احتجاج کریں گے، اسے تبدیل کرانے کی کوشش کریں گے اور حکمرانوں کو اس کی طرف توجہ دلائیں گے اور اگر اس کے باوجود وہ تبدیل نہیں ہوتے تو مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہیں کہ یا وہ ملک چھوڑ دیں اور یا مجبوری کے درجے میں وہاں رہتے ہوئے اپنا احتجاج مسلسل ریکارڈ کراتے رہیں، مگر قانون کو ہاتھ میں لینے یا مروجہ سسٹم سے بغاوت کرنے کا ان کو اس سماجی معاہدہ کی رو سے حق نہیں ہوگا۔

سوال ٤: سماج میں امن قائم رکھنے کے لیے قانون کی اہمیت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ (سیاسی فیصلوں سے اختلاف کرتے ہوئے قانون کی پابندی کرنے کی کیا اہمیت ہے؟)

جواب: اسلام سوسائٹی میں امن کو برقرار رکھنے اور اس کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے اور رائج الوقت قانون کی پابندی کا حکم دیتا ہے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ’’حاکم وقت اگر تمھاری حق تلفی بھی کر رہا ہو تو اس کی اطاعت کرو‘‘۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور احتجاج کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ ان دونوں

ارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ ظلم وزیادتی کے خلاف احتجاج کرنا، اپیل کرنا اور آواز اٹھانا تو مظلوم کا حق ہے، لیکن قانون سے انحراف اور فیصلوں سے بغاوت کا اسے حق نہیں ہے۔ البتہ مسلم اقتدار کی صورت میں مسلمان حکمران کی طرف سے صریح کفر (کفر بواح) کے ارتکاب پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام مسلمانوں کو بغاوت کی اجازت دیتے ہیں جس کے لیے فقہائے کرام نے شرط لگائی ہے کہ اگر ''کفر بواح'' یعنی صریح کفر کے مرتکب مسلم حکمران کو عوامی بغاوت کے ذریعے تبدیل کر دینے کا غالب امکان نظر آ رہا ہو تو ایسا کرنا ضروری ہے، ورنہ خواہ مخواہ عام لوگوں کو بدامنی کا شکار بنانا اور ان کی جان و مال کو خطرے میں ڈال دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ حکم اسلامی ریاست کے لیے ہے۔ غیر مسلم ریاست کے لیے ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ایسی صورت میں مسلمان یا ملک چھوڑ دیں اور یا اپنا احتجاج ریکارڈ کراتے ہوئے وہاں رہیں، لیکن قانون کی پابندی ان کے لیے ضروری ہوگی۔

اس وقت عالمی تناظر میں عراق، فلسطین، کشمیر اور افغانستان وغیرہ کے حوالے سے مغربی حکومتوں کا جو طرز عمل ہے، اس کے بارے میں صرف مسلمانوں کا ہی نہیں، بلکہ عالمی رائے عامہ اور غیر جانب دار مبصرین کا کہنا بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، اس لیے مسلمانوں بالخصوص گرم خون رکھنے والے نوجوانوں کے ذہنوں میں اس کا ردعمل پیدا ہونا فطری بات ہے۔ اس لیے آج کے ورلڈ میڈیا کی کھلی فضا میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں ردعمل کے پیدا ہونے کو تو کسی صورت میں نہیں روکا جا سکتا اور نہ ہی اس کے اظہار پر کوئی قدغن لگائی جا سکتی ہے، البتہ اس ردعمل کے اظہار کو مناسب حدوں کا پابند ضرور کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً برطانیہ میں رہنے والے مسلمان نوجوانوں کو ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ عراق، فلسطین، کشمیر، افغانستان یا کسی اور جگہ کے مسلمانوں کی مظلومیت پر ردعمل کا شکار نہ ہوں یا اپنے ردعمل کا اظہار نہ کریں، کیونکہ ان سے یہ کہنا صریحاً زیادتی اور ناانصافی کی بات ہوگی، البتہ ہم ان سے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہے ہیں کہ وہ اپنے جذبات اور ردعمل کے اظہار میں اپنے ملک کے احوال و ظروف، دستور و قوانین اور اپنے دیگر ہم وطنوں کے جذبات و احساسات کی ضرور پاس داری کریں اور اپنی حکومت، مسلمان

بھائیوں اور دیگر برادران وطن کے لیے مشکلات پیدا نہ کریں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن عبسہؓ کو قبول اسلام کے بعد اپنے قبیلے میں جا کر خاموشی کے ساتھ وقت گزارنے اور غلبہ اسلام کی صورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ جانے کی ہدایت کی تھی۔ (صحیح مسلم) آپ نے حضرت ابوذر غفاری کو بھی قبول اسلام کے بعد اسی قسم کی ہدایت کی تھی۔ (صحیح بخاری) جنگ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور ان کے والد محترم دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ رہے تھے کہ راستے میں کافروں نے پکڑ لیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ آپ دونوں ہمارے خلاف جنگ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہیں ہوں گے۔ کفار کی قید سے رہا ہو کر دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ کہہ کر جنگ میں شرکت سے روک دیا کہ چونکہ آپ دونوں نے کفار کی یہ شرط منظور کر لی تھی، اس لیے آپ ہمارے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹا موجود ہوتے ہوئے بھی غزوۂ بدر میں شامل نہ ہو سکے۔ ان واقعات سے اس سلسلے میں اصولی راہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

میری رائے میں حالیہ عالمی کشمکش میں ہمیں مغربی ممالک و اقوام کو اقوام و ممالک کی حیثیت سے اپنا حریف نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ جس طرح مسلم ممالک میں حکومتوں کے اہداف عوام کے اہداف و مقاصد سے مختلف ہیں، اسی طرح مغربی ممالک میں بھی حکومتوں اور بالادست قوتوں کے اہداف و عزائم کا عوام کے اہداف و مقاصد سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر ان دونوں میں فرق کو محسوس کرتے ہوئے مغرب کی رائے عامہ سے اس کی نفسیات اور ذہنی سطح کے مطابق براہ راست مخاطب ہو کر اس کے سامنے اپنا مقدمہ صحیح طور پر پیش کیا جا سکے تو مسلمان اپنے اختلاف اور احتجاج کو زیادہ مؤثر طریقے سے ریکارڈ کرا سکتے ہیں۔

مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ جس ملک میں رہتے ہیں، وہاں کے دستور و قانون کی پوری طرح پابندی کریں اور اس کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے دین اور ملت کے لیے جو بھی کر سکتے ہوں، اس سے گریز نہ کریں۔ میں ایسی سرگرمیوں کے حق میں نہیں ہوں جن

سے ملک کے دستور و قانون کی پابندی کا عہد متاثر ہوتا ہو اور عام مسلمانوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا ہو اور ایسی خاموشی کو بھی جائز نہیں سمجھتا جس میں اسلام اور مسلمانوں کے جائز حقوق اور ان کے حصول و تحفظ کے قانونی استحقاق سے بھی دستبرداری اختیار کر لی جائے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ مسلمانوں کو ان کے درمیان اعتدال اور توازن کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور پوری ہوشیاری اور بیداری کے ساتھ اپنے ملی اور معاشرتی حقوق و مفادات کا تحفظ کرنا چاہیے۔

سوال ۵: رواداری اور احترام کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے، بالخصوص ان لوگوں کے حوالے سے جو مختلف اعتقادات اور پس منظر کے حامل اور مختلف روایتوں سے وابستہ ہیں؟

جواب: اسلام عقیدہ و مذہب کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے احترام کا حکم دیتا ہے، ایک دوسرے کے معبودوں اور مسلمہ بڑوں کے خلاف بدزبانی سے روکتا ہے، اپنے اپنے دائرے میں مذہبی احکام و روایات پر عمل کا حق دیتا ہے اور مذہبی آزادی کو تسلیم کرتا ہے، لیکن ایک اسلامی ریاست میں اسلامی روایات واقدار کو کھلے بندوں چیلنج کرنے کا حق نہیں دیتا اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی بھی ریاست اپنے تمام شہریوں کو اپنے اپنے دائرے میں اپنے عقائد، کلچر اور روایات کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دیتی ہے، لیکن ریاست کے عمومی دستور و قانون اور ریاست کی تہذیبی بنیادوں کو چیلنج کرنے کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں ہوتا۔

جہاں تک معاشرتی اور سماجی تعلقات کا تعلق ہے تو اسلام ابراہیمی مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ رواداری اور احترام کے رویے کی خصوصی تلقین کرتا ہے۔ سیرت نبوی میں اس کی جھلک حسب ذیل چند واقعات میں دیکھی جا سکتی ہے:

☆ مکی عہد نبوت میں جب روم کے مسیحیوں اور فارس کے مجوسیوں کے مابین جنگ میں رومیوں کو شکست ہوئی تو مسلمان بہت غمگین ہوئے۔ رومیوں کے ساتھ اس ہمدردی کو قرآن مجید نے بنظر استحسان دیکھا اور مسلمانوں کی تسلی کے لیے یہ وعدہ فرمایا کہ عنقریب رومیوں کو ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہوگا اور اس دن مسلمانوں کو خوشی حاصل ہوگی۔

☆ ہجرت کے بعد ایک مخصوص عرصے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کی تالیف قلب کے

لیے ان کے قبلہ یعنی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔

☆ فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کے نجات پانے کی خوشی میں مدینہ منورہ کے یہود محرم کی دس تاریخ کو روزہ رکھا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی موافقت میں عاشورا کا روزہ رکھنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا اور فرمایا کہ ’’ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تم سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔‘‘

☆ ایک انصاری نے یہ جملہ زبان سے ادا کرنے پر ایک یہودی کو تھپڑ مار دیا کہ: ’’اس اللہ کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام انسانوں پر فضیلت عطا کی ہے‘‘ اور کہا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل قرار دیتے ہو؟ یہودی شکایت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ اس کی شکایت سن کر انصاری سے شدید ناراض ہوئے اور یہود کے مذہبی جذبات کی رعایت سے صحابہ کو اس بات سے منع فرما دیا کہ وہ ان کے سامنے انبیاء میں سے بعض کو بعض سے افضل قرار دیں۔

☆ ۹ ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے انہیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ جب عصر کی نماز کا وقت آیا اور انہوں نے نماز پڑھنی چاہی تو صحابہ نے ان کو روک دیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں نماز پڑھنے دو۔ چنانچہ انہوں نے مسجد نبوی ہی میں مشرق کی سمت میں اپنے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی۔

☆ ایک شخص کا جنازہ گزرا تو آپ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ کہا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے، تو فرمایا: ’’کیا وہ انسان نہیں ہے؟‘‘

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ان کے ساتھ معاشرتی اور قانونی معاملات میں ہر موقع پر عدل وانصاف کا رویہ اختیار فرمایا جس کی شہادت ایک موقع پر خود یہود نے یوں دی کہ: ’’یہی وہ حق اور انصاف ہے جس کے سہارے زمین اور آسمان قائم ہیں۔‘‘

☆ جن معاملات میں آپ کو کوئی واضح ہدایت نہیں ملی ہوتی تھی، ان میں آپ اہل کتاب کے

قوانین اور طریقوں کے مطابق فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔

☆ لباس اور وضع قطع سے متعلق امور میں بھی آپ مشرکین کے مقابلے میں اہل کتاب کے طریقے کی موافقت کو پسند فرماتے تھے۔

سوال ٦: دوسرے مسلم گروہ، جو کسی مختلف مکتب فکر سے متعلق ہیں، ان کے ساتھ طرز عمل کے بارے میں اسلام کی کیا تعلیم ہے؟

جواب: اسلام کے دائرے میں شمار کیے جانے والے تمام مسلمان گروہوں کو جنہیں اسلامی اصطلاح میں اہل قبلہ کہا جاتا ہے، ایک اسلامی ریاست میں برابر کے حقوق حاصل ہیں اور تمام گروہوں کے معتقدات وجذبات کے احترام کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ فقہی اور اعتقادی اختلافات کی صورت میں ملک کا عمومی قانون اکثریت کے رجحانات کے مطابق ہوگا اور اقلیتی گروہوں کو اپنے مذہبی اور خاندانی معاملات اپنی اپنی فقہ کے مطابق طے کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ البتہ اہل قبلہ کے تعین میں یہ فرق ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اسلام کے کسی بنیادی عقیدہ مثلاً ختم نبوت سے منحرف گروہوں (قادیانیوں اور بہائیوں وغیرہ) کو اسلام کے دعوے کے باوجود اس دائرے میں شامل نہیں کیا جائے گا اور اس سلسلے میں مسلمانوں کے اجماعی فیصلے اور جذبات کا احترام ضروری ہوگا۔

جہاں تک مسلمانوں کے باہمی اعتقادی مسائل اور فقہی اختلافات کا تعلق ہے تو ان اختلافات کی درجہ بندی اور ترجیحات مسلمانوں کے سامنے واضح ہونی چاہییں اور انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ کون سی بات کفر واسلام کی ہے اور کون سی بات اولیٰ اور غیر اولیٰ کی ہے، کس اختلاف پر سخت رویہ اختیار کرنا ضروری ہے اور کون سے اختلاف کو کسی مصلحت کی خاطر نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر نظری، فقہی اور فروعی مباحث میں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کے احترام اور برداشت کا رویہ باقی نہ رہے تو خالصتاً فروعی حتیٰ کہ اولیٰ وغیر اولیٰ کے جزوی اختلافات بھی بحث ومباحثہ میں اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ کفر واسلام میں معرکہ آرائی کا تاثر ابھرنے لگتا ہے اور بیشتر اوقات اس سے خود اسلام کے تعارف میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر برطانوی معاشرہ اسلام کی تبلیغ ودعوت کا ایک وسیع اور ہموار میدان ہے، لیکن اسلام کی دعوت وتبلیغ کی راہ میں یہاں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات، بالخصوص دیوبندی بریلوی

کشید گی ہے جس کے دل خراش اور سنگدلانہ مظاہروں نے یہاں کی مقامی آبادی کے سامنے اسلام اور مسلم معاشرہ کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا ہے جسے کشش، پسندیدگی یا قبولیت کا باعث کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کشیدگی کا اہتمام کرنے والے عناصر خواہ کوئی ہوں، انہوں نے اس کے ذریعے اپنے فرقہ وارانہ جذبات کی وقتی تسکین کا سامان شاید فراہم کر لیا ہو مگر اسلام کی قطعاً کوئی خدمت نہیں کی بلکہ اسلام کی دعوت وتبلیغ کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی ہے۔

سوال ۷: عقیدہ و طرز حیات کے تنوع اور ان کے مابین انتخاب کی آزادی کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

جواب: عقیدہ اور طرز حیات کے تنوع کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور اسے سوسائٹی کا ناگزیر حصہ تصور کرتا ہے، لیکن چونکہ اسلام کے نزدیک آسمانی تعلیمات کی پابندی اور وحی الٰہی کو قبول کرنا ہی انسان کے لیے صحیح راستہ ہے اور اسلامی نقطہ نظر سے آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی محفوظ اور فائنل صورت قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وسنت ہے، اس لیے وہ اس سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا، بالکل اسی طرح جیسے آج کی مغربی قیادت ویسٹرن کلچر کو انسانی کلچر کی صحیح ترین اور فائنل شکل قرار دیتے ہوئے دنیا میں کسی قوم یا طبقہ کو اس سے انحراف کی اجازت نہیں دے رہی اور جہاں بھی ویسٹرن کلچر سے ہٹ کر کسی دوسرے کلچر کے سوسائٹی میں اسٹیبلش ہونے کا امکان نظر آتا ہے، وہاں مغربی ممالک طاقت کے اندھا دھند استعمال کے ذریعے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس معاملے میں اسلام اور مغرب کے نقطہ نظر میں اصولی طور پر اتفاق پایا جاتا ہے اور صرف اتنا فرق ہے کہ اسلام آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کو اس کی فائنل صورت (قرآن وسنت) میں انسانی سوسائٹی کی صحیح ترین اور حتمی شکل قرار دیتا ہے اور اس سے انحراف کو برداشت نہیں کرتا، جبکہ مغرب اپنے موجودہ کلچر کو حتمی اور فائنل سمجھتا ہے اور دنیا میں کسی کو اس سے ہٹ کر کوئی اور کلچر اختیار کرنے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

سوال ۸: حکومت اور معاشرہ کے حوالے سے ایک شہری کے کردار اور ذمہ داریوں کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

جواب: اسلام ایک عام شہری کو ملکی معاملات میں شریک ہونے، ملک کے مشاورتی نظام کا

حصہ بننے، خیر کے کاموں میں تعاون کے راستے تلاش کرنے اور شر کی راہ میں رکاوٹ بننے کا نہ صرف حق دیتا ہے، بلکہ اس کی تلقین کرتا ہے اور اسے مذہبی فرائض میں شمار کرتا ہے۔

سوال ۹: اسلام میں ارباب حل و عقد کو ان کے اعمال کے لیے جوابدہ ٹھہرانے کا طریقہ کیا ہے؟ (حکومت کے فیصلوں سے اختلاف اور ان پر تنقید کا درست طریقہ کیا ہے؟)

جواب: خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کا پہلا خطبہ اس سلسلے میں اسلامی مزاج کی صحیح عکاسی کرتا ہے کہ اگر میں قرآن وسنت (یعنی قانون) کے مطابق چلوں تو میرا ساتھ دیتے رہو، اور اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام حاکم وقت کو عوام کے سامنے جوابدہ بناتا ہے اور عوام کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ حاکم وقت کو قانون کے خلاف چلنے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ ٹوک دیں بلکہ اسے سیدھا کر دینے کے جو ذرائع میسر ہوں، وہ بھی اختیار کریں۔ حکام کو روک ٹوک کرنے اور انہیں سیدھا کر دینے کا کوئی متعین طریقہ اسلام نے نہیں طے کیا، بلکہ اسے حالات اور مواقع کی مناسبت سے کھلا چھوڑ دیا ہے اور اس کے لیے حالات زمانہ کے حوالے سے کوئی بھی مناسب طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً آج کے دور میں ووٹ، سیاسی عمل، احتجاج اور میڈیا و لابنگ اس کی مروجہ اور معروف صورتیں ہیں۔

حقوق اور فرائض

سوال ۱: حقوق اور فرائض کی ان مختلف قسموں کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے جن کا اثر فرد اور سماجی گروہوں، دونوں پر پڑتا ہے؟ (دوسروں کے حقوق کا کیسے خیال رکھا جائے، حقوق میں ٹکراؤ کی صورت میں کیا کرنا چاہیے اور اختلاف کے حدود اور آداب کیا ہیں؟)

سوال ۲: اسلام کی نظر کی اس بات کو یقینی بنانے کے حوالے سے حکومت کی ذمہ داری کیا ہے کہ مختلف تنظیموں اور افراد کے حقوق کے مابین توازن قائم رہے اور ان حقوق کو تحفظ فراہم کیا جائے؟

سوال ۳: ایسے مسائل کو اسلام کیسے ڈیل کرتا ہے جہاں حقوق کے مابین تصادم کی کیفیت پیدا ہو جائے؟ تصادم کے

حل کے لیے اس کا تجویز کردہ طریقہ کیا ہے؟

جواب: مختلف افراد، طبقات یا گروہوں کے درمیان حقوق کے باہمی تصادم اور ٹکراؤ کی صورت میں اسلام انصاف، عدل اور قانون کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے اور کسی فریق کی ناجائز طرف داری سے روکتا ہے۔ اسی طرح وہ متصادم گروہوں کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کا ماحول قائم کرنے پر زور دیتا ہے اور ثالثی، محاکمہ اور گفت وشنید کے ذریعے ایک دوسرے کو قریب لانا اسلامی تعلیمات کا ایک مستقل باب ہے۔

عدل وانصاف کو قائم رکھنے اور افراد اور طبقات کو ایک دوسرے کی زیادتی سے بچانے کے حوالے سے سب سے زیادہ ذمہ داری حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس ضمن میں خلفائے اسلام کے بہت سے واقعات بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں نقل کیا ہے کہ فتح بیت المقدس کے موقع پر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ شہر کا دورہ کرتے ہوئے مسیحیوں کی ایک عبادت گاہ میں گئے اور وہاں نماز کا وقت آ گیا تو وہ نماز کی ادائیگی کے لیے باہر آ گئے اور الگ جگہ نماز ادا فرمائی۔ اس پر بعض ساتھیوں نے دریافت کیا کہ امیر المومنین! وہ بھی تو عبادت گاہ تھی۔ اس جگہ نماز ادا کرنے میں کیا حرج تھا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں اس جگہ نماز ادا کر لیتا تو بعد میں تم نے وہاں مستقل قبضہ کر لینا تھا کہ یہاں ہمارے امیر المومنین نے نماز ادا کی ہے، اس لیے ہم اس جگہ مسجد بنائیں گے۔ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں پر اس طرح قبضہ کیا جائے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے خلافت کا منصب قبول کیا اور ذمہ داریاں سنبھال کر گزشتہ حکومتوں کے مظالم کی تلافی کا سلسلہ شروع کیا تو ان کے عدل وانصاف کے واقعات سن کر سمرقند کے غیر مسلم باشندوں کا ایک وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ اب سے پندرہ سال قبل جب مسلم کمانڈر قتیبہ بن مسلم نے سمرقند فتح کیا تو اس شہر پر حملے سے قبل اسلامی احکام کے مطابق نہ تو انہیں اسلام کی دعوت دی اور نہ ہی دوسری شرائط پیش کیں بلکہ اچانک حملہ کر کے فتح کر لیا، اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے اور اس کی تلافی ہونی چاہیے۔ سمرقند کی فتح حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے خلیفہ بننے سے پندرہ برس قبل ہوئی تھی، لیکن انہوں نے اسے ماضی

کے حوالے سے ٹالنے کی بجائے غیر مسلموں کی شکایت کی تلافی ضروری سمجھی اور جمیع بن حاضر الباجی کو اس شکایت کی انکوائری اور تصفیے کے لیے خصوصی قاضی مقرر کر دیا۔ انہوں نے تحقیقات کے بعد شکایت کو درست پایا تو اس پر فیصلہ صادر کر دیا کہ شہر پر قبضہ چونکہ اسلامی احکام کے مطابق نہیں ہوا، اس لیے مسلم افواج سمرقند شہر خالی کر دیں، چنانچہ قاضی کا فیصلہ نافذ ہو گیا اور اسلامی افواج اس عدالتی فیصلے کا احترام کرتے ہوئے پندرہ سال قبل فتح کیا ہوا شہر خالی کر کے باہر کھلے میدان میں نکل آئیں۔

تشخص اور تنوع

سوال ۱: کیا ''مسلم تشخص'' نام کی کوئی چیز موجود ہے؟ ایک غیر مسلم ریاست میں رہتے ہوئے مسلمان اپنے مذہبی تشخص اور اعتقادات کے ساتھ کس طرح وابستہ رہ سکتے ہیں؟ اس ریاست سے متعلق ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

جواب: ''مسلم تشخص'' یہی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک عقیدہ پر قائم ہیں، قرآن وسنت کے ساتھ واضح کمٹمنٹ رکھتے ہیں، اپنی تہذیبی شناخت کو باقی رکھنے پر مصر ہیں، خاندانی نظام میں مذہبی احکام سے ہٹ کر کسی مداخلت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان کی مساجد ومکاتب اور دینی تعلیم کا بنیادی نظام یکساں ہے اور وہ دینی روایات کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان تمام معاملات میں دنیا بھر کے مسلمانوں میں پائی جانے والی یکسانیت واضح طور پر نظر آنے والی معروضی حقیقت ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے مرکز بیت اللہ شریف اور مدینہ منورہ میں بلا امتیاز حاضری دے کر ایک ہی طریقے سے اپنی کمٹمنٹ کا مسلسل اظہار کرتے رہتے ہیں۔

ایک مسلمان کے کسی غیر مسلم ملک (مثلاً برطانیہ) کا شہری ہونے کا مطلب اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ ہے کہ وہ:

- ☆ خود کو برطانیہ کا شہری تصور کرے۔
- ☆ جس معاہدے کے تحت وہ شہری بنا ہے، اس کی پابندی کرے۔
- ☆ قانون ودستور اور سسٹم کو چیلنج نہ کرے۔

☆ اپنے مذہب اور کلچر پر برقرار رہنے کے مسلمہ حق سے دستبردار نہ ہو۔

☆ ملکی قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مذہبی احکام پر عمل کرے اور اپنے دیگر مسلمان برادران وطن بلکہ ملک سے باہر کے مسلمانوں کے ساتھ بھی بھائی چارے اور باہمی تعاون وحمایت کا قانونی حق استعمال کرے، البتہ قانون اور سسٹم کو چیلنج نہ کرے اور اس حوالے سے میرے نزدیک دنیا کے کسی بھی ملک میں رہنے والے مسلمانوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جن حقوق کو یہودی اس ملک کے قانون کی پابندی اور عالمی سطح پر یہودیوں کے مفادات وحقوق کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

☆ ملک کے سیاسی نظام میں شریک ہو اور مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے ساتھ ساتھ ملک کی عمومی آبادی اور عام شہریوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ اور ملک وقوم کے اجتماعی مفاد کے لیے کردار ادا کرے۔

☆ اگر ملک کے دستور وقانون میں کوئی بات اپنے عقیدہ اور مسلمہ حق کے خلاف سمجھتا ہے تو اس کے لیے معروف طریقوں سے آواز اٹھائے، لابنگ کرے اور پالیسی سازوں کو اپنے موقف پر قائل کرنے کی ہر ممکنہ صورت اختیار کرے۔

سوال ۲: کیا وقت کے ساتھ ساتھ 'تشخص' کے بدلنے کے حوالے سے کوئی اسلامی نقطہ نظر موجود ہے جس میں اس امر کی گنجائش مانی جاتی ہو کہ ''کسی ملک (مثلاً برطانیہ) کا شہری ہونے کا کیا مطلب ہے؟'' کے سوال کا جواب مختلف طریقوں سے دیا جا سکتا ہے؟

جواب: اسلام ایک مسلمان کے بنیادی تشخص (مثلاً اسلام پر قائم رہنے اور قرآن وسنت کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ برقرار رکھنے) میں تغیر کو قبول نہیں کرتا اور ہر حال میں ایک مسلمان کو اس کی پابندی کا حکم دیتا ہے، البتہ وقت کے ساتھ ساتھ تشخص وتنوع میں جزوی تغیر کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور یہ فطری بات ہے۔ آج کے عالمی ماحول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گلوبلائزیشن کا دور ہے اور تہذیبوں کے اختلاط کا دور ہے کیونکہ فاصلے اس قدر سمٹ گئے ہیں کہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان صدیوں سے قائم سرحدیں پامال ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ آج کے دور میں جبکہ تہذیبوں اور

ثقافتوں کے درمیان حدود اور فاصلوں کو برقرار رکھنا ممکن نہیں رہا، منطقی طور پر یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے کہ مختلف تہذیبوں کے اختلاط کے دور میں اسلام کیا راہ نمائی کرتا ہے؟ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات میں اس بارے میں واضح راہ نمائی موجود ہے اور احادیث کے ذخیرے میں بہت سی روایات پائی جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر بخاری شریف کی ایک روایت کا حوالہ دینا چاہوں گا جو امام بخاریؒ نے کتاب النکاح میں بیان کی ہے اور اس تفصیلی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش کے بہت سے خاندان مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو مہاجرین اور انصار کی خاندانی روایات میں واضح فرق موجود تھا۔ مہاجرین کے ہاں کسی عورت کا خاوند کو کسی بات پر ٹوکنا یا اس کی کسی بات کو رد کرنا سرے سے متصور نہیں تھا جبکہ انصار کے خاندانوں میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ خاوند کو کسی بات پر ٹوک سکتی ہیں، کسی بات کا جواب دے سکتی ہیں اور کسی بات سے انکار بھی کر سکتی ہیں۔ حضرت عمرؓ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ انہیں ایک روز ان کی بیوی نے کسی بات پر ٹوک دیا تو انہیں بہت غصہ آیا اور انہوں نے بیوی کو ڈانٹا۔ بیوی نے جواب دیا کہ مجھے ڈانٹنے کی ضرورت نہیں، یہ تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بھی ہوتا ہے کہ ان کی ازواج مطہرات کسی بات پر ٹوک دیتی ہیں اور کسی بات کا جواب بھی دے دیتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اسے اس بات سے تعبیر کیا کہ انصار کی عورتوں کی عادات ہماری عورتوں پر اثر انداز ہوتی جا رہی ہیں چنانچہ حضرت عمرؓ اسی غصے کی حالت میں سیدھے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے گھر پہنچے جو ان کی بیٹی تھیں اور انہیں سمجھایا بجھایا کہ ایسا مت کیا کرو۔ وہ تو بیٹی تھیں، خاموش رہیں مگر یہی بات جب حضرت عمرؓ نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے کہنا چاہی تو انہوں نے آگے سے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ ”آپ نے میاں بیوی کے معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی ہے؟“ حضرت عمرؓ نے یہ واقعہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ صرف یہ فرمایا کہ ”آخر ام سلمہ ہے“۔

یہ دو علاقائی ثقافتوں اور معاشرتی روایات کے اختلاط اور ٹکراؤ کا قصہ ہے اور میری طالب علمانہ رائے ہے کہ تہذیبوں کے اختلاط اور مختلف ثقافتوں کے باہمی میل جول کے مسائل میں یہ روایت

اصولی اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے جس سے ہمیں راہ نمائی حاصل کرنی چاہیے اور دورِ نبوی کے اس طرز کے واقعات اور روایات واحادیث کی روشنی میں آج کے عالمی حالات کے تناظر میں اصول و ضوابط وضع کرنے چاہئیں کہ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے تال میل میں کہاں ایڈجسٹ منٹ کی گنجائش ہے، کہاں صاف انکار کی ضرورت ہے اور کہاں کوئی درمیان کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ دین اور ثقافت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کے درمیان حد فاصل قائم رہنی چاہیے اور دونوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ دین کی بنیاد آسمانی تعلیمات پر ہے اور اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے جبکہ ثقافت کی بنیاد ایک علاقہ میں رہنے والے لوگوں کے درمیان خود بخود تشکیل پا جانے والی معاشرتی اقدار اور روایات پر ہوتی ہے اور اس کا سرچشمہ سوسائٹی اور اس کا ماحول ہوتا ہے۔ اگر علاقائی ثقافتوں پر دین و شریعت کا لیبل لگا کر انہیں ساری دنیا سے ہر حال میں منوانے کی بات جائے گی تو اس سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہوں گے۔

سوال ۳: عالمی سطح پر (مثلاً برطانیہ، یورپ کے باقی ممالک اور وسیع تر دنیا کے مابین) باہمی تعلقات کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ کیا دنیا کے ایک عالمی کمیونٹی ہونے کے حوالے سے اسلام کوئی منفرد نقطہ نظر رکھتا ہے؟

جواب: اسلام خود گلوبل سوسائٹی کا علم بردار ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دین کی دعوت کے لیے پوری نسل انسانی کو خطاب کیا ہے اور حجۃ الوداع کے خطبے میں (دنیا کی تاریخ میں پہلی بار) گلوبل انسانی سوسائٹی کے خدوخال واضح کیے ہیں اور اس کے بنیادی اصول بیان فرمائے ہیں، البتہ اسلام گلوبل سوسائٹی کی نظریاتی بنیاد آسمانی تعلیمات کو سمجھتا ہے اور قرآن وسنت کو اس کی محفوظ اور فائنل شکل قرار دیتا ہے جیسا کہ مغرب ویسٹرن کلچر کو گلوبل سوسائٹی کی بنیاد قرار دیتا ہے اور اسے دنیا بھر سے منوانے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کر رہا ہے۔

سوال ۴: کیا ایک یکجان اور آپس میں جڑی ہوئی کمیونٹی وجود میں لانے کے بارے میں کوئی اسلامی نقطہ نظر پایا جاتا ہے؟

جواب: آسمانی تعلیمات کے معاشرتی کردار کی نفی اور وحی الٰہی سے انحراف کی بنیاد پر کمیونٹی کے

باہمی اتحاد کو اسلام قبول نہیں کرتا۔

سوال ۵: اسلام میں رضاکارانہ خدمت اور (غریبوں کی) مالی امداد اتنی اہم کیوں ہے؟

جواب: وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات نے ہر دور میں انسان کو راستی کی تعلیم دی ہے، امن کا راستہ دکھایا ہے، باہمی محبت اور رواداری کا سبق دیا ہے، ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی تلقین کی ہے، نادار اور بے سہارا افراد کی خدمت پر آمادہ کیا ہے، سچائی اور دیانت و امانت کو انسانی سوسائٹی کی اساسی اقدار قرار دیا ہے اور حیا و پاک دامنی کو انسان کا زیور بتایا ہے۔ بائبل اور قرآن کریم کے سینکڑوں اوراق وحی الٰہی کی ان تعلیمات پر گواہ ہیں اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے متعدد ارشادات مقدس کتابوں میں اس حوالہ سے موجود و محفوظ ہیں۔ ہم اس حوالے سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں سے دو حوالے دینا مناسب سمجھیں گے:

ایک یہ کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی وحی کے نزول کے بعد غار حرا سے اتر کر گھر آئے اور اس اچانک واقعہ پر کچھ گھبراہٹ کا اظہار کیا تو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ گھبرائیں نہیں، اس لیے کہ آپ

"(۱) صلہ رحمی کرتے ہیں (۲) ناداروں اور بے سہارا لوگوں کا سہارا بنتے ہیں (۳) مہمانوں اور مسافروں کی خدمت کرتے ہیں (۴) ناگہانی آفتوں میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں (۶) محتاجوں کو کما کر کھلاتے ہیں۔"

دوسرا حوالہ اس موقع کا ہے جب بخاری شریف ہی کی روایت کے مطابق سلطنت روما کے فرمانروا شاہ ہرقل کے نام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی پہنچا اور شاہ ہرقل نے عرب دنیا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وقت کے سب سے بڑے حریف جناب ابو سفیانؓ کو دربار میں بلا کر ان سے حضرت محمد کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو ابوسفیانؓ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور پیغام کا تعارف قیصر روم کے دربار میں ان الفاظ میں

کرایا کہ:

(۱) وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں،

(۲) اللہ تعالیٰ کی بندگی اور نماز کا حکم دیتے ہیں،

(۳) سچائی کی تلقین کرتے ہیں،

(۴) صلہ رحمی کو ضروری قرار دیتے ہیں،

(۵) اور پاک دامن رہنے کا سبق دیتے ہیں۔

سوسائٹی اور تمدن کا قیام چونکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور سوسائٹی اور تمدن کی بنیاد باہمی تعاون پر ہے، اس لیے باہمی تعاون کی رضا کارانہ صورتوں کو اسلام نہ صرف ضروری قرار دیتا ہے، بلکہ انہیں مذہبی فرائض میں شمار کرتا ہے اور ان سے انحراف کو گناہ اور جرم تصور کرتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث نبوی میں ہے کہ:

> ''جو شخص خود پیٹ بھر کر رات کو سویا رہا اور اس کے پڑوسی نے بھوک کی حالت میں رات گزار دی، جبکہ اسے اس کے بارے میں معلوم بھی ہے تو ایسے شخص کو مومن کہلانے کا حق حاصل نہیں ہے۔''

اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث میں سماجی ضروریات اور خدمات سے غفلت برتنے کو مذہبی طور پر گناہ اور جرم قرار دیا گیا ہے۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا یہی خلاصہ ہے۔ نسل انسانی نے جس دور میں بھی ان تعلیمات کو اپنایا ہے، اسے سکون و اطمینان کی وافر دولت ملی ہے اور انسانوں نے باہمی محبت و اعتماد کی زندگی بسر کی ہے اور جب بھی ان آسمانی تعلیمات کے بارے میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے، انسانی سوسائٹی میں امن اور سکون کا توازن بگڑ گیا ہے۔

سوال ٦: صنفی مساوات کے حوالے سے اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب: اسلام مرد اور عورت کو سوسائٹی اور تمدن کی دو ناگزیر بنیادیں تصور کرتا ہے اور باہمی برتری اور فضیلت کے لیے بر و تقویٰ کو بنیاد قرار دیتا ہے، لیکن معاشرتی معاملات میں دونوں کے

درمیان مکمل فطری مساوات کا قائل نہیں ہے اور اس کے نزدیک یہ غیر فطری اور مصنوعی بات ہے، اس لیے کہ مرد اور عورت کی جسمانی تخلیق، نفسیات اور ان کے فطری فرائض میں ایسا تنوع موجود ہے جس سے نہ تو انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے تبدیل کرنے کی کوئی صورت ممکن ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان جسمانی تخلیق، نفسیاتی رجحانات اور فطری ذمہ داریوں میں جو واضح فرق موجود ہے، اسلام ان کے باہمی حقوق وفرائض کے تعین وتقسیم میں اسی کو بنیاد قرار دیتا ہے اور اس کے مطابق دونوں کے لیے احکام وقوانین میں اس نے فرق وامتیاز قائم رکھا ہے۔

اسلام نے عورت کے معاشی حقوق اور تحفظات کا متوازن نظام پیش کیا ہے۔ یہ شعبہ ایسا ہے جہاں بڑے بڑے نظام افراط وتفریط کا شکار ہو گئے ہیں، لیکن اسلام نے اعتدال اور توازن کا اصول یہاں بھی پوری طرح قائم رکھا ہے۔ اسلام نے فرائض کی ایک فطری تقسیم کر دی ہے کہ گھر کے اندر کی ذمہ داری عورت کی ہے اور باہر کی ذمہ داری مرد پر ہے اور مرد و عورت کی خلقت میں فطرت نے جو طبعی فرق رکھا ہے، اس کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے سوا کوئی تقسیم ممکن ہی نہیں ہے۔ چونکہ گھر کے اندر کا نظام عورت کی سپرداری میں ہے، اس لیے باہر کی کوئی ڈیوٹی اس کے سپرد کرنا اس پر ظلم ہے۔ اسی لیے عورت کے تمام اخراجات مرد کے ذمہ لگا دیے گئے ہیں اور ان اخراجات کے سلسلہ میں عورت کو عدالتی تحفظات بھی فراہم کیے گئے ہیں تاکہ کوئی مرد اس معاملے میں عورت کے ساتھ ناانصافی نہ کر سکے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام عورت کے ملازمت کرنے پر کلی پابندی لگاتا ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ اسلام عورت کو ایسی ہر ملازمت کی اجازت دیتا ہے جس سے اس پر اس کی طاقت وصلاحیت سے زیادہ بوجھ نہ پڑے۔

اسی طرح اسلام کے نزدیک ''خاندان'' سوسائٹی کی بنیادی اکائی ہے جس کا تحفظ ضروری ہے اور خاندان کا یونٹ اس کے سوا قائم نہیں رہ سکتا کہ رشتوں کا تقدس تسلیم کیا جائے، مرد و عورت کے کسی ایسے باہمی میل جول کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے جس کے نتیجے میں آزادانہ جنسی ملاپ اور رشتوں کے تقدس کی پامالی اور خاندان کے بکھر جانے کی صورت پیدا ہو جائے۔ نیز خاندان کے یونٹ کا ڈسپلن اور نظم برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ گھر کے سسٹم میں فائنل اتھارٹی ایک ہو، اس لیے اسلام خاندان کے نظام میں مرد کی برتری کی تعلیم دیتا ہے، البتہ مرد کی سنیارٹی کو خاندان

کے تحفظ کی ضمانت قرار دیتے ہوئے عورت کو وہ تمام حقوق فراہم کرتا ہے جو ایک شہری، ایک مسلمان اور سوسائٹی کے ایک فرد کے طور پر اس کے لیے ضروری ہیں۔ نسل انسانی کی نشوونما اور ترقی میں عورت کا بھی اتنا ہی عمل دخل ہے جتنا مرد کا ہے، اس لیے اسلام نے عورت کے وجود کو نہ صرف تقدس واحترام بخشا بلکہ ان کی اہمیت وافادیت کا بھرپور اعتراف کیا ہے اور اسے ان تمام حقوق اور تحفظات سے نوازا ہے جو مرد اور عورت کے فطری فرائض کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔

مثال کے طور پر آزادی رائے کو انسانی حقوق میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ یہ منظر پیش کرتی ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک بوڑھی خاتون خولہ بنت حکیمؓ امیر المومنین حضرت عمر کو سرعام روک کر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے: ’’عمر! وہ دن یاد رکھو جب تمہیں عکاظ کے بازار میں صرف عمر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور آج تم امیر المومنین کہلاتے ہو، اس لیے خدا سے ڈرتے رہو اور انصاف کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو‘‘۔ حضرت عمرؓ اس بڑھیا کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہیں اور اپنے عمل کے ساتھ دنیا کو بتا رہے ہیں کہ انسانی معاشرہ میں مرد کی طرح عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ راہ چلتے امیر المومنین کا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے اور انصاف کی تلقین کرے۔

اسلام مرد کی طرح عورت کو بھی یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے جائز حق کے لیے ڈٹ جائے اور اس کے خلاف کسی بڑے سے بڑے دباؤ کی پروا نہ کرے۔ حضرت عائشہؓ کی باندی بریرہ کو آزاد ہونے کے بعد شرعی طور پر یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اپنے سابقہ خاوند مغیثؓ کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو اس سے الگ ہو جائے۔ بریرہؓ نے اپنا یہ حق استعمال کیا تو مغیثؓ پریشان ہو گئے۔ وہ مدینہ کی گلیوں میں روتے پھرتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو دوبارہ میرے ساتھ رہنے پر آمادہ کرے؟ اس کی حالت دیکھ کر خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے بات کی اور اسے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کے لیے کہا۔ بریرہؓ نے صرف یہ پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صرف مشورہ ہے، تو بریرہؓ نے دوٹوک کہہ دیا کہ میں یہ مشورہ قبول نہیں کر سکتی۔ چنانچہ بریرہؓ مغیثؓ سے الگ رہنے کے فیصلے پر قائم رہی اور اپنے عمل کے ساتھ اسلام کا یہ اصول دنیا کے سامنے پیش کیا کہ عورت اپنے جائز حق سے از خود دستبردار نہ ہونا چاہے تو اسے اس کے حق سے کسی صورت میں محروم نہیں کیا جا سکتا۔

خلافت راشدہ کے دور میں عورت اجتماعی معاملات میں بھی مشاورت کے دائرہ میں شامل رہی ہے، بالخصوص ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن کو تو اس دور میں امت مسلمہ کی اجتماعی راہنمائی کا مقام حاصل تھا۔ اہم امور میں ان سے مشورہ کیا جاتا تھا اور ان سے اجتماعی معاملات میں راہ نمائی حاصل کی جاتی تھی، حتیٰ کہ ایک موقع پر مدینہ منورہ کے امیر مروانؓ بن حکم نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''جب تک ازواج مطہرات موجود ہیں، ہمیں دوسرے لوگوں سے مسائل دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے!'' اور عورتوں سے متعلقہ امور میں تو مشورہ ہی عورتوں سے کیا جاتا تھا۔ مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے ذمہ لگایا کہ وہ سمجھدار عورتوں سے مشورہ کر کے بتائیں کہ ایک عورت خاوند کے بغیر کتنا عرصہ آسانی کے ساتھ گزار سکتی ہے۔ چنانچہ ان کی رائے پر حضرت عمرؓ نے حکم جاری کیا کہ ہر فوجی کو چھ ماہ کے بعد کچھ دنوں کے لیے ضرور گھر بھیجا جائے۔

خلافت راشدہ کے دور میں خواتین کو علم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کے آزادانہ مواقع میسر تھے۔ حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھ سینکڑوں خواتین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات امت تک پہنچانے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے شاگردوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ وہ نہ صرف احادیث بیان کرتی تھیں، بلکہ فتویٰ بھی دیتی تھیں اور ان کے فتوے پر عمل کیا جاتا تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے جو فتاویٰ منقول ہیں، ان سے ایک بڑا مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے بڑے بڑے علماء صحابہ مسائل میں رجوع کرتے تھے اور اپنے اشکالات کا تسلی بخش جواب پاتے تھے۔ اسی طرح حضرت ام سلمہؓ سے بھی علمی معاملات میں رجوع کیا جاتا تھا۔ الغرض علم اور افتاء کا میدان بھی خواتین کے لیے کھلا تھا اور اس میں ان کی اہمیت تسلیم کی جاتی تھی۔

الغرض اسلام عورت کو انسانی زندگی کی گاڑی کا برابر کا پہیہ تسلیم کرتا ہے اور اس کو وہ تمام حقوق دیتا ہے جو انسانی معاشرہ میں اپنا فطری کردار ادا کرنے کے لیے اسے درکار ہیں، البتہ فرائض کی تقسیم وہ مرد اور عورت کے طبعی تقاضوں اور فطری ضروریات کو سامنے رکھ کر کرتا ہے اور عورت کو ہر ایسے عمل سے روکتا ہے جو اس کے نسوانی وقار، فطری ذمہ داریوں اور طبعی مناسبت کے منافی ہو اور اسلام کا یہ اصول حق تلفی نہیں بلکہ عین انصاف ہے جس کے بغیر انسانی معاشرت کو متوازن رکھنا ممکن

ہی نہیں ہے۔

جستجو، تنقیدی غور و فکر اور اختلاف رائے

سوال ۱: اسلام جستجو اور تنقیدی غور و فکر کو کیسے پروان چڑھاتا ہے تاکہ نوجوان نسل مختلف آرا اور آپشنز میں ذہنی دلچسپی لے اور ان پر غور کر سکے؟

سوال ۲: کیا تحقیق اور جستجو کے حوالے سے کوئی اسلامی اپروچ پائی جاتی ہے؟

سوال ۳: اسلام طالب علموں کو اپنا استدلال پیش کرنے اور اپنی رائے کو بیان اور واضح کرنے کے حوالے سے کیا مدد فراہم کر سکتا ہے؟

سوال ٤: اسلام نوجوانوں کو دوسرے کے ایسے خیالات کو سمجھنے اور انہیں بیان کرنے کے حوالے سے کیا مدد دے سکتا ہے جن سے ضروری نہیں کہ وہ متفق ہوں؟

جواب: قرآن کریم غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، تاریخ کے حوالے سے بھی، اقوام کے عروج و زوال کے حوالے سے بھی، اردگرد کے زمینی اور ماحولیاتی حقائق کے مشاہدہ کے حوالے سے بھی، آیات قرآنی پر تدبر کے حوالے سے بھی، کائنات کے مشاہدات اور سائنسی ارتقا کے حوالے سے بھی اور سوسائٹی کے مسائل پر بحث و مباحثہ کے حوالے سے بھی۔ اسلام سوسائٹی کے ہر فرد کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھائے، حکمرانوں اور مقتدر طبقات پر تنقید کرے اور سوسائٹی کے مفاد کے لیے ہر سطح پر مشورہ دے۔ اسلام جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کا یہ مقام تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی بات حرف آخر ہے۔ وہ خلفائے راشدین کو بھی مجتہد کے درجے میں تسلیم کرتا ہے جن کی ہر بات میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال موجود ہے اور ان کے کسی بھی فیصلے اور رائے سے اختلاف کی نہ صرف گنجائش موجود ہے، بلکہ بے شمار لوگوں نے ان کی بہت سی آرا سے عملاً اختلاف کیا ہے اور علمی اختلاف سے اسلامی کتب بھری پڑی ہیں۔ اسلام بنیادی طور پر تحقیق و جستجو کا دین ہے اور ایسے معاملات میں اسلامی لٹریچر سے ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

اختلاف رائے انسانی فطرت کا اظہار اور عقل و دانش کا خوش ذائقہ ثمر ہے جو اپنی جائز حدود

کے اندر اور جائز طریقہ سے ہو تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق امت کے لیے رحمت بن جاتا ہے اور اسے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے نہایت خوب صورت انداز میں یوں بیان فرمایا ہے کہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان مسائل میں اختلاف نہ ہوتا تو مجھے یہ بات بالکل اچھی نہ لگتی، کیونکہ اس طرح امت ہر مسئلہ میں ایک لگے بندھے راستے پر چلنے کی پابند ہو جاتی۔ اب اختلاف ہے، ایک ایک مسئلہ میں چار چار پانچ پانچ قول ہیں، تنوع ہے، چوائس ہے اور امت کے ارباب علم و دانش اپنے اپنے فہم، ذوق، ضرورت، حالات اور سہولت کے مطابق ان میں سے کسی ایک کے انتخاب کا حق رکھتے ہیں جس سے علم و دانش کی دنیا رنگا رنگ خوشنما پھولوں کے ایک چمنستان کا روپ اختیار کر گئی ہے۔

اسلام گفتگو اور مکالمہ میں انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت بھی کرتا ہے اور دوسروں کے موقف کو صحیح طور پر دیانت داری کے ساتھ سمجھنا، بیان کرنا اور دلیل کے ساتھ اس کا جواب دینا "وجادلهم بالتي هي احسن" کا مصداق ہے جو اس سلسلے میں قرآن کریم کی ہدایت ہے۔ اسی طرح مقابل فریق کے طرز عمل کی خامیوں کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنا بھی اسلامی اخلاقیات کا حصہ ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ایک روز مستورد قرشی رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "قیامت سے پہلے رومی لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے گی۔" روم اس دور میں مسیحی سلطنت کا پایہ تخت تھا اور رومیوں سے عام طور پر مغرب کے مسیحی حکمران ہوتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو چونکے اور پوچھا کہ "دیکھو! کیا کہہ رہے ہو؟" مستورد قرشی نے کہا کہ میں وہی کہہ رہا ہوں جو میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر ان رومیوں میں چار خصلتیں موجود ہوں گی (جن کی وجہ سے وہ انسانی سوسائٹی پر غالب آئیں گے):

پہلی یہ کہ وہ فتنے اور آزمائش کے وقت دوسرے لوگوں سے زیادہ تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کریں گے۔ دوسری یہ کہ وہ مصیبت گزر جانے کے بعد سنبھلنے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ تیز

ہوں گے۔ تیسری یہ کہ وہ شکست کے بعد دوبارہ جلدی حملہ آور ہونے والے ہوں گے۔ چوتھی یہ کہ وہ اپنے یتیموں، مسکینوں اور کمزوروں کے لیے اچھے لوگ ثابت ہوں گے۔ اتنا کہہ کر حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ ان میں ایک اور پانچویں خصلت بھی ہوگی جو اچھی اور خوب ہوگی کہ وہ لوگوں کو حکمرانوں کے مظالم سے روکنے میں پیش پیش ہوں گے۔

آج مغرب سے ہمیں شکوہ ہے کہ مغرب ہمارے خلاف صف آرا ہے اور ہمیں اپنا سب سے بڑا حریف سمجھ کر زیر کرنے کے لیے جو کچھ وہ کر سکتا ہے، کر رہا ہے۔ مغرب سے ہمیں یہ بھی شکایت ہے کہ وہ ہم پر اپنی ثقافت مسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور انسانی حقوق کے خودساختہ فلسفے کے ہتھیار سے ہماری اخلاقی، دینی اور معاشرتی اقدار کو ملیامیٹ کرنے کے درپے ہے۔ یہ سب شکایات بجا ہیں، لیکن ہمیں حضرت عمرو بن العاصؓ کے مذکورہ ارشاد کے حوالے سے مغرب کے ساتھ اپنا تقابل بھی کر لینا چاہیے کہ:

(۱) مصیبت اور مشکل کے وقت مغربی اقوام اور ہمارے طرز عمل میں کیا فرق ہوتا ہے؟

(۲) مصیبت کے گزر جانے کے بعد سنبھلنے میں ہم کتنا وقت لیتے ہیں؟

(۳) شکست کے بعد اس کی تلافی کرنے یا ماتم کرتے رہنے میں سے ہم کون سا راستہ اختیار کرتے ہیں؟

(۴) معاشرہ کے نادار اور بے سہارا لوگوں کی کفالت کے لیے ہمارے پاس کون سا نظام موجود ہے؟

(۵) عام لوگوں کو حکام کے مظالم اور ریاستی جبر سے بچانے کے لیے ہمارا ''معاشرتی شعور'' کس مرحلے میں ہے۔

انسانی حقوق کے حوالے سے مغرب کا گزشتہ نصف صدی کا ریکارڈ سامنے رکھا جائے تو یہ شکایت ضرور سامنے آتی ہے کہ مسلم ممالک کے بارے میں مغرب دوہرا معیار رکھتا ہے اور جن ممالک کی حکومتیں مغرب کے مفادات کی نگہبانی کر رہی ہیں، وہاں کے عوام کے انسانی اور سیاسی حقوق کے معاملے میں مغرب نے مجرمانہ غفلت اور خاموشی اختیار کر رکھی ہے، لیکن اس سے ہٹ کر عمومی تناظر میں دیکھا جائے تو اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ آج مغربی ممالک دنیا بھر کے

مختلف خطوں کی حکومتوں کے ستائے ہوئے مظلوموں کی سب سے بڑی پناہ گاہ بھی ہیں اور معاشرے کے نادار اور معذور افراد کے لیے اگر زندگی کی سب سے زیادہ سہولتیں میسر ہیں تو وہ بھی انہی مغربی ممالک میں ہیں۔

درست معلومات پر مبنی اور ذمہ دارانہ عملی اقدام

سوال ۱: معاصر دنیا میں درست معلومات پر مبنی اور ذمہ دارانہ اقدام کرنے کے بارے میں اسلام نوجوان مسلمانوں کی کیسے مدد کر سکتا ہے؟

سوال ۲: معاصر ذرائع ابلاغ سے نبرد آزما ہونے اور سچ کو جھوٹ سے الگ کرنے کے حوالے سے اسلام نوجوان مسلمانوں کی کیسے راہنمائی کر سکتا ہے؟

جواب: قرآن کریم نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ محض سنی سنائی خبروں پر کوئی فیصلہ نہ کریں جب تک کہ ان کی تحقیق نہ کر لیں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ نادانی میں کسی گروہ کو نقصان پہنچا بیٹھیں اور پھر انہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے، (سورۃ الحجرات)۔

اسی طرح قرآن کریم کی ہدایت ہے کہ جو لوگ امن یا خوف کی ہر خبر کو پھیلا دیتے ہیں، ان کا رویہ غیر ذمہ دارانہ ہے اور اگر وہ خبر کی تحقیق اور اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھنے والوں تک خبر پہنچائیں تو یہ زیادہ بہتر ہے، (سورۃ النساء)۔

خودکش حملے: کیپیٹل ٹاک کے سوالات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔نومبر ۲۰۰۸ء)

...... جیو ٹی وی کے معروف پروگرام ’’کیپیٹل ٹاک‘‘ کی دو نشستوں میں مجھے پروفیسر عبد الجبار شاکر، مولانا ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی اور مولانا امین شہیدی کے ساتھ مدعو کیا گیا۔ان نشستوں میں راقم الحروف نے مختلف سوالات کے جواب میں جو گزارشات پیش کیں، ان کا خلاصہ درج کیا جا رہا ہے۔

سوال: خود کش حملوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: خودکش حملہ ایک جنگی ہتھیار ہے جو مظلوم قومیں ہمیشہ سے استعمال کرتی آرہی ہیں۔ یہ ہتھیار جاپانیوں نے بھی استعمال کیا تھا، جنگ عظیم میں برطانیہ نے بھی استعمال کیا تھا اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاک فوج نے بھی چونڈہ کے محاذ پر استعمال کیا تھا۔ دوسرے جنگی ہتھیاروں کی طرح یہ بھی میدان جنگ میں استعمال ہو تو جائز ہے، لیکن پرامن ماحول میں اس کا استعمال ناجائز ہوگا۔

سوال: پاکستان میں خود کش حملوں کے بارے میں علماء کا فتویٰ شائع ہوا ہے کہ یہ حرام ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: پاکستان میں خودکش حملوں کو ناجائز کہنے والوں میں خود میں بھی شامل ہوں، اس لیے کہ پاکستان اس حوالے سے نظریاتی طور پر ایک اسلامی ریاست ہے کہ پاکستان کا دستور قرارداد مقاصد کو اپنی بنیاد قرار دیتا ہے، قرآن وسنت کی بالادستی کو تسلیم کرتا ہے، اسلام کو ریاست کا مذہب تسلیم کرتا ہے، قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی سے پارلیمنٹ کو روکتا ہے اور قرآن وسنت کے احکام وقوانین کے نفاذ کا وعدہ کرتا ہے، اس لیے جب تک یہ دستوری پوزیشن موجود ہے، پاکستان عملی طور پر کچھ بھی ہو، مگر نظریاتی طور پر بہرحال ایک اسلامی ریاست ہے اور اسلامی ریاست میں حکومت کے خلاف کسی بھی مطالبہ کے لیے ہتھیار اٹھانا جائز نہیں ہے۔

سوال: قبائلی علاقہ میں جو فوجی آپریشن اور خود کش حملے ہو رہے ہیں، ان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: اس وقت پاکستان کی مغربی سرحد پر جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں ہمارے خیال میں تین قسم کے عناصر ملوث ہیں:

(۱) وہ انتہا پسند اور جذباتی مسلمان بھی ان میں شامل ہیں جو نفاذ شریعت کے سلسلے میں حکومت کے مسلسل منفی طرز عمل کے باعث ردعمل کا شکار ہو کر ایسا کر رہے ہیں۔ ان کے طریق کار سے ہمیں اختلاف ہے، لیکن ان کا یہ موقف بہرحال درست ہے کہ ملک بھر میں اور خاص طور پر قبائلی علاقوں میں شرعی نظام نافذ کیا جائے۔

(۲) دوسرے نمبر پر ان واقعات میں بین الاقوامی محرکات کارفرما ہیں اور مختلف قوتیں اس میں ملوث ہو کر اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان میں امریکہ، اسرائیل اور بھارت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) اور تیسرے نمبر پر بہت سے جرائم پیشہ لوگ بھی اس فضا کی آڑ میں اپنے مذموم مقاصد پورا کرنے کے لیے اس میں شامل ہو گئے ہیں جیسا کہ ایسے مواقع پر اس طرح ہوتا ہے، اس لیے اس ''مبینہ دہشت گردی'' پر قابو پانے کے لیے ان تمام عناصر کو سامنے رکھ کر صورتحال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ہوگا، ورنہ حالات کو کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

سوال: علمائے کرام اور آپ حضرات اس سلسلے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

جواب: ہم اس صورتحال میں ان ناراض حضرات سے بات کرنے کے لیے تیار ہیں جو نفاذ شریعت کے لیے ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہم ان کی منت کریں گے اور ان کو پوری طرح سمجھانے کی کوشش کریں گے، لیکن اس کے لیے پیشگی طور پر ضروری ہے کہ حکومت بھی اس سلسلے میں سنجیدگی کا مظاہرہ کرے اور اس کا ثبوت دے اور میرے نزدیک اس سنجیدگی کا ثبوت دو صورتوں میں ہو سکتا ہے: ایک یہ کہ پارلیمنٹ کی سطح پر فیصلہ کیا جائے کہ قبائلی علاقوں کا مسئلہ فوجی آپریشن کی بجائے مذاکرات کے ذریعے حل کیا جائے گا، اور دوسرا یہ کہ سوات اور مالاکنڈ ڈویژن کے لیے جس ''شرعی نظام عدل ریگولیشن'' کے نفاذ کا حکومت اس علاقے کے لوگوں سے بار بار وعدہ کر رہی ہے

اور اس کا کئی بار اعلان ہو چکا ہے، حکومت علامت کے طور پر وہاں کے لوگوں کو اعتماد میں لے کر وہ شرعی نظام عدل ریگولیشن نافذ کر دے۔ جب حکومت یہ دو کام پیشگی کر لے گی تو باقی ماندہ امور کے لیے ہم وہاں جانے اور کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔

مذہبی طبقات، دہشت گردی، طالبان

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ نومبر ۲۰۰۹ء)

(مذہبی طبقات، دہشت گردی اور طالبان کے بارے میں معروضی صورتحال کے حوالے سے بھارت کے معروف دانشور جناب یوگندر سکند کا ارسال کردہ سوالنامہ)

طالبان طرز کے گروپ اور موجودہ کشمکش کا پس منظر

سوال: پاکستان میں موجودہ کشمکش کے بارے میں اور خاص طور پر طالبان کی قسم کے گروہوں کے سامنے آنے سے جو صورتحال پیدا ہوئی ہے، اس کے اسباب کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ اس میں پاکستانی ریاست، ایجنسیوں اور امریکہ کا کیا کردار ہے؟

جواب: پاکستان کی موجودہ کشمکش کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اس فکری اور نظریاتی پس منظر کو سامنے رکھا جائے جس میں یہ کشمکش اس مقام تک پہنچی ہے۔ یہ فکری اور نظریاتی کشمکش قیامِ پاکستان کے بعد فوراً ہی شروع ہوگئی تھی کہ پاکستان کے معاشرتی ڈھانچے اور دستوری وقانونی نظام کی بنیاد کیا ہوگی؟ وہ عناصر جنہوں نے برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے داخلے کے وقت سے ہی اس خطے پر برطانوی راج کی مزاحمت کا آغاز کر دیا تھا اور مختلف اوقات، مراحل اور علاقوں میں سراج الدولہؒ سے لے کر شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی تحریکِ ریشمی رومال تک مسلح مزاحمت، اور اس کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک عدم تشدد پر مبنی جدوجہد کے ذریعے برطانوی تسلط سے وطن عزیز کی آزادی کے لیے متحرک کردار ادا کیا تھا، ان کا مقصد اور ایجنڈا یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے اور اسلام کے نام پر قائم ہونے والی اس نئی ریاست میں معاشرتی ڈھانچے کی تشکیل اسلامی شریعت اور احکام وقوانین کی بنیاد پر ہو، اور پاکستان ایک نظریاتی اسلامی ملک کے طور پر دنیا میں اپنا کردار ادا کرے۔

سراج الدولہؒ، ٹیپو سلطانؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، حاجی شریعت اللہؒ، سردار احمد خان کھرلؒ، تیتو میرؒ، فقیر ایپیؒ، حاجی صاحب ترنگزئیؒ، اور ۱۸۵۷ء کے ہزاروں مجاہدین سمیت ان گروہوں میں سے جس گروہ کو جہاں موقع ملا، اس نے اپنے زیر تسلط علاقے میں اسلامی شریعت کا اجرا ونفاذ کر کے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے مقصد کو واضح کیا۔ حتیٰ کہ برصغیر کے بڑے علاقے میں مسلح جدوجہد ترک کر کے جب پُر اَمن اور عدمِ تشدد پر مبنی تحریک آزادی کو آگے بڑھایا گیا تو بھی مقصدِ آزادی یہی قرار پایا کہ برطانوی تسلط سے نجات پانے کے بعد مسلم معاشرہ میں اسلامی شریعت کے اجرا ونفاذ کا اہتمام کیا جائے گا۔ چنانچہ مسلم لیگ کا دوقومی نظریہ، مولانا محمد علی جوہرؒ کی تحریکِ خلافت اور مجلسِ احرارِ اسلام کی حکومتِ الٰہیہ اسی جذبہ اور نظریہ کی ترجمان اور عکاس تھی۔

دوسری طرف وہ عناصر اور طبقات جنہوں نے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے سو سالہ، اور باقاعدہ برطانوی راج کے نوے سالہ دور میں، ایک نوآبادیاتی نظام کے کل پرزوں کا کردار ادا کیا تھا، اور اپنے فکر ومزاج کو اسی کے مطابق ڈال کر اپنا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا، پاکستان کے معاشرتی اور سیاسی ڈھانچے میں کوئی نظریاتی اور تہذیبی انقلاب ان کے مزاج اور مفادات کے خلاف تھا۔ اس لیے انہوں نے نوآبادیاتی نظام کو برقرار رکھنے اور اپنا تمام وزن اس کے پلڑے میں ڈالنے کا فیصلہ کیا اور اب تک وہ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ ان عناصر وطبقات کو تین معاملات میں برتری حاصل رہی ہے:

☆ برطانوی دور میں سیاسی، انتظامی اور معاشی نظم ونسق ان کے ہاتھ میں تھا جو آزادی اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی انہی کے ہاتھ میں رہا۔

☆ بین الاقوامی رجحانات بالخصوص نئی عالمی استعماری قوتوں کی پشت پناہی بھی انہیں حاصل چلی آرہی ہے، اس لیے کہ جن قوتوں نے خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرا کے اس کے مرکز ترکی کو سیکولر جمہوریہ بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی، انہیں اسلام کے نام پر ایک نئے ملک کا قیام اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کسی طرح گوارا نہیں تھی۔ جبکہ سرمایہ دارانہ بلاک اور سوشلسٹ بلاک کے درمیان جاری عالمی سرد جنگ میں سرمایہ دارانہ بلاک کی ضرورت

یہ تھی کہ سوویت یونین کے خلاف مسلمانوں کے مذہبی رجحانات بالخصوص ان کے جذبۂ جہاد سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس لیے مغربی بلاک نے یہ حکمتِ عملی طے کی مسلمانوں کے جذبۂ جہاد سے تو سوویت یونین کے خلاف فائدہ اٹھایا جائے لیکن ان کے نفاذِ شریعت کے پروگرام کو کسی جگہ بھی کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ سرمایہ دارانہ بلاک کی یہ حکمتِ عملی پاکستان کے ان داخلی عناصر و طبقات کی پشت پناہ بن گئی جو اس ملک میں نوآبادیاتی نظام کے تسلسل کو باقی رکھنے میں اپنی عافیت محسوس کر رہے ہیں۔

☆ ملک کے تعلیمی نظام پر بھی انہی کا کنٹرول تھا، اس لیے اس بات کا بطور خاص اہتمام کیا گیا کہ ریاستی تعلیمی اداروں میں ایسے رجالِ کار اور افراد تیار نہ ہونے پائیں جو نوآبادیاتی نظام میں کسی قسم کی تبدیلی اور اسلامی شریعت کے احکام و قوانین کے نفاذ و اجرا کا ذریعہ بن سکیں۔

اس تناظر میں وہ عناصر و طبقات جو برطانوی تسلط سے آزادی کا اصل مقصد نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ اور اسلامی احکام و قوانین کے اجرا و نفاذ کو قرار دیے ہوئے تھے، انہوں نے پُراَمن سیاسی، جمہوری اور دستوری جدوجہد کے ذریعے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ اور پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں قراردادِ مقاصد کی منظوری سے لے کر ۱۹۷۳ء کے دستور میں ملک کو اسلامی ریاست قرار دلوانے، اور ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی ضمانت حاصل کرنے تک، تمام مراحل پُراَمن سیاسی اور دستوری جدوجہد کے ذریعے طے کیے۔ انہیں دوسو سالہ تحریکِ آزادی کے شاندار پسِ منظر کے ساتھ ساتھ پاکستانی عوام کی اسلام کے ساتھ جذباتی وابستگی اور نفاذِ اسلام کے لیے دینی قوتوں کے متحرک کردار کی پشت پناہی حاصل تھی اور ملک کی رائے عامہ ان کے ساتھ تھی، اس لیے وہ تمام ترکاوٹوں کے باوجود مسلسل پیشرفت کرتے رہے۔

اس دوران ایک اور اہم واقعے نے نفاذِ شریعت کے حوالے سے حکمران طبقات سے عوام کی مایوسی میں اضافہ کیا۔ وہ یہ کہ بہاولپور، سوات، قلات، خیرپور اور دیگر ایسی ریاستوں میں جہاں برطانوی استعمار کے تسلط کے دوران عدالتی سطح پر شرعی قوانین کی عملداری موجود تھی، پاکستان کے ساتھ ان کے الحاق کے ساتھ ہی ان میں شرعی قوانین کا نظام ختم کر دیا گیا۔ جس نے عوام اور دینی

حلقوں میں اس سوچ کو پختہ کر دیا کہ آزادی کے مقصد کے حصول، نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ، اور اسلامی شریعت کی عملداری کے لیے جو کچھ کرنا ہے خود انہی کو کرنا ہے، اور ملک کی رولنگ کلاس سے اس کے لیے کسی حمایت یا سہولت کی توقع عبث ہے۔

اس پسِ منظر میں جب افغانستان میں سوویت یونین کی باقاعدہ افواج کی آمد کے بعد وہاں جہاد کے عنوان سے قومی خودمختاری اور آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو پاکستان کے دینی حلقوں اور عوام کا اس طرف متوجہ ہونا ایک فطری امر تھا۔ جہادِ افغانستان میں افغان عوام کا ایجنڈا یہ تھا کہ وہ سوویت یونین کے تسلط سے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے، جبکہ پاکستان کے دین کے ساتھ جذباتی وابستگی رکھنے والوں کا ایجنڈا یہ تھا کہ وہ اپنے افغان بھائیوں کی مدد کے ساتھ ساتھ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ سوویت یونین کی فوجوں کی واپسی کے بعد جب افغانستان میں اسلامی شریعت کی عملداری قائم ہوگی تو اس سے پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد کرنے والوں کو بھی تقویت ملے گی اور ان کے لیے اپنے مقصد اور منزل کی طرف پیشرفت آسان ہو جائے گی۔ سوویت یونین کی شکست اور عالمی سرد جنگ میں سرمایہ دارانہ بلاک کی کامیابی کی حد تک یہ ایجنڈا عالم اسلام کے بیشتر ممالک اور مغربی استعماری قوتوں کے مفاد میں تھا، اس لیے انہوں نے افغان جہاد کو مکمل طور پر سپورٹ کیا، لیکن یہ طے کر کے کیا کہ سوویت یونین کے خلاف مسلمانوں کے جذبۂ جہاد سے تو پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے مگر اس کے نتیجے میں شریعت کے نفاذ کے ایجنڈے کو افغانستان میں پوری قوت کے ساتھ روک دیا جائے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، جونہی جہادِ افغانستان نے روسی فوجوں کی افغانستان سے واپسی اور عالمی سطح پر سوویت بلاک کے بکھر جانے کا ہدف حاصل کر لیا، مجاہدین کے بارے میں سرمایہ دارانہ بلاک کا طرزِ عمل تبدیل ہو گیا۔ افغانستان میں مجاہدین کی مستحکم حکومت بنوانے کی بجائے ان کے مختلف گروپوں کو باہمی خانہ جنگی کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا بلکہ اس خانہ جنگی کی حوصلہ افزائی کر کے مجاہدین کو بتدریج کمزور کرتے چلے جانے کی حکمتِ عملی طے کر لی گئی۔ جس کے نتیجے میں تاریخِ انسانی کا یہ اندوہناک المیہ سامنے آیا کہ جن ممالک اور قوتوں نے جہادِ افغانستان کے ثمرات دونوں ہاتھوں سے سمیٹے، انہوں نے جنگ لڑنے اور قربانیاں دینے والے مجاہدین کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ

دیا۔ جہادافغانستان کے نتیجے میں:

☆ عالمی سطح پر سوویت یونین کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ بلاک کو فتح حاصل ہوئی،

☆ مشرقی یورپ کی ریاستیں آزاد ہوئیں،

☆ بالٹیک ریاستوں نے کسی جدوجہد کے بغیر آزادی کی منزل حاصل کر لی،

☆ وسطی ایشیا کی ریاستوں نے خودمختاری حاصل کی،

☆ دیوار برلن ٹوٹی اور جرمنی ایک بار پھر متحد ہوگیا،

☆ پاکستان نے بلوچستان کے ساحلوں تک سوویت یونین کی رسائی کے خوف سے نجات پائی،

مگر ان سب نے جہادِ افغانستان کے ثمرات سے اپنی اپنی جھولیاں بھرنے کے بعد مجاہدین کو تنہا چھوڑ دیا۔ جہادِ افغانستان سے بیرونی قوتوں نے اپنے اپنے مقاصد حاصل کر لیے لیکن جنگ لڑنے اور اس میں لاکھوں جانوں کی قربانی دینے والوں کا اپنا مقصد، کہ افغانستان ایک اسلامی ریاست بنے اور اس میں شریعت اسلامی کا نفاذ ہو، ادھورا رہ گیا۔ مجاہدین کے مختلف گروپوں کو اکٹھا بٹھانا، ان کا کوئی مشترکہ ایجنڈا طے کرنا اور ان کے مستقبل کی حدود اور دائرۂ کار کا تعین کرنا جہادِ افغانستان میں ان کو سپورٹ کرنے والوں اور ان کو قربانیوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی ذمہ داری تھی۔ لیکن جب سب نے اپنا اپنا حصہ وصول کر کے گھروں کی راہ لی اور مجاہدین کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تو ظاہر ہے کہ اب مجاہدین کے مختلف گروپوں نے اپنا اپنا ایجنڈا خود ہی طے کرنا تھا جو انہوں نے کیا اور اسی کے تلخ نتائج نہ صرف جنوبی ایشیا کے پورے خطے کو بلکہ مجاہدین سے لاتعلقی اختیار کرنے والوں کو بھی بھگتنا پڑ رہے ہیں۔

طالبان کے مختلف گروہوں نے اسی صورتحال کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور اس پس منظر سے آنکھیں بند کرتے ہوئے ان کے کردار اور نفسیات کو سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ جہادِ افغانستان میں حصہ لینے والے مجاہدین کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ان کے کردار کا الگ الگ تجزیہ کرنا بھی موجودہ صورتحال کے صحیح ادراک کے لیے ضروری ہے۔

جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کا ایک بڑا حصہ افغانستان کے ان باشندوں پر مشتمل ہے

جنہوں نے سوویت یونین کے فوجی تسلط سے آزادی اور اپنے ملک کے اسلامی نظریاتی تشخص کی بحالی کے لیے جنگ لڑی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ جہادِ افغانستان کے نتیجے میں سوویت فوجوں کی واپسی اور مجاہدین کی حکومت قائم ہو جانے کے باوجود جہاد کے اصل مقصد یعنی نفاذِ شریعت کی طرف کوئی مؤثر پیشرفت نہیں ہو رہی بلکہ بدامنی، افراتفری، لاقانونیت اور خانہ جنگی بڑھتی جا رہی ہے، تو وہ اس کے ردعمل میں طالبان کی صورت میں سامنے آئے اور ملک کے ایک بڑے حصے میں پانچ سال تک حکومت قائم کر کے جہادِ افغانستان کے منطقی ہدف کو دنیا کے سامنے واضح کر دیا۔ اور اب وہ امریکی اتحاد کی فوجوں کے خلاف اسی طرح جنگ لڑ رہے ہیں جیسے انہوں نے سوویت یونین کی فوجوں کے خلاف لڑی تھی اور وہ اسے بھی آزادی اور خودمختاری کی جنگ سمجھتے ہیں۔

جہادِ افغانستان میں شامل مجاہدین کا دوسرا بڑا حصہ ان ہزاروں پاکستانی نوجوانوں پر مشتمل ہے جو سوویت فوجوں کی واپسی کے بعد وطن واپس آئے۔ ان کے مستقبل کے بارے میں ان کی راہنمائی اور ان کے جذبات و تجربات کو صحیح رخ پر لگانے کے لیے منصوبہ بندی پاکستان کے قومی حلقوں کی ذمہ داری تھی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ شاید کچھ ذمہ دار حلقوں نے انہیں اس لیے کھلا چھوڑ دیا ہو کہ ان سے کشمیر میں اسی طرح فائدہ اٹھایا جا سکے گا جس طرح افغانستان میں ان سے فائدہ اٹھایا گیا تھا، مگر غالباً عالمی قوتوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ جس کے نتیجے میں مجاہدین کے ان گروپوں نے بھی اپنا اپنا ایجنڈا خود طے کیا اور اپنے اپنے ذہنی رجحانات کے مطابق میدان کا منتخب کر لیا۔ بہت سے افراد کی صلاحیتیں فرقہ وارانہ کشمکش کو بڑھانے میں استعمال ہوئیں جبکہ بہت سے گروہوں نے پاکستان کو افغانستان پر قیاس کرتے ہوئے نفاذِ شریعت کے لیے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کر لیا اور ملک کی رولنگ کلاس کا طرزِ عمل اس مسلح جدوجہد کے لیے بتدریج راستہ ہموار کرتا چلا گیا۔

مثلاً سوات میں نفاذِ شریعت کے لیے جب جدوجہد شروع ہوئی تو طالبان کا کہیں بھی کوئی وجود نہیں تھا اور اس تحریک کا پسِ منظر صرف اتنا تھا کہ سوات کے عوام مطالبہ کر رہے تھے کہ انہیں ان کے ریاستی دور کا وہ عدالتی نظام واپس کر دیا جائے جو نہ صرف برطانوی دور میں بلکہ ۱۹۶۹ء تک پاکستان کے دور میں بھی رائج رہا ہے۔ ان کے خیال میں شرعی قوانین پر مبنی وہ عدالتی نظام انہیں سستا اور فوری انصاف مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے عقیدہ و مذہب سے بھی مطابقت رکھتا ہے،

اس لیے وہی ان کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ ان کا یہ موقف قبول کر لیا گیا اور ایک آرڈیننس کے ذریعے انہیں یہ نظام مہیا کرنے کا اعلان کر دیا گیا، لیکن وہ آرڈیننس محض الفاظ کا ہیر پھیر تھا جس کی حقیقت واضح ہونے کے بعد عوام کے جذبات میں شدت پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ موجودہ حالات تک بات جا پہنچی۔ اس قسم کے ماحول میں جہادِ افغانستان میں حصہ لینے والے پاکستانی مجاہدین کے بعض گروہوں نے نفاذِ اسلام کے لیے شدت پسندی کا راستہ اختیار کیا جس کی ملک کے سنجیدہ دینی حلقوں نے کبھی حمایت نہیں کی اور خود ہم بھی اس طریق کار کو کھلے بندوں غلط قرار دینے والوں میں شامل ہیں، لیکن اس کے پسِ منظر اور اسباب وعوامل کو نظر انداز کر دینا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

جہادِ افغانستان میں شامل مجاہدین کا تیسرا حصہ دنیا کے مختلف حصوں سے آنے والے ان ہزاروں افراد پر مشتمل تھا جنہوں نے سوویت افواج کے خلاف جنگ میں عملاً حصہ لیا، مگر اس جنگ کے خاتمہ کے بعد اپنے اپنے ملک میں واپس جانے میں ان کے تحفظات تھے اور انہیں خدشہ تھا کہ وطن واپسی کی صورت میں ان کی جان اور آزادی کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ ان کے لیے پاکستان ہی پناہ گاہ ہو سکتا تھا چنانچہ انہوں نے یہاں رہ جانے کو ترجیح دی اور پاکستان میں آباد ہونے کے لیے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ان کا بڑا حصہ پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں آباد ہوا۔ ان کے بارے میں ایک مجموعی پالیسی طے کرنا اور انہیں منظّم طریقے سے پاکستانی معاشرے میں ایڈجسٹ کرنا حکومت پاکستان کی ذمہ داری تھی جس کی طرف پوری توجہ نہیں دی گئی اور انہیں بھی اپنے اپنے جذبات اور صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ مجاہدین کے اسی حصے میں سے القاعدہ وجود میں آئی جس نے مشرقِ وسطٰی میں امریکی فوجوں کی موجودگی کو بھی اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے وہ افغانستان میں سوویت یونین کی موجودگی کو دیکھتے تھے۔ اور ان کے لیے اس صورتحال کو قبول کرنا مشکل تھا کہ اگر افغانستان میں سوویت یونین کی مسلح افواج کی موجودگی افغانستان کی قومی خودمختاری اور آزادی کے منافی تھی تو مشرق وسطی میں امریکی افواج کی موجودگی ان ممالک کی قومی خودمختاری کے لیے خطرہ کیوں نہیں ہے؟ اور اگر افغانستان سے سوویت فوجوں کی واپسی کی جنگ، آزادی کی جنگ اور جہاد تھی تو مشرقِ وسطٰی سے امریکی اتحاد کی فوجوں کی واپسی کی

جنگ، آزادی کی جنگ اور جہاد کیوں نہیں ہے؟

ہمارے نزدیک افغانستان میں طالبان کا منظر عام پر آنا، پاکستان میں نفاذِ شریعت کے لیے مسلح گروپوں کا متحرک ہونا، اور مشرقِ وسطی میں القاعدہ کا وجود اور قوت حاصل کرنا جہادِ افغانستان کی سپورٹر قوتوں کی اس غفلت، بے پروائی اور لاتعلقی کا منطقی نتیجہ تھا جو انہوں نے سوویت افواج کی افغانستان سے واپسی کے بعد جان بوجھ کر اختیار کر لی تھی، اس لیے اس صورتحال کا صرف مسلح گروپوں کا تنہا ذمہ دار قرار دینا زمینی حقائق اور انصاف کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ صورتحال نائن الیون کے المناک سانحہ کے بعد نمودار ہوئی ہے، مگر یہ بات درست نہیں ہے بلکہ خود نائن الیون کا حادثہ بھی انہی اسباب وعوامل کے باعث پیش آیا ہے۔ البتہ نائن الیون کے المناک سانحہ نے ان اسباب وعوامل کو مہمیز دی ہے اور ان کی قوت کار میں اضافہ کیا ہے جس کے بعد صورتحال تیزی کے ساتھ مزید بگڑتی چلی گئی ہے۔ نائن الیون کے بعد افغانستان میں امریکی اتحاد کی فوجیں آئیں اور طالبان کی حکومت ختم ہوئی تو مجاہدین کے مختلف گروپوں میں اشتعال کا بڑھنا اور ان میں باہمی تعاون اور ہم آہنگی کا فروغ بھی ایک فطری امر تھا جس کا سب سے زیادہ اثر پاکستان کی داخلی صورتحال پر پڑا۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ عالمی قوتوں اور پاکستان کی رولنگ کلاس نے مشترکہ طور پر اس مرحلے میں یہ حکمتِ عملی طے کر لی کہ مجاہدین کے مختلف گروپوں کی شدت اور اشتعال کو کم کرنے کی کوششوں کی بجائے علاج بالمثل کے طور پر اسے مزید بڑھانے کا ماحول پیدا کیا جائے اور وقفہ وقفہ سے مختلف علاقوں میں انہیں اشتعال دلا کر سامنے لایا جائے اور پھر اجتماعی کارروائی کے ساتھ انہیں کچل دیا جائے۔ سوات اور وزیرستان میں یہی کچھ ہوا ہے اور اب جنوبی پنجاب میں اسی قسم کی صورتحال پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہمارے خیال میں پاکستان میں شدت پسندی اور اس کے ذریعے مختلف طبقات کے درمیان کشمکش کا یہ ماحول اس پس منظر سے ہٹ کر بھی بعض عالمی اور علاقائی قوتوں کی ضرورت ہے جس کے لیے وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ یہ مسلح شدت پسندی اور دہشت گردی کراچی میں قومیت اور زبان کے حوالے سے اپنا کام دکھا چکی ہے، بلوچستان میں یہی ایجنڈا قومیت کے نام سے پیشرفت کر رہا ہے، سوات اور وزیرستان میں اس نے شریعت کے نفاذ کا عنوان اختیار کیا ہے، سنی

اور شیعہ مسلح تصادم کے پیچھے یہی بیرونی مفادات کارفرما ہیں، اور اب دیوبندی بریلوی کشمکش کو فروغ دے کر پنجاب میں یہ صورتحال پیدا کرنے کی کوشش میں بھی یہی عوامل متحرک دکھائی دیتے ہیں۔

دینی مدارس اور انتہا پسند تنظیمیں

سوال: ان انتہاپسندانہ تنظیموں کے وجود میں آنے میں مدارس کا کیا کردار ہے؟

جواب: انتہا پسندانہ جماعتوں کی تنظیم سازی اور ٹریننگ میں دینی مدارس کا کوئی کردار نہیں ہے۔ مدارس قرآن وسنت کی تعلیم دیتے ہیں اور اسلامی عقائد کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرت کے فروغ اور مسلم معاشرہ میں اسلامی احکام وقوانین کے نفاذ کی تعلیم وترغیب دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ مسلح تحریکیں اپنا مقصد اور ایجنڈا اسی کو بتاتی ہیں اس لیے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تنظیمیں مدارس کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں۔ مذکورہ بالا مقاصد کے لیے ملک میں جو جماعتیں اور افراد پُرامن طور پر اور سیاسی وجمہوری جدوجہد کے ذریعے کام کر رہی ہیں، وہ بھی انہی دینی مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں، اور جو لاکھوں علماء کرام، مدرسین اور خطباء وائمہ ملک بھر میں انتہائی امن وسکون کے ساتھ اور پورے امن وسلامتی کے ماحول میں دینی خدمات کی انجام دہی میں مصروف ہیں، انہوں نے بھی انہی مدارس میں تعلیم پائی ہے۔

دینی مدارس سے تعلیم پانے والے وہ حضرات جو نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں پُرامن طور پر تعلیمی اور دعوتی خدمات بجا لا رہے ہیں، اور وہ حضرات جو مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں، ان کے درمیان تناسب آٹے اور نمک کا بھی نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ انتہا پسندانہ تنظیموں کے قیام میں دینی مدارس کا کوئی کردار ہے، قطعی طور پر درست بات نہیں ہے۔ بالخصوص مجاہدین کے گروپوں کی تنظیم سازی تو جہادِ افغانستان کے دور میں آئی ایس آئی کے زیر سایہ ہوئی ہے اور اسی کا تسلسل اب بھی چلا آرہا ہے۔ پھر مجاہدین کی ٹریننگ بھی مدارس کے ماحول میں نہیں ہوئی بلکہ ان کی تنظیم سازی اور لانچنگ کی راہ ہموار کرنے والوں نے ہی ان کی ٹریننگ کے سارے مراحل طے کرائے ہیں۔

پھر ایک اور پہلو پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ عالمی سطح پر القاعدہ کے جس نیٹ ورک کو مبینہ دہشت گردی کی سب سے بڑی علامت قرار دیا جاتا ہے، اس کے بیشتر ارکان یونیورسٹیوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ ہیں، لیکن ان کی وجہ سے یونیورسٹیوں اور کالجوں کو انتہا پسندی کا سرچشمہ قرار نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح اگر دینی مدارس کے تعلیم یافتہ حضرات کی کچھ تعداد اس عمل میں شریک ہے تو اس کی ذمہ داری دینی مدارس پر ڈال دینا بھی انصاف کی بات نہیں ہے۔

برصغیر میں دینی مدارس کے موجودہ آزادانہ نظام کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہوا تھا اور ان کی تاریخ کم وبیش ڈیڑھ سو سال پر محیط ہے، جبکہ موجودہ شدت پسندی کی تنظیموں کی عمر ربع صدی کے لگ بھگ ہے، اس لیے بھی مدارس کے ڈیڑھ سو سالہ پُر اَمن کردار کو نظر انداز کر کے انہیں شدت پسندی اور انتہا پسندی کے موجودہ گروپوں کی تنظیم وتشکیل کا ذمہ دار قرار دینا درست نہیں ہے۔

دینی مدارس اور بین المسالک کشمکش

سوال: پاکستان کے بیشتر مدارس میں دوسرے مسلکوں اور مذاہب کو گوارا نہ کرنے کا جو سخت رویہ پایا جاتا ہے، اس کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں؟ یہ رویہ مدارس کے طلبہ کی ذہنیت کی تشکیل کس طرح کرتا اور دوسروں سے نفرت کی حوصلہ افزائی کیسے کرتا ہے؟ مزید یہ کہ اس سے دہشت گردی کیسے جنم لیتی ہے؟ اس سلسلے میں آپ کیا اصلاحات تجویز کریں گے؟

جواب: دینی مدارس کی بنیاد چونکہ مسلکی ترجیحات پر ہے اس لیے دوسرے مسالک اور مذاہب کے بارے میں عدم برداشت کی فضا مدارس میں بہر حال موجود ہے، جو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے اور دینی قوتوں کی اجتماعیت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ لیکن کیا اس سے دہشت گردی نے جنم لیا ہے؟ یہ سوال توجہ طلب ہے۔ اس لیے کہ دینی مدارس میں سب سے زیادہ نفرت قادیانیوں کے خلاف پائی جاتی ہے لیکن دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ نے ان کے خلاف کبھی مسلح جدوجہد نہیں کی، بلکہ قادیانیوں کے خلاف نفرت کے اظہار اور حکومت سے ان کے بارے میں اپنے مطالبات

منوانے کے لیے ہمیشہ پُراَمن تحریک کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اسی طرح دینی مدارس میں دیوبندی بریلوی اختلافات اور حنفی اہلحدیث کشمکش بھی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے لیکن اس نے کبھی مسلح تصادم کی شکل اختیار نہیں کی۔ اس لیے سنی اور شیعہ گروہوں کے درمیان مسلح ٹکراؤ یا اس طرح کی شدت پسندی کے دیگر مظاہر کی جڑیں دینی مدارس کی بجائے کہیں اور تلاش کرنا ہوں گی اور اس کے لیے دینی مدارس کو ذمہ دار قرار دینا حقیقت پسندانہ بات نہیں ہوگی۔

نیز یہ بھی ایک معروضی حقیقت ہے کہ دینی مدارس کے مختلف مکاتبِ فکر کے الگ الگ وفاقوں کے باہمی میل جول اور بہت سے امور میں مشترکہ پالیسیوں اور موقف کے اظہار کے بعد دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کے مابین عدمِ برداشت کی شدت میں مسلسل کمی آرہی ہے اور دن بدن فضا پہلے سے بہتر ہو رہی ہے۔ متعدد دینی تحریکات میں مختلف مکاتبِ فکر کے طلبہ نے مشترکہ جدوجہد کی ہے۔ اس لیے مختلف مکاتبِ فکر کے دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کے درمیان باہمی عدمِ مفاہمت اور عدمِ تعاون کی وہ فضا اگر موجود ہے جسے عدمِ برداشت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں بتدریج سست رفتار بہتری کے آثار سامنے آرہے ہیں، لیکن اسے دہشت گردی کا باعث قرار دینے کا بہرحال کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں دینی مدارس کے وفاقوں کو اس سلسلے میں کردار ادا کرنا ہوگا کہ جس طرح وہ اعلیٰ سطح پر باہمی ملاقاتوں، مفاہمت اور تعاون کا اہتمام کرتے ہیں، اسی طرح مدارس کے اساتذہ اور طلبہ تک بھی اس کا دائرہ وسیع کریں۔

قومی وملی مسائل اور اغیار کی سازشیں

سوال: مدارس کے طلبہ سمیت بہت سے مسلمان، مسلمانوں کو درپیش تمام مسائل کا ذمہ دار اغیار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں کو قرار دیتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ طرزِ فکر داخلی سطح پر اپنا احتساب کرنے اور متنوع مشکلات میں خود اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرنے میں رکاوٹ بن رہا ہے جس کی مسلمانوں کو شدید ضرورت ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سوچ مسلمانوں کے لیے اپنے مسائل کا حل خود تلاش کرنے میں مانع بن رہی ہے؟

جواب: ہمارے خیال میں یہ تاثر درست نہیں ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ اور بہت سے مسلمان خود کو درپیش تمام مسائل کا ذمہ دار اغیار کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں کو قرار دیتے ہیں۔ بلکہ دنیا بھر کی ہزاروں مساجد اور مدارس میں روزانہ یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ ہمارے مسائل اور مشکلات کی وجہ دینی تعلیمات سے دوری اور قرآن وسنت کے احکام پر عمل نہ کرنا ہے۔ ہر باشعور طالب علم اور دینی کارکن اپنی گفتگو کا آغاز اسی سے کرتا ہے۔اور اسی وجہ سے دینی مدارس نے اپنے ذمے یہ بنیادی کردار لے رکھا ہے کہ معاشرہ میں دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور مسلمانوں کو قرآن وسنت کی تعلیمات واحکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جائے۔

البتہ مسلم معاشرہ میں عام مسلمانوں کی دینی تعلیمات سے دوری کے اسباب میں اغیار کی سازشوں کا ذکر ضرور ہوتا ہے اور یہ بات غلط بھی نہیں ہے۔اس لیے کہ مسلم ممالک پر استعماری تسلط کے دور میں ایسا پالیسی کے تحت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو قرآن وسنت کی تعلیمات سے دور رکھا جائے اور بیشتر ممالک میں غیر ملکی استعمار کا تسلط ختم ہو جانے کے بعد اس کی جگہ لینے والی مسلمان حکومتوں نے بھی اس پالیسی کے تسلسل کو جاری رکھا ہوا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ

☆ مسلمانوں کے معاشی وسائل پر اغیار کے غاصبانہ قبضہ، مسلم ممالک کی معیشت پر عالمی اداروں کا کنٹرول،
☆ مسلم ممالک کے سیاسی معاملات میں عالمی قوتوں کی مسلسل مداخلت،
☆ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کی نفی کرتے ہوئے مسلم معاشروں میں مغربی تہذیب و ثقافت کی جارحانہ یلغار،
☆ اور مغرب کے ایجنڈے سے انحراف کرنے والے مسلم ممالک پر مسلح جنگ مسلط کر دینے کی کارروائیاں

اب ایسی ڈھکی چھپی باتیں نہیں ہیں جن سے آنکھیں بند کی جاسکیں- اور اگر اس فضا میں یہ کہا جاتا ہے کہ عالمِ اسلام کی موجودہ مشکلات ومسائل کے پیچھے عالمی استعمار کی سازشیں کارفرما ہیں تو یہ کوئی خلاف حقیقت بات نہیں ہے۔البتہ اغیار کی ان سازشوں اور مسلم ممالک پر عالمی استعمار کے

ریموٹ کنٹرول نوآبادیاتی تسلط سے عالمِ اسلام کو نجات دلانے کے لیے مسلم اُمہ کی قیادت کچھ نہیں کر پا رہی۔ یہ بات بہرحال افسوسناک ہے۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ

☆ مسلم اُمہ میں فکری بیداری کا ماحول پیدا کیا جائے، علم و آگہی کو فروغ دیا جائے،

☆ مرعوبیت کی فضا سے نکلنے کی کوشش کی جائے،

☆ اور نئی نسل کو تعلیم و تربیت کے ساتھ ملی حمیت اور تدبر و حوصلہ کی صفات سے بہرہ ور کیا جائے۔

ہمارا ایمان ہے کہ ملتِ اسلامیہ آج بھی قرآن وسنت کی تعلیمات سے آگاہی حاصل کر کے ان پر عمل کا ماحول پیدا کر لے، حریت فکر اور ملی حمیت کے جذبہ سے سرشار ہو جائے، اپنے وسائل اور صلاحیتوں سے ازخود فائدہ اٹھانے کی تدبیر اختیار کرے، اور دوست و دشمن کی حقیقت پسندانہ بنیاد پر پہچان کرنے کا حوصلہ کر لے، تو وہ اپنے مسائل اور مشکلات کو خود حل کر سکتی ہے۔ اس کے لیے تعلیم کے مسلسل فروغ اور فکری بیداری کی ضرورت ہے جس کے لیے دینی مدارس زیادہ بہتر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

کیا تمام غیر مسلم اسلام دشمن ہیں؟

سوال: آپ کی رائے میں تمام غیر مسلموں کو اسلام کا دشمن قرار دینا کیسا ہے؟

جواب: تمام غیر مسلموں کو اسلام کا دشمن سمجھنا درست نہیں ہے اور نہ ہی سنجیدہ اہلِ علم ایسا سمجھتے ہیں۔ غیر مسلموں میں بہت تھوڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں، لیکن بدقسمتی سے عالمی سطح پر میڈیا اور لابنگ کے وسائل پر ایسے محدود لوگوں کا تسلط زیادہ ہے جس کی وجہ سے اس قسم کی عمومی فضا نظر آتی ہے۔ ورنہ مشرق و مغرب میں ہر جگہ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو اسلام سے واقف ہونا چاہتی ہے اسلام کو سمجھنا چاہتی ہے، اور بہت سے اسلامی احکام وقوانین کے بارے میں اپنے ذہنوں میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات اور کنفیوژن کو دور کرنا چاہتی ہے۔ اور ان سے بھی کہیں زیادہ تعداد دنیا میں ایسے غیر مسلموں کی ہے جو سرے سے اسلام اور اس کی تعلیمات سے بے خبر ہیں اور ان کو اسلام کے پیغام اور تعلیمات سے

باخبر کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

دعوت کا فریضہ: دہشت گردی اور تنفر کی فضا میں

سوال: آپ کے خیال میں اسلام کے نام پر دہشت گردی کی کارروائیاں اور دوسرے مذاہب کے خلاف نفرت کا رویہ مسلمانوں کے ایک بنیادی فریضے یعنی دعوت پر کس طرح اثر انداز ہوا ہے؟

جواب: اسلام کے نام پر دہشت گردی کی کارروائیاں اور دوسرے مذاہب کے خلاف نفرت کا رویہ مسلمانوں کے ایک بنیادی فریضہ یعنی دعوت پر یقیناً اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن اس مسئلے کا صرف یہی ایک پہلو نہیں ہے، دوسرے پہلو بھی ساتھ ساتھ قابل توجہ ہیں۔ مثلاً دعوت مسلمانوں کے بنیادی دینی فرائض میں سے ہے اور اس کے مستقل تقاضے اور آداب ہیں جن کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ لیکن اسلام کے عقائد و احکام کا تحفظ و دفاع اور مسلمانوں کے دینی ماحول کو مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار سے بچانا بھی مسلمانوں کے دینی فرائض میں سے ہے اور اس سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

دعوت و تبلیغ کے اپنے تقاضے ہیں اور تحفظ و دفاع کے الگ سے اپنے تقاضے ہیں، ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اصل بات تقسیمِ کار کی ہے، دونوں شعبے الگ الگ طرح کے رجال کار چاہتے ہیں۔ جیسے کسی بھی ملک کی وزارتِ دفاع اور وزارتِ خارجہ کا ماحول الگ الگ ہوتا ہے، فوجی ہیڈ کوارٹر اور وزارتِ خارجہ کی زبان اور لہجہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، اور ایک جنرل اور سفارت کار کے طرزِ گفتگو میں فرق نظر آتا ہے، اسی طرح یہاں بھی فرق ناگزیر ہے۔ البتہ باہمی ربط و مشاورت ضروری ہے اور دونوں کا ایک دوسرے کی ضروریات کو ملحوظ رکھنا مشترکہ مفاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

دفاع سے ہماری مراد متشددانہ کارروائیاں نہیں ہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم قوتوں کے اقدامات اور کارروائیوں پر نظر رکھنا، ان کی نشاندہی کرنا، ان کے سدِ باب کے لیے ضروری اسباب فراہم کرنا، اور متعلقہ افراد و طبقات کو اس طرف توجہ دلا کر مقابلہ کے لیے تیار کرنا

ہے۔ جو ظاہر ہے کہ صرف اس وجہ سے ترک نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے دعوتِ اسلام کے لیے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ دعوت کی راہ میں ہمارے نزدیک اصل رکاوٹ یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر مسلمانوں کے عمل کا ماحول کمزور ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں سے غیر مسلموں کے متاثر ہونے کی وہ فضا دوبارہ نہیں بن رہی جو قرونِ اولیٰ میں اسلام کے فروغ کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔

سوال: غیر مسلموں کے بارے میں ان کے خیالات کے پیشِ نظر، پاکستان کی اسلامی تحریکیں اور مدارس کس حد تک ایسی مسلم گروہ پسندی یا فرقہ پرستی کو فروغ دینے کے ذمہ دار ہیں جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں؟

جواب: گروہ بندی اور فرقہ بندی کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے کسی بھی قسم کے اختلاف کو ہمارے ہاں گروہ بندی اور فرقہ بندی کا باعث سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ شرعی احکام میں فقہی اختلاف شروع سے چلا آ رہا ہے اور عقائد کی تعبیرات میں تنوع بھی ابتدا سے موجود ہے۔ یہ اختلاف اور تنوع فطری بات ہے جس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس اختلاف اور تنوع سے انکار ہمارے نزدیک اسلام کے فطری مذہب ہونے کی نفی کے مترادف ہے۔ البتہ اختلاف کو اپنے دائرے میں رہنا چاہیے، اسے امت میں تقسیم کا باعث نہیں بننا چاہیے۔ اور مختلف مکاتب فکر کو ایک دوسرے کا وجود تسلیم کرتے ہوئے اور باہمی اختلاف رائے کا احترام کرتے ہوئے مشترکہ دینی مقاصد کے لیے مشترکہ جدوجہد کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

پاکستان میں اب سے پہلے ایسا ہوتا آیا ہے اور اب بھی اس کے امکانات اور ماحول موجود ہے۔ پاکستان کی اسلامی تحریکوں نے مختلف مواقع پر باہمی تعاون واشتراک کا مظاہرہ کیا ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ باہمی اختلاف اور ملی تقاضوں سے بے خبر نہیں ہیں اور بوقتِ ضرورت اپنے اختلافات کے باوجود مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اور جب اسلامی تحریکیں کسی مشترکہ مقصد کے لیے باہمی اشتراک وتعاون کا کوئی فورم قائم کرتی ہیں تو انہیں دینی مدارس کا تعاون اور سپورٹ بھی حاصل ہوتی ہے، تاہم اس ماحول کو مزید بہتر بنانے کی ضرورت ہے اور ان عناصر سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے جو مختلف مکاتبِ فکر کے اختلاف کو اپنے مقاصد کے لیے

استعمال کرنے کی وقتاً فوقتاً کوشش کرتے رہتے ہیں۔

سوال: آپ کی رائے میں مدارس کے موجودہ نظامِ تعلیم میں کون سی ایسی تبدیلیاں کی جانی چاہئیں جن کے نتیجے میں طلبہ اور علماء میں دوسرے مذاہب کے بارے میں وہ مثبت طرزِ فکر پیدا ہو سکے جو دعوتی سرگرمیوں کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے؟

جواب: دینی مدارس کا بنیادی مقصد معاشرے میں دینی تعلیمات کا فروغ، مسلمانوں کے عقائد وثقافت کا تحفظ، اسلامی احکام وفرائض پر عملدرآمد کا ماحول برقرار رکھنا، اور مسلمانوں کو دینی تعلیم اور فرائض وواجبات کی ادائیگی کے لیے رجال کار فراہم کرنا ہے۔ اس لیے ان کے تعلیمی نظام ونصاب میں کسی ایسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے جو انہیں ان اہداف سے ہٹائے۔ البتہ ان مقاصد کے لیے دینی مدارس کی کارکردگی کو مزید بہتر بنانے کے لیے ہم بہت سی تبدیلیوں کی حمایت کرتے ہیں اور ایک عرصہ سے ان کے لیے مسلسل آواز بھی بلند کر رہے ہیں، مثلاً یہ کہ:

- ☆ اسلامی تعلیمات و احکام کے ساتھ ساتھ دوسرے معاصر مذاہب و ادیان کی بنیادی تعلیمات، ان کی تاریخ اور ان کے پیروکاروں کے موجودہ ثقافتی و مذہبی تناظر سے آگاہی بھی علماء اسلام کے لیے ضروری ہے اور دینی مدارس کو اپنے نصاب میں اسے اہمیت دینی چاہیے۔
- ☆ عالمی سطح پر بولی جانے والی زبانوں، ابلاغ کے جدید ذرائع، دعوت کے مروجہ اسلوب، اور تہذیب و معاشرت کے جدید مسائل سے طلبہ اور علماء کو واقف کرانا بھی دینی نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔
- ☆ مختلف مذاہب اور مکاتبِ فکر کے علماء کرام اور طلبہ کے درمیان باہمی ملاقاتوں اور عصرِ حاضر کے مسائل پر باہمی تبادلہ خیالات کا اہتمام ہونا چاہیے۔
- ☆ علماء وطلبہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ جدل ومناظرہ کے ماحول سے نکل کر بریفنگ اور لابنگ کے اسلوب کو اختیار کریں اور دین کی دعوت و دفاع کے دونوں میدانوں میں معروضی حقائق اور عقلِ عام کے ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت حاصل کریں۔

☆ اور ان سب سے زیادہ ضروری ہے کہ ان کا تعلیمی معیار بلند ہو اور اسلامی علوم وفنون پر ان کی گرفت مضبوط ہو۔

نفاذِ شریعت بذریعہ حکومت کے مسائل

سوال: نفاذِ شریعت کے بارے میں پاکستان کے اسلامی گروہوں اور مدارس کے نقطۂ نظر کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟ کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ احتجاج، حتیٰ کہ تشدد یا حکومتی فرمان کے ذریعے سے شریعت نافذ کرنے کا عمومی طرزِ فکر لاحاصل ہے، کیونکہ بہت سے مسلمان خود بھی روایتی تصور کے تحت شریعت پر مبنی کسی ریاست کے محکوم بننا پسند نہیں کرتے؟ معاشرے کے با رسوخ طبقات کے ہاں شریعت اور اس کی تعبیر کے حوالے سے جو سوالات، الجھنیں اور تحفظات پائے جاتے ہیں، آپ کے خیال میں ان کا ازالہ کیے بغیر شریعت کا مؤثر نفاذ ممکن ہے؟

جواب: یہ سوال مختلف سوالات کا مجموعہ ہے جن کا الگ الگ جواب ضروری ہے۔

اصولی طور پر یہ بات درست ہے کہ نفاذِ شریعت کے لیے رائے عامہ، ووٹ اور سیاسی عمل ہی سب سے زیادہ مؤثر اور درست ذریعہ ہے، لیکن یہ پاکستان کے معروضی حالات میں کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ پاکستان کی رولنگ کلاس نفاذِ شریعت کے حوالے سے عوام کے جذبات کا احترام کرنے اور قیامِ پاکستان کے نظریاتی اور ثقافتی مقاصد کے سامنے سرنڈر ہونے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی۔ وہ صرف احتجاج اور دباؤ کی زبان کو سمجھتی ہے اور پاکستان کے حکمران طبقات کی نفسیات یہ ہے کہ وہ احتجاج اور دباؤ کے بغیر کوئی بات قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ پاکستان میں اب تک نفاذِ شریعت کے جس قدر اقدامات ہوئے ہیں وہ عوامی دباؤ اور اسٹریٹ پاور کے پُرجوش اظہار کے نتیجے میں ہوئے ہیں۔ اس لیے پاکستان میں اگر رائے عامہ کی قوت کا استعمال مؤثر ہوگا تو وہ صرف احتجاج، اسٹریٹ پاور اور عوامی دباؤ کے ذریعے ہی ہوگا، جیسا کہ چیف جسٹس آف پاکستان کی بحالی کے لیے وکلاء کی تحریک میں اس کا ایک بار پھر تجربہ ہوگیا ہے۔ اس لیے جب پاکستان میں نفاذِ شریعت کی عوامی جدوجہد کی بات کی جاتی ہے تو اس سے مراد

اسٹریٹ پاور اور عوامی احتجاج ہی ہوتا ہے کہ اس کے سوا پاکستان کی رولنگ کلاس سے کوئی بات منوانے کا اور کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے اور پاکستان کے عوام اپنے مطالبات منوانے کے لیے اسی کو مؤثر ہتھیار سمجھتے ہیں۔ البتہ اس عوامی تحریک کا پُر امن اور دستور و قانون کے دائرے کے اندر رہنا اور کسی بھی قسم کے تشدد سے اسے پاک رکھنا ضروری ہے۔ پاکستان کے اندر کسی بھی مطالبے کے لیے ہتھیار اٹھانا، مسلح جدوجہد کا ماحول پیدا کرنا، عوام کو خوف و ہراس میں ڈالنا، اور لاقانونیت کی فضا پیدا کرنا ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے اور ہم نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے۔

جہاں تک حکومتی فرمان کے ذریعے احکامِ شریعت کے نفاذ کی بات ہے تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے لے کر ۱۹۲۴ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ تک احکامِ شریعت کے نفاذ کے لیے حکومتی فرمان اور ریاستی نظام ہی ایک مؤثر ذریعے کے طور پر کارفرما رہا ہے، اور یہ اسلام کی چودہ سو سالہ روایات کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کی بنیادی تعلیمات کا تقاضا بھی ہے۔ کوئی بھی حکم اور قانون اس وقت تک حکم یا قانون نہیں کہلا سکتا جب تک اس کے پیچھے ریاستی قوت اور حکومتی فرمان نہ ہو۔ حکومتی فرمان کے بغیر سوسائٹی کو احکام و قوانین کا پابند بنانے کی بات نظری طور پر کتنی ہی دلفریب کیوں نہ ہو، عملی طور پر ناممکن ہے۔ کارل مارکس نے بھی کمیونزم کی حقیقی منزل اسی کو قرار دیا تھا لیکن یہ محض نظری بات تھی جو عملی دنیا میں ایک قدم نہیں چل سکی، اور کارل مارکس کے پیروکاروں کو اس سے ایک درجہ نیچے اتر کر سوشلزم کے لیے ریاستی قوت اور حکومتی فرامین کا جس شدت کے ساتھ استعمال کرنا پڑا وہ انسانی تاریخ کا ایک اندوہناک باب بن چکا ہے۔

اسلام صرف اخلاقی تعلیمات اور عقائد و عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت میں معاشرتی، خاندانی اور قومی زندگی کے بارے میں سیکڑوں احکام و قوانین موجود ہیں جن کے نفاذ و اطلاق کے لیے ریاستی قوت اور حکومتی فرمان ناگزیر حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اسی بات سے فقہاء اسلام نے خلافت و حکومت کے فرض و واجب ہونے پر استدلال کیا ہے کہ چونکہ قرآن و سنت کے بہت سے احکام و فرائض کا نفاذ حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور جو چیز کسی فرض کی ادائیگی کے لیے موقوف علیہ کا درجہ رکھتی ہو وہ خود بھی فرض ہوتی ہے، اس لیے خلافت کا قیام مسلمانوں پر شرعاً واجب ہے۔

جہاں تک معاشرہ کے بارسوخ طبقات کے تحفظات کی بات ہے تو دنیا کے کسی بھی معاشرے میں اس کے بارسوخ طبقات کے تحفظات ایسے ہر قانون کے حوالے سے ہر وقت موجود رہتے ہیں جن سے ان کے مفادات پر زد پڑتی ہو، اور وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ہر قسم کی رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے اگر حکومت کا وجود اور اس کے فرامین صرف بارسوخ طبقات کے تحفظات و مفادات کے لیے ہوتے ہیں تو صرف شریعتِ اسلامیہ کے لیے نہیں بلکہ دنیا کے کسی بھی دستور و قانون کے لیے حکومتی فرمان کی ضرورت مشکوک ہو جائے گی۔ باقی رہی یہ بات کہ بہت سے مسلمان روایتی تصور کے تحت شریعت پر مبنی کسی ریاست کا محکوم بننا پسند نہیں کرتے تو اس سلسلے میں دو باتیں قابل توجہ ہیں۔

ایک یہ کہ کیا کسی بھی ملک میں بہت سے لوگوں کا اس ملک کے دستور و قانون کے روایتی تصور پر مبنی نظام و احکام کی پابندی کو پسند نہ کرنا اس امر کا جواز بن جاتا ہے کہ اس روایتی تصور کو ہی ختم کر دیا جائے؟ آج کی دنیا میں اکثریت کے رجحانات کو دیکھا جاتا ہے اور اس کے مطابق نظام چلایا جاتا ہے۔ اسی اصول پر دنیا بھر میں مسلمانوں کے عمومی رجحانات کو دیکھ لیا جائے کہ وہ اسلام اور شریعت کے روایتی تصور کے مطابق زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں یا مارٹن لوتھر کی پروٹسٹنٹ تعلیمات کے طرز پر اسلام کی ''ری کنسٹرکشن'' کو قبول کرتے ہیں؟ اس تاریخی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عمومی ماحول نے دنیا بھر میں کسی جگہ بھی مارٹن لوتھر یا اکبر بادشاہ کی طرز کی ری کنسٹرکشن کو کبھی قبول نہیں کیا۔ تو محض روایتی تصور کی پھبتی کے ساتھ امتِ مسلمہ پر چند لوگوں کے خیالات کو مسلط کرنے کا کیا جواز ہے؟

دوسری بات یہ کہ جس طرح دنیا میں کسی بھی دستور و قانون کی تعبیر و تشریح کے لیے کچھ مسلّمہ اصول اور متعین پراسیس موجود ہوتا ہے، جس سے ہٹ کر اس کی کوئی تعبیر و تشریح قابل عمل نہیں قرار پاتی، اسی طرح قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے بھی کچھ متعینہ اصول اور ایک ایسا علمی اور عملی طریق کار موجود ہے جس پر چودہ سو سال سے امت کا اجماعی اور جمہوری تعامل چلا آ رہا ہے۔ اسے نظر انداز کر کے قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کو چند افراد کے تصورات و خواہشات کا اسیر نہیں بنایا جا سکتا۔

قرآن وسنت کے احکام وقوانین کے دو درجے ہیں۔ ایک وہ منصوص احکام جن کی قرآن و سنت میں پوری صراحت کے ساتھ وضاحت کر دی گئی ہے، ان کے بارے میں کسی نئی تعبیر وتشریح کو قبول کرنا خود قرآن وسنت کی نفی کے مترادف ہے۔ دوسرا درجہ اجتہادی اور استنباطی مسائل واحکام کا ہے، ان میں اجتہاد واستنباط کا راستہ قیامت تک کھلا ہے۔ لیکن کسی بھی اجتہاد یا استنباط کو قانون یا حکم کا درجہ اس وقت حاصل ہوگا جب امت مسلمہ کا جمہوری ماحول یا کم از کم وہ سوسائٹی جس کے تناظر میں وہ اجتہاد کیا گیا ہے، اسے عمومی طور پر قبول کر لے گی۔ اس سے پہلے اس کی حیثیت محض ایک رائے کی ہے جسے اختیار کرنے اور پیش کرنے کا تو ہر شخص کو حق حاصل ہے، لیکن اسے سوسائٹی پر مسلط کرنے کا کسی شخص کو حق حاصل نہیں ہے۔ میں مثال کے طور پر علامہ محمد اقبالؒ کی ایک اجتہادی رائے کا حوالہ دینا چاہوں گا کہ قادیانیوں کو عقیدۂ ختم نبوت اور دیگر مسلّمہ اسلامی عقائد سے انحراف کی بنیاد پر فقہی احکامات کے مطابق گردن زدنی قرار دینے کی بجائے مسلم معاشرہ میں دیگر غیر مسلم اقلیتوں کی طرح ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر قبول کر لیا جائے۔ یہ ایک اجتہادی رائے تھی جس سے ہر شخص کو اختلاف کا حق حاصل تھا، لیکن یہی رائے جب تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام کا متفقہ موقف قرار پائی اور پاکستان کی پارلیمنٹ نے بھی اسے قبول کر لیا تو اسے شرعی حکم اور ملکی قانون کا درجہ حاصل ہو گیا۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے ایک غلط روایت نے جنم لیا ہے اور بارسوخ طبقات کے اثر ورسوخ کے ذریعے اسے مسلسل فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن وسنت کے بارے میں کچھ لوگوں کی پیش کردہ تعبیرات وتشریحات کو براہ راست ریاستی قوت کے ذریعے قانون کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور درمیان کے ایک ناگزیر مرحلہ کو یکسر نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ اسے علمی حلقوں اور عمومی ماحول میں بھی قبولیت کا درجہ حاصل ہوا ہے یا نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قانون کے کاغذات میں تو اس کا وجود ہوتا ہے لیکن عام معاشرہ میں اسے قبولیت اور احترام کا مقام نہیں ملتا اور عجیب طرح کی کنفیوژن پیدا ہو جاتی ہے۔ اکبر بادشاہ کے اجتہادات کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا اور آج بھی ایسا ہو رہا ہے۔ جس کی ایک مثال پاکستان کے سابق صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں نافذ ہونے والے عائلی قوانین ہیں، جو قانون کی فائلوں میں تو موجود ہیں لیکن ملک کا عام

مسلمان اب بھی نکاح، طلاق اور وراثت کے مسائل میں ان قوانین کی پروا کیے بغیر کسی مفتی سے فتویٰ لینے کو ہی ترجیح دیتا ہے، اور اسلامی احکام پر عمل کے خواہشمند کسی بھی مسلمان کے لیے ملکی قانون کی بجائے مفتی کا فتویٰ ہی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس بنا پر اس عمل میں یہ ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے کہ قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح میں کسی بھی نئی رائے، اجتہاد یا استنباط کو براہ راست ریاستی قوت کے ذریعے قانون کا درجہ دینے کی بجائے علمی حلقوں اور عمومی ماحول میں اس کی قبولیت کا انتظار کیا جائے، جیسا کہ قادیانیوں کے بارے میں علامہ محمد اقبالؒ کی اجتہادی رائے کے ساتھ ہوا ہے۔

منصوص شرعی احکام اور فقہی اجتہادات

سوال: علماء اور مدارس کے ہاں فقہی اجتہادات اور شریعت کو آپس میں گڈمڈ کر دینے کا جو رجحان پایا جاتا ہے، اس کے بارے میں آپ کا احساس کیا ہے؟ (اگر یہ غلط ہے تو) اس غلط رجحان کی عکاسی طبقہ علماء کے ہاں بین المذاہب تعلقات، تصور جہاد اور نفاذ شریعت کے سوال میں کس انداز سے ہوتی ہے؟ علماء کے ہاں شریعت، فقہ اور بدلتے ہوئے معاشرے کا بہتر فہم پیدا کرنے کے لیے آپ کے نزدیک کون سے اقدامات ضروری اور ناگزیر ہیں؟

جواب: شریعت اگر اسلامی احکام وقوانین کا نام ہے تو فقہی اجتہادات کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ اسلامی احکام وقوانین کا ایک بڑا حصہ فقہی اجتہادات پر مبنی ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں بھی بہت سے احکام وقوانین کی بنیاد فقہی اجتہادات پر ہوتی تھی، اس لیے شریعت اور فقہی اجتہادات کو ایک دوسرے کے مقابل لانے کا تصور ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔

قرآن وسنت کے منصوص اور صریح احکام تو ہمیشہ کے لیے ناقابل تغیر ہیں، البتہ وہ منصوص احکام جو صریح نہیں ہیں ان کی تعبیر وتشریح استنباط اور اجتہاد کے ذریعے کی جاتی ہے، اور وہ احکام جو منصوص نہیں ہیں ان کا تعین بھی منصوص احکام کی روشنی میں اجتہادات کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ اس لیے شریعت اور اجتہاد باہم لازم وملزوم ہیں۔ اور جس طرح منصوص اور صریح احکام شریعت کا حصہ ہیں، اسی طرح استنباطی اور اجتہادی مسائل واحکام بھی شریعت کا ہی حصہ ہیں، اس فرق کے

ساتھ کہ غیر صریح اور غیر منصوص مسائل و احکام میں ان کے اسباب و علل اور عرف و تعامل کی تبدیلی کے ساتھ تغیر و تبدل کا امکان ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اور اسلامی احکام و قوانین میں حرکت پذیری کا یہ امکان ہی انہیں ہر زمانے اور ماحول کے لیے قابل عمل بناتا ہے۔

جہاں تک بین المذاہب تعلقات، تصورِ جہاد اور نفاذِ شریعت جیسے مسائل کا تعلق ہے، ان کے بارے میں مسلّمہ فقہی مذاہب میں پوری تفصیل کے ساتھ احکام و ضوابط موجود ہیں جن کی بنیاد پر آج کے حالات اور ضروریات کے تناظر میں نئی قانون سازی بھی کی جا سکتی ہے۔ اور ہمارے نزدیک قیامِ پاکستان کے بعد تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کے طے کردہ ۲۲ دستوری نکات اسی طرز کے اجتہاد اور قانون سازی کی عکاسی کرتے ہیں، جب کہ وفاقی شرعی عدالت کے بہت سے فیصلے اور اسلامی نظریاتی کونسل کی متفقہ قانونی سفارشات بھی اسی اجتہادی عمل کا حصہ ہیں۔

البتہ اس حوالے سے علماء کرام اور دینی مدارس کے حلقوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عالم اسلام کے مختلف حصوں میں ہونے والے اجتہادی عمل اور علمی مساعی سے آگاہی حاصل کریں، معاشرتی اور عالمی ماحول سے واقف ہوں، انسانی سوسائٹی کے جدید مسائل اور تقاضوں سے باخبر ہوں، معاصر مذاہب، نظام ہائے زندگی اور دستوری و قانونی ارتقاء پر ان کی نظر ہو، اور اس پورے تناظر کو سامنے رکھ کر وہ اپنی علمی ذمہ داریوں اور کردار کا تعین کریں، کیونکہ اسی صورت میں وہ اپنے علمی و دینی فریضے سے صحیح طور پر سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ دینی مدارس اور علمی مراکز کو اس سلسلے میں خصوصی کورسز اور محاضرات کا اہتمام کرنا چاہیے اور دینی مدارس کے طلبہ و اساتذہ کے ساتھ ساتھ مساجد کے ائمہ و خطباء اور دینی جماعتوں کے کارکنوں کو بھی اس دائرے میں شریک کرنا چاہیے۔

اقلیتوں کی حیثیت دستورِ پاکستان کی رو سے

سوال: صوبہ سرحد میں طالبان کی طرف سے سکھوں پر جزیہ کے نفاذ اور عورتوں کے ساتھ ان کے برتاؤ کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟ کیا آپ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت اور عورتوں کے معاشرتی کردار کے حوالے سے طالبان کے تصورات سے اتفاق کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو اس پر آپ کی تنقید کیا ہے؟

جواب: صوبہ سرحد کے طالبان کی طرف سے اگر سکھوں پر جزیہ نافذ کیا گیا ہے تو یہ غلط ہے۔ پاکستان کے دستور کے تحت ملک کے تمام غیر مسلم اقلیتوں کی حیثیت شرعاً ''معاہد'' کی ہے یعنی وہ اقلیتیں جو ایک معاہدہ کے تحت ملک کی آبادی کا حصہ بنی ہیں اور یہ معاہدہ ملک کا دستور ہے۔ ان کے ساتھ وہی معاملات روا رکھے جائیں گے جو دستور میں طے کیے گئے ہیں اور اس سے ہٹ کر ان کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں غیر مسلموں اور عورتوں کے بارے میں پاکستان کے تناظر میں علماء کرام کے ۲۲ دستوری نکات اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے بعد اسلامائزیشن کے سلسلے میں ہونے والی قانونی پیشرفت اور ارتقاہی نفاذِ شریعت کا صحیح معیار ہے جس سے انحراف جائز نہیں ہے۔

افغان طالبان اور پاکستانی طالبان: اہداف و مقاصد

سوال نمبر: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ طالبان معیشت، بین الاقوامی تعلقات اور پاکستان میں مختلف نسلی گروہوں کے باہمی تعلقات کے پیچیدہ مسائل سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت اور وژن سے بہرہ ور ہیں؟ اگر حکومت اور اقتدار طالبان کو مل جائے تو آپ کے خیال میں ان کا ان مسائل سے نمٹنے کا طریق کار اور نتائج کیا ہوں گے؟

جواب: طالبان کو ہم دو الگ الگ حصوں میں سمجھتے ہیں:

افغان طالبان

افغانستان کے طالبان کے بارے میں ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ وہ جہادِ افغانستان کے دوران سوویت افواج کی واپسی کے بعد افغانستان میں پیدا کی گئی افراتفری، خانہ جنگی اور جہاد کے نظریاتی اہداف کو نظر انداز کیے جانے کے نتیجے میں سامنے آئے تھے، اور افغانستان کے ایک بڑے حصے میں منظّم حکومت قائم کر کے انہوں نے شرعی نظام نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے زیر حکومت علاقے میں امن بھی قائم کیا تھا۔ جب کہ افغانستان میں امریکی افواج کی آمد کے بعد ان کا خیال ہے کہ وہ اسی طرح قومی آزادی اور اسلامی تشخص کی بحالی کی جنگ لڑ رہے ہیں جیسے انہوں نے روسی افواج کی موجودگی کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ وہ افغانستان کے مخصوص حالات اور کلچر کی

نمائندگی کرتے ہیں اور وہاں کے حالات و ضروریات کو بہتر طور پر سمجھتے ہوئے ان سے نمٹنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

البتہ جب ان کی حکومت قائم تھی، اس دوران ہم نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ ملک میں دستوری حکومت قائم کریں اور دستور سازی اور قانون سازی کے حوالے سے پاکستان کے علماء کرام کی پارلیمانی جدوجہد کو سامنے رکھ کر اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے دستور و قانون کی تشکیل کے مراحل طے کریں۔ اس وقت ہم نے انہیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ بین الاقوامی معاملات اور ملک کے معاشی و اقتصادی ڈھانچے کی تشکیل میں ان بین الاقوامی ماہرین سے مشاورت کا اہتمام کریں جو اسلامی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی ترویج و تنفیذ میں کردار ادا کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ایسے ماہرین نہ صرف مسلم ممالک میں موجود ہیں بلکہ مغربی دنیا اور بین الاقوامی تعلیمی اداروں میں بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اب اگر افغانستان میں ان کی دوبارہ حکومت قائم ہوتی ہے جس کے امکانات کا عالمی پریس میں مسلسل اظہار کیا جا رہا ہے تو ہمارا انہیں یہی مشورہ ہوگا کہ:

(۱) دستوری حکومت تشکیل دیں،

(۲) پاکستان کے دینی حلقوں کی پارلیمانی جدوجہد سے راہنمائی حاصل کریں، اور

(۳) مختلف شعبوں میں ان مسلم ماہرین سے مشاورت کا اہتمام کریں جو نفاذِ اسلام پر یقین رکھتے ہیں اور اس میں کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

پاکستانی طالبان

مگر پاکستان میں طالبان کے نام سے کام کرنے والے گروہوں کے بارے میں ہماری رائے یہ نہیں ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ گروہ اگرچہ نفاذِ شریعت کے بارے میں پاکستان کی رولنگ کلاس کے مسلسل منافقانہ رویے کے ردعمل میں نمودار ہوئے ہیں، لیکن ایک تو ان کا طریق کار درست نہیں ہے۔ اور دوسرا ان کی جدوجہد کا فائدہ ان قوتوں کو مل رہا ہے جو پاکستان میں افراتفری اور خانہ جنگی کا ماحول قائم کرنا چاہتی ہیں اور جن کی خواہش ہے کہ نفاذِ شریعت کے نام پر ایسی الٹی سیدھی حرکتیں

وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں جو رائے عامہ کو نفاذِ شریعت کے عمل اور جدوجہد سے متنفر کرنے کا باعث بنیں۔ پاکستان میں طالبان کے گروہوں نے متعدد ایسی حرکات کی ہیں جو اس ضمن میں آتی ہیں۔ ہوسکتا ہے بہت سے طالبان غیر شعوری طور پر اس سازش کا حصہ بنے ہوں، لیکن شعوری طور پر اس مقصد کے لیے استعمال ہونے والوں کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس بنا پر ہماری رائے یہ ہے کہ پاکستانی طالبان شعوری یا غیر شعوری طور پر ان قوتوں کے حق اور فائدے میں استعمال ہو رہے ہیں جن کا ہم نے تذکرہ کیا ہے اور ان کی سرگرمیوں سے ملک اور اسلام دونوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان میں نفاذِ اسلام کے لیے قراردادِ مقاصد، علماء کرام کے ۲۲ دستوری نکات، اور ۱۹۷۳ء کے دستور کی اسلامی دفعات کی بنیاد پر سیاسی اور دستوری جدوجہد ہی صحیح راستہ ہے۔ اور طالبان یا اس طرز پر کام کرنے والے تمام گروہوں کو ملک کے جمہور علماء کے موقف اور پالیسی پر واپس آ جانا چاہیے۔

دینی مدارس اور مذہبی گروہوں کا جہادِ افغانستان میں کردار

سوال: مدارس اور مذہبی گروہوں نے جہاد افغانستان میں حصہ لینے کا جو فیصلہ کیا، آپ کی رائے میں اس کے نتائج بین الاقوامی، علاقائی اور ملکی سطح پر ان کی توقعات کے مطابق نکلے یا برعکس؟ کیا آپ کے خیال میں یہ حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے کچھ اہم پہلوؤں سے صرف نظر کیا گیا؟ اگر غلطی تھی تو کہاں اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا آپ مذہبی قیادت کے لیے اس پالیسی پر ناقدانہ غور کرنے اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟ اگر ہاں تو اس کے لیے آپ کیا مناسب اور مؤثر اقدام تجویز کرتے ہیں؟

جواب: افغانستان میں روسی افواج کی آمد کے بعد جہاد کا اعلان افغانستان کے علماء کرام نے کیا تھا اور پاکستان کی متعدد دینی جماعتوں اور مدارس کے طلبہ و اساتذہ نے اس کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اس میں عملی طور پر شرکت بھی کی تھی۔ یہ حمایت اور تعاون اس بنیاد پر تھا کہ اپنے وطن کی آزادی اور قومی خودمختاری کی بحالی کے لیے افغان عوام کی جنگ نہ صرف ان کا قومی حق ہے بلکہ یہ

شرعی فریضہ اور جہاد بھی ہے، اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اس جہادِ آزادی میں ان سے تعاون اور ان کی امداد دنیا بھر کے مسلمانوں بالخصوص پڑوسی مسلمانوں پر شرعاً واجب ہے۔ وہ جہاد کی فضیلت واہمیت اور اس کے احکام ومسائل قرآن وسنت اور فقہ میں مسلسل پڑھتے چلے آرہے تھے جن پر عملدرآمد کا انہیں موقع سامنے نظر آرہا تھا۔ نیز مسلم ممالک پر استعماری قوتوں کے تسلط اور عالمِ اسلام کے وسائل اور متعدد مقامات پر غیر مسلم طاقتوں کے قبضہ اور وہاں کی اکثریتی مسلم آبادی کو آزادی اور اسلامی تشخص سے محروم کر دینے کے تناظر نے انہیں مسلط قوتوں کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبہ سے بھی سرشار کر رکھا تھا، چنانچہ انہوں نے پورے جوش وخروش کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔

ابتدا میں افغان علماء کے اس اعلان جہاد اور پاکستان کے دینی حلقوں کی طرف سے ان کی حمایت وتعاون کو دیوانے کا خواب سمجھا گیا اور کھلم کھلا یہ کہا گیا کہ یہ چند مذہبی دیوانے اور بے وقوف ہیں جو ایک عالمی طاقت کے ساتھ ٹکرا کر اپنا سر پھوڑنے جارہے ہیں۔ مگر ان دیوانوں کی یہ دیوانگی جاری رہی، کم وبیش تین سال تک کیفیت یہ تھی کہ ان مجاہدین نے عام طور پر میسر معمولی ہتھیاروں کے ساتھ فقر وفاقہ کے ماحول میں گوریلا جنگ لڑی۔ انہیں پاکستانی حکومت اور اس کے بعد پاکستانی عوام کی تھوڑی بہت حمایت حاصل تھی۔ اس زمانے میں یہ مجاہدین شیشے کی بوتلوں میں پٹرول اور صابن کا محلول بھر کر مصنوعی بم بنایا کرتے تھے اور انہیں ٹینک شکن ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان تین چار برسوں میں ان مجاہدین کے استعمال میں آنے والے ہتھیار اگر کسی جگہ یادگار کے طور پر محفوظ کیے گئے ہوں تو انہیں دیکھ کر اس دور کی جنگ کے ماحول کا آج بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس بے سروسامانی کی جنگ کے نتیجے میں جب افغانستان کے ایک بڑے حصے میں مجاہدین کے مختلف گروپوں نے اپنے زیر اثر علاقے قائم کر لیے اور یہ نظر آنے لگا کہ یہ جنگ جاری رہ سکتی ہے تو امریکہ اور دیگر بہت سے ممالک نے اس جنگ میں سوویت یونین کی ہزیمت کے امکانات دیکھ کر اس میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا اور پھر افغان مجاہدین کے پاس جدید ہتھیاروں اور وسائل کی ریل پیل ہوگئی۔

ہمارے خیال میں اس مرحلے میں افغان مجاہدین کے مختلف گروپوں کی قیادت سے غلطی ہوئی

کہ انہوں نے بیرونی امداد اور سرمایہ دارانہ بلاک کی معاونت اور حمایت کی حدود طے کرنے کی بجائے انہیں جنگ میں ایک شریک کار کے طور پر قبول کر لیا۔ مجاہدین کے آٹھ مختلف گروپوں کو ملا کر ایک اتحاد قائم کیا گیا اور سرمایہ دارانہ بلاک نے اس جنگ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اگر افغان مجاہدین کی قیادت کچھ مزید صبر سے کام لے کر بیرونی امداد و تعاون کو انتہائی ضرورت کی حد تک محدود رکھتے ہوئے پالیسی سازی کے معاملات پر اپنی گرفت قائم رکھتی تو نتائج بہت مختلف ہوتے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جب کہ ہماری معلومات کے مطابق اس موقع پر افغان مجاہدین کے آٹھ مختلف گروپوں کے متحدہ محاذ کی قیادت میں اس مسئلے پر اختلاف رائے بھی ہوا اور متحدہ محاذ کے سیکرٹری جنرل مولانا نصر اللہ منصور شہید نے سرمایہ دارانہ بلاک کے سامنے افغان مجاہدین کی قیادت کی خود سپردگی کے اس رویے سے اختلاف کرتے ہوئے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ مولانا نصر اللہ منصور شہید کا موقف یہ تھا کہ بیرونی قوتوں سے امداد لی جائے لیکن پالیسی سازی پر اپنا کنٹرول قائم رکھا جائے، مگر وہ اپنے موقف کو منوا نہ سکے اور اتحاد سے الگ ہو گئے۔

اس کے بعد صورتحال یہ بن گئی کہ افغان مجاہدین اپنے وطن کی آزادی، افغانستان کی قومی خود مختاری، اور ایک شرعی اسلامی حکومت کے قیام کے لیے لڑ رہے تھے۔ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک سے آنے والے ہزاروں نوجوان اپنے افغان بھائیوں کی امداد اور جہاد میں عملی شرکت کے جذبہ سے لڑ رہے تھے۔ لیکن عالمی قوتیں بالخصوص سرمایہ دارانہ بلاک اس جنگ کے ذریعے سوویت یونین کو شکست دینے کے مقصد کے تحت اس جنگ کو سپورٹ کر رہا تھا اور اسی وجہ سے ایسا ہوا کہ سوویت افواج کی واپسی کے بعد سرمایہ دارانہ بلاک نے اپنا ہدف حاصل کر کے جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور پہلے دونوں گروہ جہاد افغانستان کے نظریاتی اہداف کے حصول کے لیے سرگرداں ہو گئے۔

یہی وہ موقع ہے جب پاکستان میں، جو جہادِ افغانستان کا سب سے بڑا پشت پناہ اور مجاہدین کا بیس کیمپ تھا، حکومتی سطح پر اختلافات پیدا ہوئے۔ جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم اس جنگ کو اس کے منطقی نتائج تک پہنچانے اور افغان مجاہدین کی حکومت کے قیام اور استحکام تک اس میں عملاً شامل رہنے کا عزم رکھتے تھے، جب کہ وزیر اعظم محمد خان جونیجو مرحوم اس جنگ کو اسی مرحلہ پر مکمل سمجھتے ہوئے اس

سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اسی کشمکش کی فضا میں جنیوا معاہدہ نے جنم لیا جو جہادِ افغانستان اور افغان عوام کے بارے میں عالمی قوتوں کی منافقانہ پالیسیوں کا شاہکار تھا اور اس نے افغانستان میں ایک مستحکم حکومت ونظام کے قیام کی بجائے خانہ جنگی اور خلفشار کا نیا ماحول پیدا کیا۔

اسی خلفشار اور خانہ جنگی سے طالبان نے جنم لیا جنہوں نے افغانستان کے ایک بڑے حصے کو کچھ عرصے کے لیے بدامنی اور لاقانونیت سے تو نجات دلا دی لیکن وہ اپنی حکومتی ترجیحات میں ایسی ترتیب قائم نہ کر سکے کہ اپنے اصل اہداف کی طرف مؤثر پیشرفت جاری رکھ سکتے۔ ظاہر بات ہے کہ طالبان کی حکومت کا وجود میں آنا مقامی حالات کا نتیجہ تھا جو عالمی قوتوں کے ایجنڈے اور مفادات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا، چنانچہ کچھ عرصہ تک تو ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی اور انہیں عالمی ایجنڈے میں فٹ کرنے کے لیے اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش ہوتی رہی، لیکن جب یہ بات طے ہوگئی کہ انہیں عالمی ایجنڈے اور پروگرام میں ایڈجسٹ کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے تو ان سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ یہ مرحلہ وہ تھا جب افغانستان کے جہاد میں شریک ہونے والے عرب مجاہدین نے مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل، بیت المقدس، تیل کی دولت کے استحصال، اور امریکی افواج کی موجودگی کے تناظر میں اپنا ایجنڈا طے کیا اور اس کی طرف پیشرفت کا پروگرام بنایا، اور ظاہر بات ہے کہ یہ بھی عالمی قوتوں کے مفاد اور ایجنڈے سے متصادم بات تھی۔

افغان طالبان اور عرب مجاہدین کا دائرۂ کار الگ الگ تھا، لیکن نظریاتی اہداف مشترک تھے، اس لیے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی، ہم آہنگی اور تعاون کی فضا موجود تھی۔ دوسری طرف یہ دونوں گروہ عالمی استعمار کے پروگرام اور ایجنڈے کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے، کیونکہ مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل کو تحفظ فراہم کرنا اور افغانستان میں ایک نظریاتی اسلامی حکومت کا راستہ روکنا عالمی استعمار کی اولین ترجیحات چلی آرہی ہیں، چنانچہ وہ جنگ جو اس سے پہلے افغان مجاہدین اور سوویت افواج کے درمیان تھی، اب وہی معرکہ افغان مجاہدین، عرب مجاہدین اور امریکی استعمار کے درمیان معرکہ آرائی میں تبدیل ہوگیا۔

ہمارے خیال میں اس مرحلے میں مجاہدین کی قیادت کو اپنی ترجیحات کے تعین میں حقیقت پسندانہ طور پر معروضی حالات کا لحاظ رکھنا چاہیے تھا جو نہیں رکھا جا سکا اور بازی الٹ گئی۔ ہم سمجھتے ہیں

کہ اگر دونوں جنگیں بیک وقت لڑنے کی بجائے افغانستان میں طالبان کی حکومت کو مستحکم کرنے کو ترجیح دی جاتی جس کے لیے ایک دستوری حکومت کا قیام، عالمی سطح پر حکمتِ عملی کے ساتھ رائے عامہ کی حمایت کا حصول، اور عالمِ اسلام کی دینی قوتوں کو نظریاتی اور ملی اہداف کے لیے مجتمع کرنا سب سے زیادہ ضروری امور تھے۔ مشرقِ وسطیٰ کی جنگ کو اس وقت تک تھوڑا مؤخر کرلیا جاتا تو یہ ایک بہتر حکمتِ عملی ہوتی، لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ اور ہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کرتے کہ ایسا نہ ہو سکنے کے پیچھے ان دونوں گروہوں کے مجاہدین کے انتہائی خلوص کے باوجود ان دیکھے ہاتھ حرکت میں رہے ہوں گے۔

نائن الیون کے المناک سانحہ نے اس صورتحال میں ڈرامائی تبدیلی پیدا کردی اور وہ کام جو ابھی کئی سالوں میں ہونے تھے، اس کے لیے مہینے اور ہفتے بھی طویل دکھائی دینے لگے۔ اس مرحلہ میں افغان طالبان اور عرب مجاہدین میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لیے قربانی دینا تھی اور ہمارے خیال میں اگر یہ قربانی عرب مجاہدین دے دیتے تو افغان طالبان کو سنبھلنے اور عالمِ اسلام میں اپنے بہی خواہوں سے رابطہ ومشاورت کے ساتھ کوئی نہ کوئی راستہ نکالنے کا تھوڑا سا موقع مل جاتا۔ لیکن یہ بھی نہ ہوا اور اپنے عرب مجاہد بھائیوں کی خاطر افغان طالبان نے پورے خلوص کے ساتھ اپنی حکومت کی قربانی دے دی۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر عرب مجاہدین افغان طالبان کے لیے قربانی دیتے تب بھی بالآخر نتیجہ یہی ہونا تھا اور جو کچھ ہورہا ہے اس کا ہونا طے پاچکا تھا۔ ہمیں اس سے اتفاق ہے لیکن ہمارا وجدان یہ کہتا ہے کہ اگر طالبان حکومت اور عالمِ اسلام میں ان کے بہی خواہوں کو باہمی مشاورت ورابطہ اور کوئی راستہ نکالنے کے لیے سنبھلنے کا تھوڑا سا وقت مل جاتا تو نتائج کی شدت کو کم کرنے کے امکانات بہرحال موجود تھے۔ بہرحال اب جو ہونا تھا ہو چکا اور اس کے بعد کے مراحل بتدریج طے ہورہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ افغان قوم کے موجودہ حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہیں گے اور ان میں نئی کروٹ کے آثار اب افق پر واضح طور پر دکھائی دے رہے ہیں۔ اس لیے افغان طالبان کو ماضی کے تجربات سے سبق حاصل کرتے ہوئے مستقبل کی نئی منصوبہ بندی اور صف بندی کرنا ہوگی اور دوست دشمن کی پہچان بلکہ نادان اور دانا دوستوں کے درمیان فرق کے لیے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور وخوض کرنا ہوگا۔

جہاں تک پاکستان کے ان دینی حلقوں کا تعلق ہے جنہوں نے جہادِ افغانستان میں اپنے افغان بھائیوں کی مدد کی اور ان کے ساتھ شریک کار رہوئے، مختلف مراحل کی ان غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ان کا یہ فیصلہ اور کردار ہمارے خیال میں بالکل درست تھا اور اس پر کسی قسم کی ندامت کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ان کی قربانیوں سے عالمی سطح پر متحارب دو قوتوں میں سے ایک نے فائدہ اٹھایا اور اپنے مقاصد حاصل کیے، لیکن اگر وہ اس جنگ میں شریک نہ ہوتے اور خاموشی اختیار کر لیتے تو یہی فوائد دوسری عالمی قوت کے پلڑے میں چلے جاتے۔ مجاہدین کے عمل اور قربانیوں سے کسی ایک قوت کو تو فائدہ پہنچنا ہی تھا بلکہ جب بھی کوئی گروہ یا قوت اس قسم کے ماحول میں کوئی کردار ادا کرتی ہے تو لازمی طور پر کسی کو فائدہ پہنچتا ہے اور کسی کو نقصان بھی ہوتا ہے۔ اگر قومیں اپنے فیصلے اس بنیاد پر کرنے لگیں تو شاید ہی کوئی قوم یا طبقہ کسی معرکہ میں کوئی کردار ادا کر سکے۔ فیصلوں کی بنیاد اپنے اہداف پر ہوتی ہے، اس لیے افغان مجاہدین اور ان کے پاکستانی مددگاروں نے جو فیصلہ کیا تھا، عالمی سطح پر اس کا ایک نتیجہ منفی ہے کہ طاقت کا توازن نہیں رہا اور دو قوتوں کے آمنے سامنے رہنے سے کمزور قوتوں کو جو سہارا مل جاتا تھا وہ نہیں رہا اور اب ساری دنیا ایک ہی عالمی طاقت کے رحم و کرم پر ہے، لیکن اس کے فوائد بھی ہوئے ہیں جن کا تذکرہ ہم ابتدا میں کر چکے ہیں کہ اس سے نہ صرف مشرقی یورپ، وسطی ایشیا اور بالٹک ریاستوں کو خودمختاری ملی بلکہ جرمنی کو بھی اتحاد نصیب ہوا ہے۔

باقی رہی بات جہادِ افغانستان کے نظریاتی اہداف کی کہ افغانستان کی قومی خودمختاری بحال ہو اور وہاں ایک نظریاتی اسلامی حکومت قائم ہو تو تمام تر خرابیوں اور وقتی ناکامیوں کے باوجود اس کے امکانات کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اور شاید افغان مجاہدین اپنے ہی ماضی کی ایک روایت دہرانے جا رہے ہیں، محمود غزنویؒ کو سومنات تک پہنچنے کے لیے سترہویں کامیاب حملے سے پہلے سولہ ناکام حملوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، لیکن کیا سومنات محمود غزنویؒ کی قدم بوسی سے انکار پر زیادہ دیر قائم رہ سکا تھا؟

اسلامی نظام اور مذہبی جماعتیں

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ و ماہنامہ ایوانِ اسلام، کراچی دسمبر ۲۰۱۰ء)

(''ایوانِ اسلام'' کے نمائندہ جناب جمیل الرحمان فاروقی کا انٹرویو)

جماعتی زندگی سے علیحدگی کیوں؟

سوال: آپ ایک بڑی مذہبی سیاسی جماعت کے اہم عہدوں پر فائز رہے، اس سے علیحدگی کی وجوہات کیا تھیں؟

جواب: جہاں تک میری جماعتی زندگی کا تعلق ہے اس کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۹۰ء تک مختلف سطحوں پر جمعیت علماء اسلام پاکستان میں ایک متحرک کردار کے طور پر مصروف عمل رہا ہوں۔ ۱۹۷۵ء سے حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات تک ان کی ٹیم کے ایک فعال رکن کے طور پر مرکزی سیکرٹری اطلاعات اور مرکزی ناظم انتخابات کے طور پر خدمات سرانجام دے چکا ہوں۔ اور ۹ جماعتوں کے متحدہ سیاسی ملی محاذ (پاکستان قومی اتحاد) کے صوبائی سیکرٹری جنرل کے ساتھ ساتھ اس کی دستور کمیٹی، منشور کمیٹی اور پارلیمانی بورڈ میں جمعیۃ کی نمائندگی کا اعزاز مجھے حاصل رہا ہے۔

حضرت مفتی صاحب کی وفات کے بعد جمعیت علماء اسلام دو دھڑوں حضرت درخواستیؒ گروپ اور مولانا فضل الرحمان گروپ میں تقسیم ہوئی تو میں درخواستی گروپ کا متحرک ترین کردار تھا۔ دونوں گروپوں میں سب سے بڑا تنازع ایم آر ڈی کے نام سے بننے والے سیاسی اتحاد میں جمعیت علماء اسلام کی پیپلز پارٹی کے ساتھ سیاسی رفاقت کا تھا، جو درخواستی گروپ کے لیے کسی صورت قابل قبول نہیں تھی۔ کم وبیش ایک عشرے کی کشمکش کے بعد ایم آر ڈی کے ختم ہو جانے پر درخواستی گروپ اور فضل الرحمان گروپ دوبارہ اکٹھے ہوئے اور حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ مرکزی امیر اور مولانا فضل الرحمان سیکرٹری جنرل بن گئے تو مجھے متحدہ جمعیت علماء اسلام میں مرکزی سیکرٹری اطلاعات اور مرکزی ناظم انتخابات کے طور پر ذمہ داریاں سونپ دی گئیں اور میں نے کچھ عرصہ اس

حیثیت سے کام بھی کیا۔ لیکن سابقہ درخواستی گروپ کے سیکرٹری جنرل مولانا سمیع الحق نے اس اتحاد کو قبول نہ کرتے ہوئے سمیع الحق گروپ کے نام سے اپنا علیحدہ تشخص برقرار رکھنا ضروری سمجھا تو میرے لیے اس صورتحال کو قبول کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ میں نے جمعیت علماء اسلام کی ابتدائی رکنیت برقرار رکھتے ہوئے اس کے تمام مناصب سے استعفٰی دے دیا، اور تب سے انتخابی اور علی سیاست سے کنارہ کش رہ کر فکری اور علمی محاذ پر نفاذ شریعت کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں۔

سوال: عالمی سطح پر فکری و نظریاتی کشمکش، قحط الرجال کے زمانے میں تو آپ جیسے دانشوروں کی قوم کو زیادہ ضرورت ہے، آپ کو غیر فعال نہیں ہونا چاہیے؟

جواب: جی ہاں، اس دوران مجھے مختلف اطراف اور دوستوں کی طرف سے بار بار کہا گیا کہ میں عملی سیاست میں دوبارہ فعال ہو جاؤں لیکن میں صاف انکار کرتا آ رہا ہوں، نجی محفلوں میں احباب کو ان کے استفسار پر اس کی وجوہات سے بھی آگاہ کرتا رہا ہوں۔ میرے دوبارہ فعال نہ ہونے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، مگر اس کی سب سے بڑی وجہ مولانا فضل الرحمان اور مولانا سمیع الحق کے الگ الگ سیاسی راستے ہیں اور دونوں جمعیتوں کا متحد نہ ہونا ہے۔ میں بہت سے بزرگوں کے ساتھ مل کر اس کے لیے کوشش کرتا رہا ہوں اور بڑے بڑے اکابر نے اس کے لیے مسلسل محنت کی ہے مگر کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آیا اور اب تو اس کی کوئی توقع بھی باقی نہیں رہی۔

گزشتہ ڈیڑھ عشرے سے جمعیۃ کے ایک گروپ کا رخ نظریاتی اور تحریکی سیاست سے معروضی سیاست کی طرف مڑ گیا اور وہ اسی پر پختہ ہوتے جا رہے ہیں، مجھے اس طرز عمل سے شدید اختلاف ہے۔ ہماری اصل قوت تحریکی رہی ہے اور پارلیمنٹ میں ہماری نمائندگی اسی تحریکی قوت، اسٹریٹ پاور اور رائے عامہ کی نمائندگی کی خاطر ہوتی تھی۔ مگر اصل قوت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور محض پارلیمانی سیاست کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا گیا ہے۔ جو تحریکی قوت اور اسٹریٹ پاور کے بغیر بالکل بے وزن ہے اور اس سے نفاذ شریعت کی طرف عملی پیش قدمی کی توقع خوش فہمی بلکہ خود فریبی سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

اصل المیہ میرے نزدیک یہ ہے کہ نفاذ شریعت کی جدوجہد کے طریق کار کے بارے میں ہم افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایک طرف ہتھیار اٹھانے کی نوبت جا پہنچی ہے اور دوسری طرف

پرامن تحریکی قوت سے بھی کنارہ کشی کر کے صرف پارلیمانی سیاست پر قناعت کر لی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ ہماری اصل قوت اسٹریٹ پاور اور پرامن تحریکی قوت ہے، جب تک ہم اس کی طرف واپس نہیں پلٹیں گے نفاذ شریعت کے مقصد میں نہ ہتھیار اٹھانے کا کوئی نتیجہ برآمد ہوگا اور نہ ہی پارلیمانی سیاست کے ذریعے ہم کچھ پیشرفت کر پائیں گے۔

دینی جدوجہد کے حوالہ سے تحریکی قوت کو منظّم کرنے کے لیے کئی مراحل آئے ہیں اور اس کے لیے سنجیدہ کوششیں بھی ہوئی ہیں، لیکن جمعیت علماء اسلام کی قیادت کا یہ خوف ہمیشہ آڑے آیا کہ ملک میں دینی میدان میں کسی بھی حوالے سے کوئی متبادل قیادت سامنے آ گئی تو ان کے لیے خطرات ہو سکتے ہیں۔ میری ان باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں کسی متبادل جماعت کا حامی ہوں، میرے ذہن میں غیر سیاسی دینی جماعت، عوامی قوت یا اتحاد کا مقصد متوازن یا متبادل قوت کو وجود میں لانا نہیں بلکہ ایک معاون قوت کو منظّم کرنا ہے۔ ورنہ اگر متبادل قیادت یا متوازی جماعت کھڑی کرنے کا پروگرام ہو تو ذاتی طور پر میرے لیے اس کے امکانات بھی موجود ہیں اور بحمد اللہ تعالیٰ مواقع بھی میسر ہیں، مگر میں نے ایسا نہ کرنے کا حتمی فیصلہ کر رکھا ہے۔ اس لیے مولانا فضل الرحمان اور ان کے رفقاء سے ہی مسلسل عرض کر رہا ہوں کہ تحریکی قوت اور اسٹریٹ پاور کے بغیر محض پارلیمانی سیاست پاکستان میں نفاذ اسلام کے لیے مؤثر راستہ نہیں ہے۔ پارلیمانی سیاست کو عوامی دباؤ اور اسٹریٹ پاور کی حمایت اور پشت پناہی میسر ہوگی تو وہ اپنا کردار مؤثر طریقے سے ادا کر سکے گی، ورنہ وہی کچھ ہوتا رہے گا جو اس وقت ہو رہا ہے۔

ماضی میں بھی یہ صورتحال رہی ہے کہ سیاسی میدان میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ اپنے رفقاء کی ٹیم کے ساتھ پارلیمانی سیاست میں متحرک رہے ہیں۔ مگر غیر سیاسی دینی محاذ پر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ، حضرت مولانا عبد الستار تونسوی مدظلہ اور ان جیسے دیگر اکابر علماء کرام کی قیادت میں عوامی دباؤ کی قوت ان کی پشت پر رہی ہے۔ آج یہ عوامی قوت پارلیمانی سیاست کی پشت پر موجود نہیں ہے اور اس خلا کو پر کیے بغیر محض پارلیمانی سیاست کے ذریعے ملکی صورتحال میں کسی اصلاح اور ملکی نظام میں کسی تبدیلی کی امید کو میں محض خوش فہمی سمجھتا ہوں۔

اسلام کا نظامِ خلافت

سوال: اسلامی نظام اور خلافت کیا ہے؟

جواب: قرآن وسنت میں انسانی زندگی کے انفرادی، خاندانی، معاشرتی، قومی، اور بین الاقوامی مسائل کے بارے میں جو ہدایات واحکام موجود ہیں، ان کا مجموعہ اسلامی نظام ہے اور ان کے عملی نفاذ کا سسٹم ''خلافت'' کہلاتا ہے۔

سوال: اسلامی نظام کے نفاذ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: قرآن وسنت کے تمام احکام وقوانین ہر مسلمان کے لیے واجب الاتباع ہیں اور ان میں شخصی، خاندانی، یا معاشرتی قوانین کی تفریق نہیں ہے۔ اس لیے جس طرح ایک مسلمان شخص کے لیے نماز، روزہ اور عبادات کے احکام پر عمل کرنا ضروری ہے اسی طرح مسلمان سوسائٹی کے لیے اجتماعی احکام وقوانین پر عمل کرنا بھی ضروری ہے اور بحیثیت مسلمان سب اس کے پابند ہیں۔

سوال: حدیث کی روشنی میں بتائیے کہ اسلامی خلافت کے بارے میں کچھ بتایا گیا ہے یعنی پیشگوئیاں؟

جواب: جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیسیوں احادیث میں خلافت کے بارے میں جو پیشگوئیاں فرمائی ہیں، ان کے مطابق خلافت کے دو درجے ہیں:

(۱) ایک خلافت ''علیٰ منهاج النبوة'' جسے ہم آئیڈیل خلافت کہہ سکتے ہیں،

(۲) دوسرا درجہ مطلق اسلامی خلافت کا ہے۔

آئیڈیل خلافت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ وہ ان کے بعد تیس سال تک رہے گی اور پھر قیامت سے پہلے امام مہدیؑ کے ظہور اور حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے دور میں دوبارہ قائم ہوگی۔ جبکہ خلافتِ عامہ کا تسلسل جاری رہا ہے اور ۱۹۲۴ء میں ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ تک خلافت کا نظام کسی نہ کسی سطح پر موجود رہا ہے۔ مگر آج کے دور میں دنیا ''خلافت'' کے وجود سے خالی ہے جس پر فقہائے امت کے ارشادات کی روشنی میں امتِ مسلمہ بحیثیت امت ایک فریضہ کی تارک اور گنہگار ہے۔

شریعت اور خلافت میں فرق

سوال: شریعت اور خلافت میں کیا فرق ہے اور موجودہ دور میں اس کے لیے کیا شکل ہو سکتی ہے؟

جواب: ''شریعت'' اسلامی احکام وقوانین کے مجموعہ کو کہتے ہیں اور ''خلافت'' ان کے نفاذ کا نظام اور سسٹم ہے۔ آج کے دور میں خلافت کے حوالے سے دو باتیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں:

(۱) ایک یہ کہ خلافت کا قیام دنیا بھر کے مسلمانوں کا دینی فریضہ اور پوری مملکتِ اسلامیہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قیامِ خلافت کے فرض ہونے پر دو باتوں سے استدلال کیا ہے۔ ایک یہ کہ قرآن وسنت کے بہت سے اہم احکام ایسے ہیں جن پر حکومت ہی عمل کر سکتی ہے اور حکومتی نظام کے بغیر ان پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایسے قرآنی احکام کی عملداری کے لیے خلافت کا قیام ضروری ہے۔

(۲) اور دوسری بات یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرات صحابہ کرامؓ نے سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کر کے خلافت کا ادارہ قائم کیا، حتیٰ کہ جناب نبی اکرمؐ کی تدفین بھی اس کے بعد ہوئی۔ اس طرح صحابہ کرامؓ نے اس سے پہلے اجماعی فیصلے کی صورت میں خلافت کے قیام کو ''اہم الواجبات'' کا درجہ دے دیا۔ اس لیے خلافت کے قیام کی پہلی عملی صورت تو وہی ہے جو حضرت صدیق اکبرؓ کے خلیفہ بنتے وقت اختیار کی گئی تھی کہ امت کے اجتماعی شعور اور اتفاق رائے کے ذریعے انہیں خلیفہ بنایا گیا تھا۔ جبکہ دوسری عملی صورت یہ ہے کہ کسی ایک اسلامی ملک پر کوئی دینی قوت طاقت کے ذریعے برسر اقتدار آ جائے اور ایک اسلامی امارت کی حیثیت سے عالمی سطح پر خلافت کے نظام کے لیے محنت کر کے اس کے قیام کا راستہ نکالے۔ ہمارے خیال میں اس کے سوا کوئی صورت آج کے معروضی حالات میں قابل عمل نہیں ہے۔

حکومت کے قیام کا طریقہ کار

سوال: اسلامی نظام کا کوئی خاص طریقہ کار ہے یا کوئی

بھی مروجہ طریقہ انقلاب ہو، وہ اپنایا جا سکتا ہے؟

جواب: اسلامی نظام تو ایک اسلامی حکومت ہی نافذ کرے گی۔ جبکہ ایک اسلامی حکومت کے قیام کے لیے سب سے بہتر اور آئیڈیل طریق کار وہی ہے جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو باہمی مشورہ اور بحث ومباحثہ کے بعد اتفاق رائے سے خلیفہ منتخب کر کے اختیار کیا تھا۔ اس کے بعد مختلف خلفائے راشدین کے انتخاب کے طریقے اور حضرات صحابہ کرامؓ کی اختیار کردہ متعدد صورتیں بھی اس طریق کار کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کے لیے پہلے سے خلافت کا نظام اور سسٹم موجود ہونا ضروری ہے۔ آج کل چونکہ از سرنو خلافت کے ڈھانچے کی تشکیل کا مرحلہ درپیش ہے، اس لیے حضرت صدیق اکبرؓ کے انتخاب والا طریقہ ہی اس کے لیے درست طریق کار ہے۔

حکومتی نظام کا ڈھانچہ

سوال: اسلامی نظام یا خلافت کا کیا کوئی خاص حکومتی ماڈل ہوتا ہے؟ مثلاً شوریٰ کے چند ممبران یا پارٹی اور پارلیمنٹری سسٹم، یا ایک حاکم وقت جو اپنے فیصلے قرآن و سنت کی روشنی میں خود کرتا ہو؟ آخر اسلامی حکومت کا ماڈل کیسا ہو گا؟

جواب:

- ☆ خلافت کا بنیادی تصور یہ ہے کہ خلیفہ خود مستقل حکمران نہیں ہوتا بلکہ حکمرانی کے معاملات میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت وخلافت کرتا ہے۔ اور اس طرح وہ خود حکومت کرنے کی بجائے جناب نبی کریمؐ کے حق حکمرانی کو ان کی تعلیمات وہدایات کے دائرے میں رہتے ہوئے نیابتاً استعمال کرتا ہے۔
- ☆ خلیفہ کا انتخاب حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح عوام کی اجتماعی رائے سے ہوتا ہے، عوام کا اعتماد وانتخاب ہی اس کے حق حکمرانی کی بنیاد ہے۔
- ☆ وہ اپنی معاونت ومشاورت کے لیے اہلیت اور صلاحیت رکھنے والے افراد کا انتخاب کرے گا اور ان کے مشورہ سے حکومتی نظام چلائے گا۔

☆ یہ طرز حکومت بظاہر شخصی ہے لیکن خلیفہ چونکہ قرآن وسنت کی ہدایات وتعلیمات کا پابند ہے اس لیے وہ اپنی ذاتی خواہش کی بنیاد پر کوئی کام کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

☆ رعیت کے ہر فرد کو بلا امتیاز مذہب خلیفہ سے کھلے بندوں باز پرس کا حق حاصل ہے اور وہ ہر شخص کو مطمئن کرنے کا پابند ہے۔

☆ خلیفہ کے کسی بھی حکم کو عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا ہے اور وہ عدالت کی حاضری اور جوابدہی سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

خلافت ان اصولوں کی بنیاد پر قائم ہوگی مگر اس کی عملی تفصیلات اور طریق کار ہر زمانے میں اور ہر علاقے کے ماحول اور ضروریات کو دیکھ کر ارباب حل وعقد طے کریں گے۔

ہمارے نزدیک قیام پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی نے جو قرارداد مقاصد منظور کی تھی اور پھر تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علمائے کرام نے جو ۲۲ دستوری نکات متفقہ طور پر دیے تھے، وہ آج کے دور میں اسلامی حکومت کے قیام اور اسلامی نظام کے نفاذ کی بہترین بنیاد بن سکتے ہیں اور اس کا خلاصہ دو اصولوں کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) حکومت کا قیام عوام کی رائے سے ہوگا۔

(۲) حکومت قرآن وسنت کے احکام کی پابند ہوگی۔

جمہوریت کا تصور

سوال: موجودہ دور کی جمہوریت اور خلافت کا موازنہ کریں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ خلافت کے نظام میں ہی ترقی کی ہے۔ آج کی دنیا میں خلافت کے سسٹم کو پرانا سسٹم کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: جمہوریت انسان پر انسان کی حکمرانی کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ پارلیمنٹ کو بلاتفریق ہر قسم کا اختیار دے کر آسمانی تعلیمات کے نفاذ یا عدم نفاذ کو اسی کے دائرہ اختیار میں شامل کر دیا گیا ہے، اور اسے احکام خداوندی پر بھی نعوذ باللہ بالادستی دے دی گئی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس خلافت اگرچہ عوام کے اعتماد واختیار کے ذریعے ہی تشکیل پاتی ہے لیکن اس میں خلیفہ، یا اس کی شوریٰ، یا پھر عوام کی منتخب پارلیمنٹ کو قرآن وسنت کا پابند رہنا پڑتا ہے اور اسلامی احکام سے

انحراف کی اجازت نہیں ہوتی۔

مغرب نے جب بادشاہت، پاپائیت اور جاگیرداری پر مشتمل تکون کے صدیوں سے چلے آنے والے مظالم سے تنگ آ کر ان تین ظالم طبقوں کے گٹھ جوڑ کے خلاف بغاوت کی اور بادشاہت اور جاگیرداری کی طرح مذہب کو بھی معاشرتی زندگی سے بے دخل کر دیا، تو نئے مذہب بیزار نظام کی کامیابی کے لیے اس نے ضروری سمجھا کہ یورپ اور ایشیا کے سنگم پر خلافت عثمانیہ کو بھی راہ سے ہٹائے۔ چنانچہ خلافت عثمانیہ کے خلاف مسلسل سازشیں کر کے اسے ختم کر دیا گیا اور آج بھی مغرب کے ایجنڈے میں سرفہرست یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں خلافت کے قیام اور شریعت کے نفاذ کو روکا جائے۔ کیونکہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں آسمانی تعلیمات کی بنیاد پر کوئی ریاست وحکومت وجود میں آتی ہے اور کامیاب ہو جاتی ہے تو اس سے مغرب کے اس مذہب بیزار فلسفہ و نظام کی نفی ہو جائے گی جسے وہ دنیا بھر میں مسلط کرنے کی مسلسل تگ ودو کر رہا ہے۔

جبکہ مسلمانوں کے لیے آج بھی خلافت ہی واحد سیاسی نظام ہے جو پوری دنیائے اسلام کی اجتماعیت کا مرکز بن سکتا ہے اور اس کے زیر سایہ دنیا بھر کے مسلمان برکات وثمرات کے ساتھ ساتھ دنیوی اقتدار اور ترقی سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔

سیاسی جماعتوں کی حیثیت

سوال: اسلام میں سیاست کا کیا تصور ہے؟ لسانی اور فرقے کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں بنانا کیا درست ہے؟

جواب: بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل میں سیاسی قیادت انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس تھی، مگر اب چونکہ نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور کوئی نیا نبی نہیں آئے گا اس لیے سیاسی قیادت کی ذمہ داری خلفاء کو منتقل ہو گئی ہے۔ اس حدیث مبارکہ میں جناب نبی اکرمؐ نے مسلمانوں کو خلافت کے نظام کے ساتھ وابستگی اور وفاداری کی تلقین بھی فرمائی ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام ''خلافت'' کہلاتا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مہاجرین، انصار اور خاندان نبوت کا اپنا اپنا سیاسی موقف الگ طور پر طے کرنا اور پھر صحابہ کرامؓ

کے دور میں شیعانِ عثمانؓ، شیعانِ علیؓ اور شیعانِ معاویہؓ کے نام سے الگ الگ سیاسی گروہوں کی موجودگی یہ بتاتی ہے کہ اسلامی نظام میں مختلف سیاسی گروہوں کی موجودگی کی مطلقاً نفی نہیں کی جا سکتی، اور گروہی بنیاد پر سیاسی معاملات طے کرنا بھی اسلامی نظام میں نامانوس نہیں ہے۔ البتہ ان کی بنیاد "**تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان**" پر ہوگی۔ اور حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے حوالے سے موافق اور مخالف دھڑوں کی آج کے مروجہ دور میں جو تقسیم پائی جاتی ہے، اس کی گنجائش اسلامی نظام میں موجود دکھائی نہیں دیتی۔ ایک گروہ کی ہر حال میں حمایت اور دوسرے کی ہر صورت میں مخالفت کا تصور اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح مذہبی فرقہ بندی اور لسانیت کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں بنانا بھی درست نہیں ہے۔

خواتین کے حقوق

سوال: اسلامی نظام میں عورت کو کیا حقوق حاصل ہیں؟

جواب: اسلام میں عورت کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو مرد کو ہیں، البتہ اس کی صنفی اور معاشرتی ذمہ داریوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے حقوق و فرائض کا مرد سے امتیاز رکھا گیا ہے جو فطری طور پر ناگزیر ہے۔ اور سوسائٹی میں خاندان کے یونٹ کو برقرار رکھنے اور اسے استحکام دینے کے لیے خاندانی سسٹم میں مرد کی فوقیت اور سنیارٹی کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی ادارہ برابر کے اختیارات کے حامل دو افراد کی سربراہی میں نہیں چل سکتا۔ جیسا کہ خاندانی نظام میں مرد کی سربراہی کی نفی کر کے مغربی دنیا اس کا خمیازہ خاندانی نظام کے بکھر جانے کی صورت میں بھگت رہی ہے۔ چنانچہ صنفی اور معاشرتی ذمہ داریوں کے حوالہ سے ناگزیر فرق و امتیاز سے ہٹ کر باقی تمام معاملات میں مرد اور عورت برابر ہیں اور دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔ ہم مغرب کی جانب سے آزادی اور حقوق کے نام پر چلائی جانے والی مہم کو محض دھوکہ دہی سمجھتے ہیں، ورنہ اسلام نے سب سے پہلے عورت کو معاشرے میں حقوق اور آزادی دی ہے۔

غیر مسلموں کے حقوق

سوال: اسلامی نظام میں غیر مسلموں کو کیا حقوق یا

فوائد حاصل ہیں؟

جواب:

☆ اسلامی نظام میں مسلمان ریاست کے غیر مسلم باشندوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو ان کے مسلمان ریاست کا شہری قرار پانے کے لیے باہمی معاہدہ کی صورت میں طے ہو جائیں گے۔ مثلاً اس وقت پاکستان میں جو دستور نافذ ہے وہ غیر مسلم باشندوں کی رضامندی کے ساتھ طے پایا تھا اور ان کی شراکت کے ساتھ نافذ ہوا تھا۔ اس دستور کی حیثیت معاہدہ کی ہے۔

☆ پاکستان میں بسنے والی غیر مسلم سوسائٹیاں معاہد ہیں اور انہیں اس طرز پر دستور میں طے شدہ تمام حقوق حاصل ہیں۔

☆ اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلم اکثریت اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔

☆ انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے، اپنی نئی نسل کو مذہبی تعلیم دینے اور اپنے مذہبی تشخص کے تحفظ کا پورا حق ہے۔

☆ البتہ وہ ملک کے ریاستی نظریے کے خلاف کام کرنے کے مجاز نہیں ہیں اور انہیں ملک کے نظریاتی تشخص کی نفی کرنے اور اس کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

آج کی مسلم دنیا اور اسلامی نظام

سوال: مسلم دنیا میں اسلامی نظام کیوں نافذ نہیں ہوا؟ اور اسلام کے نام پر بننے والے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ میں کیا بنیادی مشکلات ہیں اور ان کا کیا حل ہے؟

جواب:

(۱) مسلم ممالک میں اسلامی نظام نافذ نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ ان کی رولنگ کلاس اور حکمران طبقات ہیں جن کی تعلیم و تربیت اسلامی تعلیمات اور ماحول میں نہیں ہوئی۔ ان کے مفادات مغرب کے ساتھ وابستہ ہیں، ان کی بود و باش اور طرز زندگی اسلامی نہیں

ہے، اور اسلامی نظام کے نفاذ کو وہ خود اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں، اس لیے اسلامی نظام کی مخالفت کا حوصلہ نہ ہونے کے باوجود وہ عملاً اس کے نفاذ میں رکاوٹ ہیں۔

(۲) مسلم ممالک میں اسلامی نظام کے نافذ نہ ہونے کی دوسری بڑی وجہ موجودہ عالمی ماحول اور سسٹم ہے۔ موجودہ عالمی نظام جو اقوام متحدہ اور اس میں ویٹو پاور رکھنے والے پانچ ممالک کی پالیسیوں اور خواہشات پر مرتب ہوا ہے اور چلایا جا رہا ہے، اس کی بنیاد ہی خلافت کی نفی اور انسانی سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی بے دخلی پر ہے۔ اس لیے موجودہ عالمی نظام انسانی سوسائٹی میں اسلامی نظام کی صورت میں آسمانی تعلیمات کی عملداری دوبارہ قائم ہونے کی مخالفت بلکہ مزاحمت کر رہا ہے اور اس کے لیے اپنے تمام وسائل اور توانائیاں صرف کر رہا ہے۔

(۳) مسلم ممالک میں اسلامی نظام کے نافذ نہ ہونے کی تیسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے نفاذ چاہنے والے دینی حلقوں کی اکثریت آج کے معروضی حالات، رکاوٹوں، مشکلات اور مناسب طریق کار کے ادراک سے یا تو بہرہ ور نہیں ہے اور یا عمداً انہیں نظر انداز کر کے محض جذبات اور میسر طاقت کے ذریعے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے، جس کے نتائج وہی ہو سکتے ہیں جو نظر آ رہے ہیں۔ نفاذ اسلام کی جدوجہد کرنے والوں کے درمیان مفاہمت و معاونت کی فضا موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس کی کسی سطح پر ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اسی طرح مسائل و معاملات کے تجزیہ، تحقیق اور منفی و مثبت پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ان کی روشنی میں ٹھوس لائحہ عمل طے کرنے کا کوئی ذوق دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

سوال: اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جو عالمی سطح پر کوششیں ہو رہی ہیں وہ کونسی ہیں اور آپ کیا کسی کو صحیح معنوں میں کامیاب ہوتا دیکھتے ہیں؟

جواب: بیشتر مسلم ممالک نوآبادیاتی دور سے گزرے ہیں۔ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، پرتگال اور دوسرے ممالک نے اپنے دور تسلط میں ان مسلم ممالک میں مسلم سوسائٹی کے اجتماعی مزاج کو بگاڑنے پر زیادہ کام کیا ہے۔ اور ان ممالک کی آزادی کے بعد ان میں نوآبادیاتی نظام ابھی تک

باقی ہے اور وہ معاشرتی مزاج کے بگاڑ کو درست کرنے کی طرف بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد جن طبقات نے نظام سنبھالا ہے وہ نوآبادیاتی نظام ہی کے پروردہ اور تربیت یافتہ تھے جنہیں نظام کی تبدیلی میں اپنے لیے خطرات محسوس ہو رہے ہیں اور وہ اس کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسلم ممالک کے عوام اسلامی نظام کے نفاذ اور قرآن وسنت کی تعلیمات پر عملدرآمد میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن حکمران طبقات اور ریاستی ڈھانچے اس کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

پاکستان میں قرارداد مقاصد کی منظوری اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلامی دفعات کی شمولیت کے ساتھ قرآن وسنت کے احکام کو نافذ کرنے اور خلافِ قرآن وسنت قوانین کی منسوخی کی جو دستوری ضمانت دی گئی ہے، اس کے بعد قرآن وسنت کے احکام کے نفاذ میں کوئی اصولی وآئینی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ لیکن عالمی استعماری قوتوں کا دباؤ اور نوآبادیاتی نظام کے تسلسل کی وارث بیوروکریسی اپنے مفادات کی وجہ سے دستور کی اسلامی دفعات پر عملدرآمد نہیں ہونے دے رہی، اور پاکستان سمیت مسلم ممالک میں اسلامی تحریکات کی اب تک ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔

جبکہ موجودہ حالات میں جب تک اسلامی نظام کے نفاذ کے خواہاں حلقے اپنی حکمت عملی اور طرز عمل پر نظر ثانی کر کے معروضی حالات وضروریات کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت ومفاہمت کے ساتھ کوئی مشترکہ حکمت عملی طے نہیں کرتے، تب تک مسلم ممالک میں نفاذ اسلام کی تحریکات کی کامیابی کے کوئی آثار بظاہر دکھائی نہیں دیتے۔

انسانیت کو درپیش مسائل اور اسلامی نظام

سوال: اسلامی نظام نے ماضی میں انسانیت کو درپیش اہم مسائل کو کیسے حل کیا، اور آج کی پوزیشن کیا ہے؟

جواب:

☆ اسلامی نظام کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس نے شخصی حکومت کے طریق کار کو ختم کر کے دستوری حکومت قائم کی جس کا نقطہ آغاز حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے یہ اعلانات ہیں کہ ہم اگر کتاب وسنت کے مطابق چلیں تو لوگوں پر ہماری اطاعت واجب

ہے اور اگر قرآن و سنت سے انحراف کریں تو عوام کو ہماری اصلاح کا نہ صرف حق حاصل ہے بلکہ یہ ان کی دینی ذمہ داری ہے۔

☆ خلفائے راشدینؓ نے خود کو عوام کے سامنے احتساب کے لیے نہ صرف پیش کیا بلکہ ہر وقت اپنے آپ کو عوامی احتساب کے دائرے میں رکھا اور ہر شہری کو یہ حق دیا کہ وہ ان کی کسی بات پر کسی وقت اور کسی جگہ بھی ٹوک سکتا ہے اور وہ اس کا جواب دینے کے پابند ہیں۔

☆ خلفائے راشدینؓ نے عملی طور پر ایک ویلفیئر اسٹیٹ کا نمونہ پیش کیا اور حکومت کو عوام کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان کی ضروریات زندگی کی فراہمی اور کفالت کی ذمہ داری بھی دی جس کا آج کی دنیا بھی اعتراف کر رہی ہے۔

☆ خلفائے راشدینؓ نے حکمرانوں کو سادہ زندگی، قناعت اور غریب عوام کے ساتھ ان کی سطح پر رہنے کا خوگر بنایا اور صحیح معنوں میں ایک عوامی حکومت کا تصور پیش کیا۔

☆ اسلامی نظام نے صحیح معنوں میں سوسائٹی کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم کیا اور تمام تر طرز عمل اور پالیسیوں کی بنیاد خوف خدا اور آخرت کی جوابدہی پر رکھی۔

سوال: آپ کے نزدیک آج کے دور میں عالمی سطح پر بے چینی کے کیا اسباب ہیں اور انسانیت ان مسائل سے کیسے نکل سکتی ہے؟

جواب:

(۱) آج کی دنیا اور انسانی سوسائٹی کا ایک بڑا اور مؤثر حصہ آسمانی تعلیمات اور اپنے پیدا کرنے والے خدا کے احکام سے بیگانہ بلکہ باغی ہو چکا ہے۔ سوسائٹی کو وحی الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی طرف واپس لانے کے لیے اس وقت دنیا کے پاس اسلامی نظام کے سوا کوئی متبادل موجود نہیں ہے۔

(۲) آج کی دنیا نے انسانی سوسائٹی کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے: ایک قانون بنانے والے اور دوسرے وہ جن پر قانون نافذ ہوگا۔ اس تفریق کے منطقی نتائج اور منفی ثمرات کو تمام تر

کوششوں کے باوجود ختم نہیں کیا جا سکا اور دنیا حکمران اور محکوم کے دائروں میں بدستور بٹی ہوئی ہے۔ اس کا حل صرف اسلام کے پاس ہے کہ قانون بنانے والا صرف ایک ہے اور تمام انسان اس ایک ذات کے بنائے ہوئے قوانین واحکام کے یکساں طور پر پابند ہیں۔

(۳) سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم کی عالمی کشمکش اور اس کے بعد سود، منافع خوری اور سٹہ پر مبنی اور حلال وحرام سے بے نیاز مارکیٹ اکانومی نے جس خوفناک معاشی بحران سے دنیا کو دوچار کر دیا ہے اس کا حل اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ دنیا کو آسمانی تعلیمات کی بنیاد پر حلال وحرام کے دائرے کی طرف واپس لایا جائے اور یکطرفہ منافع کی بجائے دوطرفہ منفعت اور عوامی مفاد پر مبنی معاشی اصولوں کو اختیار کیا جائے، جو اس وقت صرف اسلام کے پاس ہیں۔

(۴) صحیح معنوں میں ایک ویلفیئر ریاست کے قیام کے لیے آج بھی دنیا کے سامنے آئیڈیل صرف خلافت راشدہ بالخصوص حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی شخصیات ہیں، اور جزوی طور پر کچھ معاملات میں ان کی پیروی بھی کی جا رہی ہے، لیکن کسی نظام کے صرف جزوی پہلوؤں کو اختیار کر کے اس کے ثمرات حاصل نہیں کیے جا سکتے بلکہ اس سے صحیح استفادہ کے لیے پورے سسٹم کو اپنانا ضروری ہوتا ہے۔

(۵) قومیتوں، علاقائیت اور لسانی عصبیتوں نے ایک بار پھر انسانی سوسائٹی پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور آج کی عالمی دنیا میں انسانی سوسائٹی کے معاملات پھر سے قوم اور ملک کے حوالہ سے طے ہو رہے ہیں۔ اسلام نے انہیں جاہلی قدریں قرار دے کر قوم، زبان اور ملک کے تصور کو صرف تعارف اور امتیاز کی حدود میں پابند کر دیا تھا اور نسل انسانی کو ان عصبیتوں کے استحصالی کردار سے عملاً نجات دلا دی تھی۔ آج پھر اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور اس سلسلہ میں صرف اسلام ہی کردار ادا کر سکتا ہے۔

مذہبی جماعتیں اور احیائے اسلام کا سفر

سوال: دینی جماعتیں منتشر کیوں ہیں، سیاست اور عوام میں ان کا کردار مؤثر کیوں نہیں ہوا؟

جواب: ہمارے مشرقی معاشرے میں عوام کی مذہب کے ساتھ غیر متزلزل کمٹمنٹ ہے، معاشرے کا فرد عمل میں جیسا بھی ہو مگر خود کو دین و مذہب کے دائروں کا پابند سمجھتا ہے، اس میں بنیادی کردار علماء اور مذہبی جماعتوں کا ہے کہ انہوں نے آسمانی تعلیمات پر خود بھی حتی الوسع عمل کیا ہے اور عوام کو بھی جوڑے رکھا ہے۔ یہ ایک مستقل پہلو ہے کہ ’’کردار مؤثر کیوں نہیں ہوا‘‘ یہ مؤثر اور فیصلہ کن پوزیشن میں بھی ہوسکتا ہے اور ہونا چاہیے۔

میری نظر میں مذہبی جماعتوں کا منتشر ہونا ہی مؤثر کردار نہ ہونے کا بنیادی سبب ہے۔ ہماری مذہبی جماعتیں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہیں، چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنی ہوئی ہیں، سب کے راستے اور مقاصد جدا جدا ہیں، کاوشوں اور محنتوں کے میدان مختلف ہیں، اس طرح ان کی قوت بٹ کر رہ گئی ہے۔ وطن عزیز کو اس وقت جن مشکل ترین چیلنجز کا سامنا ہے ان کا ایک بہت بڑا سبب ہمارا باہمی انتشار اور افتراق بھی ہے۔ مسلکی بنیادوں پر تقسیم اور فرقہ واریت نے ہمیں کمزور کر دیا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری جدوجہد اور مساعی کا مرکز ومحور بھی یہ بن گیا ہے کہ ان فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دیتے رہیں۔ ہم من حیث القوم فرقہ واریت کی اس آگ میں جھلس رہے ہیں اور روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ماضی میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کو قریب لانے اور ان کے مابین پائیدار اتحاد قائم کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن یہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکیں، اس ناکامی کے کئی اسباب ہیں:

(۱) اولاً، یہ کوشش سیاسی محرکات کی بنا پر کی گئیں جن کا مطمح نظر عارضی اور وقتی فوائد تھے جو کسی نہ کسی درجے میں حاصل بھی ہوئے، لیکن قوم کو اتحاد امت کے حقیقی ثمرات نہ مل سکے بلکہ کچھ وقت گزرنے کے بعد مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کی وسعت قلبی، رواداری اور بالغ نظری کے حوالے سے جو حسن ظن قائم ہوا تھا اس کا تصور بھی دھندلانے لگا۔ بظاہر تو ایک پلیٹ فارم پر کچھ وقت کے لیے جمع تھے مگر ان کا دل نہ مل سکا صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا گیا۔

(۲) ثانیاً، اتحاد کی جو کوششیں مخصوص مواقع پر حکومت کی جانب سے کی جاتی ہیں۔ ان کا مقصد کسی مخصوص صورتحال میں مختلف مکاتب فکر کے نمائندہ علماء کرام کو جمع کر کے یہ تاثر دینا

ہوتا ہے کہ تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اس معاملہ میں حکومت کے مؤید اور معاون ہیں۔ اس کی مثال حالیہ خودکش حملوں کے بعد کی جانے والی وہ حکومتی کوششیں ہیں جو وقتاً فوقتاً خودکش حملوں کے حوالے سے تمام مکاتب فکر کا اجتماعی موقف سامنے لانے کے لیے کی گئیں، جو نظریہ ضرورت کے تحت تھیں اور عارضی ثابت ہوئیں۔

(۳) ثالثاً، حکومتی سطح پر ہی کی جانے والی وہ کوششیں جو ہر سال مخصوص مذہبی ایام سے قبل اس لیے کی جاتی ہیں کہ ان ایام میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور تصادم کے امکانات سے گریز کیا جا سکے۔ اس نوع کی کوششیں بھی کچھ نہ کچھ نتائج پیدا کرتی ہیں لیکن صاف ظاہر ہے کہ ان کوششوں کا ہدف ہی عارضی اور عبوری ہوتا ہے، لہٰذا ان کے ذریعے اتحاد امت کا خواب دیکھنا عبث ہے۔

(۴) رابعاً، بعض مذہبی جماعتوں کی طرف سے بھی وقتاً فوقتاً اتحاد امت کے لیے کوششیں کی گئیں، کچھ فارمولے بھی وضع کیے گئے لیکن عملاً ان پر کوئی قابل ذکر پیشرفت نہ ہو سکی۔

الحاصل اس وقت تک مذہبی طبقے کی آواز مؤثر نہیں ہو سکتی جب تک یہ سب متحد نہ ہوں۔

سوال: اس دور میں مذہبی جماعتیں اسلامی نظام کے احیا کے لیے کونسا راستہ اختیار کریں؟

جواب: پاکستان کی بیشتر مذہبی جماعتیں صرف پریشر گروپ ہیں، جو مذہبی مکاتب فکر کی بنیاد پر جداگانہ تشخص کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ ان کے پاس جب تک پریشر پاور ہو گی اپنے محدود دائرے میں کام کرتی رہیں گے اور قومی سیاست میں بھی اسی حد تک شریک رہیں گی۔ اس سے زیادہ یہ کوئی رول ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ البتہ متحدہ سیاسی پلیٹ فارم قائم کر کے یہ ایک طاقتور پریشر گروپ کی صورت میں ملک میں مزید اسلامی قوانین واحکام کے نفاذ اور خلاف اسلام امور کی روک تھام کے لیے زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ جبکہ اس حوالے سے اصل ضرورت ایک ایسی سیاسی قوت کی ہے جس میں تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام پارٹی ممبر کے طور پر شریک ہوں۔ مختلف طبقات کے سرکردہ حضرات بھی اس کا حصہ ہوں اور سب مل کر ملک کی قومی سیاست میں اسلامی اقدار کی سربلندی کے لیے مشترکہ جدوجہد کریں۔

دین اسلام کی اشاعت اور دفاع علماء کا فرض ہے، ہمارے اکابر نے ہر دور میں وقت کی زبان اور تقاضے کے مطابق اشاعت دین اور دفاع دین کا کام کیا ہے اور یہ مورچہ کبھی خالی نہیں ہونے دیا۔ آنے والا مشکل دور آ رہا ہے جس میں علماء کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں، سب سے بڑی ضرورت فکر و نظر کے محاذ پر ہے اور اس کے بعد پاکستان کے اسلامی تشخص واقدار کی بحالی، آئین کی عملداری، اور نفاذ شریعت کا معاملہ، ان سب کے لیے فروعی اختلافات اور فرقہ بندیوں سے بالاتر ہو کر سوچنے کی ضرورت ہے اور تمام مذہبی جماعتوں کو مل کر سیاسی پلیٹ فارم بنانا چاہیے جس کے ذریعے یہ لوگ کام کریں اور ان کا طاقتور پریشر گروپ ہو اور اس کا رعب قائم رہے۔ اقدام نہ سہی کم از کم دفاع کی حد تک تو کام مضبوط ہونا چاہیے۔ اس پلیٹ فارم پر تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علمائے کرام اور قائدین پارٹی ممبر کے طور پر شریک ہوں اور قومی سیاست میں مشترکہ جدوجہد کریں۔ یہ متحدہ فورم قرارداد مقاصد کو بنیاد بنا کر آگے بڑھے اور نفاذ اسلام کے لیے کوششیں جاری رکھے۔

اگر تاریخ کے اس اہم موڑ پر ہم نے سردمہری سے کام لیا اور نئی نسل کی اسلامی خطوط پر تربیت نہ کی، فکری اور نظریاتی اساس فراہم نہ کی تو آنے والی نسلیں دین سے دور ہو کر اندھیروں میں بھٹک جائیں گی اور ہم سب اس کے ذمہ دار مجرم ٹھہریں گے۔ اس دور میں پہلے سے بڑھ کر مذہبی جماعتوں کو متحرک کردار ادا کرنا ہوگا۔

سوال: کسی بھی بڑے مقصد کے لیے اتحاد ضروری ہے۔ اسلامی نظام کا ہدف حاصل کرنے کے لیے مذہبی جماعتیں اتحاد کیوں نہیں کرتیں؟ اتحاد کے راستے میں رکاوٹ کیا ہے؟

جواب: جہاں تک پاکستان میں نفاذ اسلام کا تعلق ہے، دینی جماعتوں اور علماء کرام نے اس کے لیے مختلف مواقع پر اتحاد کا مظاہرہ کیا ہے۔ اکابر علماء کرام کے متفقہ ۲۲ دستوری نکات سے لے کر ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلامی دفعات کی شمولیت، عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کا دستوری فیصلہ اور اسلامائزیشن کے سلسلہ میں ہونے والے اب تک کے بیشتر اقدامات تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کے اتحاد اور دینی جماعتوں کی مشترکہ جدوجہد کے ذریعے ہی ہوئے ہیں۔ کم از کم پاکستان کی حد

تک کوئی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی کہ نفاذ اسلام کی دستوری اور قانونی جدوجہد کے کسی ضروری مرحلہ میں دینی جماعتوں نے اتحاد کا مظاہرہ نہ کیا ہو اور مشترکہ طور پر عوام کی رہنمائی نہ کی ہو۔

ہمارا المیہ اس سے آگے شروع ہوتا ہے کہ دینی جماعتوں کی مشترکہ جدوجہد اور تمام مکاتب فکر کے علماء کرام کے اتحاد کے ذریعے جو مقاصد اور نتائج حاصل ہوتے ہیں انہیں ہماری اسٹیبلشمنٹ طے شدہ پالیسی کے مطابق سبوتاژ کر دیتی ہے اور اس میں اسے ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کی مکمل حمایت اور پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔

ذرائع ابلاغ کی ضرورت و اہمیت

سوال: میڈیا قوم میں بیداری پیدا کرنے کے لیے بہت کام کر سکتا ہے، اس کے لیے ہمارے میڈیا میں کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

جواب: میڈیا اس وقت ابلاغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور قوم کی بہتری اور نئی نسل کی ذہن سازی اور تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اسی حوالہ سے اس کی ذمہ داری بھی بڑھ گئی ہے۔ ہم اس وقت مغربی تہذیب و ثقافت اور ہندو تہذیب و ثقافت کی دوطرفہ یلغار کی زد میں ہیں۔ ان دونوں ثقافتوں سے اسلامی ثقافت کے فرق و امتیاز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے پروگراموں کو اس انداز میں پیش کرنا میڈیا کی ذمہ داری ہے کہ اسلامی ثقافت کو فروغ حاصل ہو اور نئی نسل کو ہندو اور مغرب کی تہذیبی یلغار سے بچایا جا سکے۔

اسی طرح اسلامی اقدار و روایات اور احکام و قوانین پر آج کے عالمی فلسفہ و نظام بالخصوص انسانی حقوق کے حوالہ سے جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں اور شکوک و شبہات پھیلائے جا رہے ہیں، ان کا جواب اور آج کے عالمی تناظر میں اسلامی تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے علمی و فکری نوعیت کے پروگرام پیش کیے جائیں اور مختلف مکاتب فکر کے ایسے سرکردہ علمائے کرام اور دانشوروں کو سامنے لایا جائے جو آج کے حالات اور تقاضوں سے باخبر ہوں اور آج کے اسلوب میں بات کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی نئی نسل کو ماضی سے وابستہ رکھنے کے لیے عظیم اسلامی شخصیات

اور تحریکات کے بارے میں معلوماتی پروگرام پیش کیے جائیں۔

آج کے سیکولر میڈیا کی یہ مخصوص تکنیک ہے کہ اسلام اور اسلامی اقدار و روایات کے خلاف تو باشعور اور جدید اسلوب سے بہرہ ور افراد کو قوم کے سامنے لایا جاتا ہے، مگر ان کے جواب اور ان سے مکالمہ کے لیے جان بوجھ کر ایسی مذہبی شخصیات کو ان کے سامنے بٹھا دیا جاتا ہے جو تمام تر احترام کے باوجود آج کے حالات اور اسلوب سے واقف نہیں ہوتے۔ اس تکنیک کا توڑ کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں میڈیا کے دیندار حضرات کے ساتھ دینی اداروں اور دینی حلقوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اس صورتحال کا ادراک کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔

پاک بھارت تعلقات: ایک جائزہ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ اپریل ۲۰۱۱ء)

(ہمدرد یونیورسٹی دہلی کے شعبہ اسلامیات کے رکن ڈاکٹر یوگندر سکند کی طرف سے ارسال کردہ سوالنامہ کے جوابات)

پُرامن پاک بھارت تعلقات کا امکان

سوال: بھارت اور پاکستان دونوں اپنے قومی تشخص کی بنیاد ایک دوسرے کی مخالفت کو قرار دیتے ہیں۔ آپ کے خیال میں ایسی صورتحال میں دونوں ملکوں کے مابین پُرامن تعلقات حقیقتاً ممکن ہیں؟

جواب:

(۱) قیامِ پاکستان کے وقت پاکستان کے قومی تشخص کی بنیاد یہ تھی کہ جنوبی ایشیا کے مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور اپنے دین کے حوالے سے الگ تشخص رکھتے ہیں، اس لیے جس خطے میں ان کی اکثریت ہے وہاں ان کی الگ ریاست قائم ہونی چاہیے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایسٹ تیمور میں مسیحی اکثریت وہاں الگ ریاست کا باعث بنی اور اب جنوبی سوڈان اسی مسیحی اکثریت کے حوالے سے الگ ملک بننے جا رہا ہے۔ مگر قیامِ پاکستان کے بعد ہماری رولنگ کلاس، جس کی تربیت نوآبادیاتی ماحول میں ہوئی تھی اور وہ وہی نفسیات و مزاج رکھتی تھی، دین کی بنیاد پر تشخص اور قومی بنیاد اسے ہضم ہونے والی نہیں تھی۔

(۲) پھر اس کے ساتھ ہی برصغیر کی تقسیم کے ایجنڈے کو مسئلہ کشمیر کھڑا کر کے الجھا دیا گیا، اس لیے باہمی دشمنی کی بنیاد پر قومی تشخص کی روایت آگے بڑھتی گئی۔

میرے نزدیک یہ مصنوعی بنیاد ہے، اگر ہم اپنی اصل بنیاد کی طرف واپس لوٹ جائیں اور

بھارت بھی اس کا عملی احترام کرے تو اس دشمنی کی شدت کو کم کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اگر سعودی عرب اور ایران کے ساتھ بھارت کے دوستانہ تعلقات و معاملات ہو سکتے ہیں تو ایک اسلامی پاکستان کے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتے؟

سوال: آپ کے خیال میں مسلم اور ہندو مذہبی قائدین دونوں ممالک کے تعلقات کو بہتر بنانے میں اگر کوئی کردار ادا کر سکتے ہیں تو وہ کیا ہے؟ کیا اب تک فروغِ امن کی کوششوں کے حوالے سے ان قائدین کی غیر فعالیت یا خاموشی کے ان تعلقات پر کوئی منفی یا مثبت اثرات مرتب ہوئے ہیں؟

جواب: مسلم اور ہندو مذہبی قائدین کے درمیان ملاقاتوں اور مکالمہ کی کوئی صورت نکل سکے تو اس سے فائدہ ہوگا، لیکن یہ مکالمہ باہمی مشترکات کے فروغ، شدت پسندی کو کنٹرول کرنے اور خطے کے امن اور ترقی کے حوالے سے ہو۔ میرا خیال ہے کہ مذہبی راہنما اگر خلوص کے ساتھ مل بیٹھیں تو وہ زیادہ بہتر تجاویز دے سکتے ہیں۔

مسئلہ کشمیر اور اس کا قابلِ قبول حل

سوال: آپ کی سیاسی جماعت، جمعیت علماء اسلام کا پاک بھارت تعلقات بہتر بنانے کے حوالے سے علانیہ موقف کیا ہے؟

جواب: میں جمعیت علماء اسلام پاکستان کا ایک غیر متحرک رکن ہوں اور اس کی پالیسی سازی اور قیادت میں میرا ایک عرصہ سے کوئی کردار نہیں ہے۔ جب کہ جمعیت علماء اسلام پاکستان کے امیر مولانا فضل الرحمٰن ہیں جو پاکستانی پارلیمنٹ کی قومی کشمیر کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں۔ وہ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ بھارت کے ساتھ پاکستان کے بہتر تعلقات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسئلہ کشمیر ہے، وہ اگر بین الاقوامی معاہدات واعلانات اور کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق حل ہو جائے تو باقی تنازعات و معاملات میں مثبت پیشرفت ہو سکتی ہے۔

سوال: جمعیت علماء ہند نے حال ہی میں دارالعلوم دیوبند میں ایک بڑا کنونشن منعقد کیا ہے جس میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ وہ جموں اور کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ

سمجھتے ہیں اور کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق یا خود مختاری کے خلاف ہیں (جب کہ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کشمیر میں بھارتی افواج کی طرف سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی مذمت بھی کی ہے)۔ ایک پاکستانی، ایک عالم اور ایک دیوبندی جماعت کے رکن کی حیثیت سے آپ اس موقف کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ کو قومی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ کسی بھی ملک کی کسی کمیونٹی کے لیے قومی مسائل میں قومی موقف سے انحراف مناسب نہیں ہوتا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے پاکستان میں رہنے والی ہندو اقلیت کشمیر سمیت تمام قومی مسائل میں قومی موقف کی تائید کرتی ہے اور کم وبیش ہر ملک میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں مسئلہ کشمیر کے حل کا بہترین، معقول ترین اور عملی حل کیا ہو سکتا ہے؟ اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات کیا کہتی ہیں؟

جواب: مسئلہ کشمیر کے حل کی دو ہی اصولی بنیادیں ہیں:

(۱) مسلّمہ بین الاقوامی معاہدات،

(۲) اور کشمیری عوام کی آزادانہ مرضی۔

اس سے ہٹ کر کوئی حل شاید ہی کامیاب ہو سکے۔ اگر اقوام متحدہ ایسٹ تیمور اور جنوبی سوڈان میں استصواب رائے کرا سکتی ہے تو کشمیر میں استصوابِ رائے کروانے میں اسے ٹال مٹول سے کام نہیں لینا چاہیے اور میرے خیال میں یہی اسی مسئلے کا صحیح حل ہے۔

شدت پسند گروہوں کا طرز عمل اور اس کے نتائج

سوال: بھارت اور پاکستان دونوں میں انتہاپسند عناصر موجود ہیں (پاکستان میں اسلامی اور بھارت میں ہندو) جو دونوں ممالک کے مابین پُرامن اور بہتر تعلقات کے شدت سے مخالف ہیں۔ اس مشکل پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے؟ اسلامی زاویہ نگاہ سے آپ اس صورتحال کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: میرے خیال میں یہ بات شاید قرین قیاس نہیں ہے کہ پاکستان میں جن طبقات کو

انتہا پسند اور شدت پسند سمجھا جاتا ہے، وہ بھارت کے ساتھ دشمنی کا اظہار اس لیے کرتے ہیں کہ وہ کافر اکثریت کا ملک ہے۔ اگر ایسا ہو تو ان کے جذبات چین کے بارے میں اسی طرح کے ہونے چاہئیں۔ اس لیے پاکستان کے انتہا پسند طبقوں کی شدت پسندی کے اسباب کچھ اور تلاش کرنے چاہئیں۔ غالباً مسئلہ کشمیر کے حل میں مسلسل تاخیر اور مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش کی صورت میں پاکستان سے علیحدگی میں بھارت کا کردار ان شدت پسندانہ جذبات کی اصل وجہ ہے اور اس مبینہ شدت پسندی کو کم کرنے کی کوئی بھی کوشش اس کے پسِ منظر کا لحاظ رکھے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

> سوال: پاکستان کے انتہا پسند گروپ مثلاً لشکرِ طیبہ کا اصرار ہے کہ بھارت کے ساتھ پُرامن تعلقات ممکن نہیں اور یہ کہ مسلمانوں کو ہر حال میں بھارت کے خلاف جہاد کرنا ہوگا تا آنکہ وہ ایک عظیم تر پاکستان میں ضم ہو جائے۔ اس موقف کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں؟ کیا اسلام میں اس کی اجازت ہے؟

جواب: یہ جذبات دونوں طرف یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ بھارت کے انتہا پسند ہندوؤں کا نعرہ اکھنڈ بھارت کا ہے اور پاکستان کے انتہا پسند مسلمان دہلی کے لال قلعے پر پاکستان کا پرچم لہرانے کا دعوٰی کرتے ہیں۔ یہ دونوں جذباتی باتیں ہیں۔ جب تک باہمی تنازعات کے حل کی کوئی صورت نہیں نکلتی یہ نعرے اسی طرح لگتے رہیں گے۔ اس کا راستہ تلاش کرنا دونوں طرف کے سنجیدہ راہنماؤں کی ذمہ داری ہے۔

> سوال: پاکستان کے انتہا پسند اسلامی گروپ مثلاً لشکرِ طیبہ کتبِ حدیث میں موجود ایک روایت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں غزوۃ الہند کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ اس غزوے میں شریک ہوں گے، وہ دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ آپ کی رائے میں اس حدیث کا کیا درجہ ہے؟ کیا یہ صحیح اور متواتر ہے؟ کیا آپ کے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ لشکرِ طیبہ جیسے گروہ اس سے مراد موجودہ حالات میں انڈیا کے خلاف جہاد کرنا لیتے ہیں اور کیا اس حدیث کی یہ تعبیر درست ہے؟

جواب: غزوہ ہند کی روایات موجود ہیں۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی پیش گوئیاں عالمی صورتحال میں پوری ہو چکی ہیں اور باقی بھی اپنے وقت پر پوری ہوں گی۔ لیکن ان کا

وقت متعین نہیں ہے اور ان کی کسی بھی موقع پر تطبیق کرنا ایسا کرنے والوں کے اپنے ذوق، استنباط اور استدلال کے درجہ کی باتیں ہیں۔ ماضی میں بھی اس خطے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی بہت سی جنگوں پر ان کا اطلاق کیا گیا ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہوتا رہے گا۔ لیکن کیا قوموں اور ملکوں کی پالیسیوں اور تعلقات کی بنیاد ان پیش گوئیوں پر رکھی جا سکتی ہے؟ یہ بات محل نظر ہے۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ ان پیش گوئیوں میں کوئی وقت طے نہیں کیا گیا اس لیے قوموں اور ملکوں کی پالیسیوں میں ان کو بنیاد بنانا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ پیش گوئیاں پوری ہونا الگ بات ہے اور کسی پیش گوئی کو از خود پورا کرنے کا عمل اس سے مختلف امر ہے۔ آج کے دور میں کسی مسلمان ملک کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات کی بنیاد معروضی حالات، دوطرفہ مفادات اور مسلّمہ بین الاقوامی عرف وتعامل ہی ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے۔

سوال: پاکستان کے انتہاپسند اسلامی گروہ بھارت اور ہندوؤں کی شدید مخالفت پر مبنی آئیڈیالوجی کا پرچار کرتے اور اسلام کی تعبیر بھی اس کے مطابق کرتے ہیں۔ (اسی طرح ہندو انتہا پسند گروپ بھی بھارت میں پاکستان اور اسلام کی شدید مخالفت پر مبنی آئیڈیالوجی کا پرچار کرتے ہیں۔) آپ کی رائے میں اس انتہاپسندانہ اسلامی موقف کے منفی اثرات ہندوؤں کو دعوتِ اسلام دینے کی ذمہ داری پر کیا پڑتے ہیں جن میں بھارت کے ہندو بھی شامل ہیں اور پاکستان کی ہندو اقلیت بھی؟

جواب: میرے خیال میں دونوں طرف صورتحال ایک جیسی ہے۔ مسلمانوں کے ایک بڑے حصے میں بھارت اور ہندوؤں کے خلاف شدید مخالفت پائی جاتی ہے اور ہندوؤں کے ایک بڑے حلقے میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف اسی درجہ کی شدید مخالفت کا رویہ بھی موجود و متحرک ہے۔ اسی طرح دعوت کے میدان میں ہندوؤں کو مسلمان کرنے کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے اور ہندوستان کے بہت سے مسلمانوں کو ہندو مذہب سے منحرف قرار دے کر واپس ہندو مذہب میں شامل کرنے کی تحریک بھی کام کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں دونوں طرف کے اعتدال پسند راہنماؤں کو کردار ادا کرنا چاہیے جس کا دائرہ باہمی گفتگو اور مشترکہ جذبہ کے ساتھ ہی طے کیا جا سکتا ہے۔ منافرت،

دشمنی اور ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کا ماحول دونوں طرف سے دعوت کے عمل میں رکاوٹ ہے۔ اس کا دونوں طرف کے سنجیدہ راہنماؤں کو جائزہ لینا چاہیے۔

سوال: بھارت اور ہندو مخالف جذبات کے، جنہیں دوسرے عوامل کے علاوہ نام نہاد اسلامی عناصر بھی بھڑکاتے ہیں، پاکستان کی ترقی پر مثبت یا منفی اثرات کیا مرتب ہوئے ہیں؟ کیا اس کو فرقہ وارانہ، طبقاتی اور علاقائی تقسیم کے تناظر میں پاکستانی قوم میں اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ بنانے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے، جیسا کہ اس رویے کے حامیوں نے کوشش کی ہے؟ کیا یہ پاکستانی قوم یا مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنے کا ایک فی الواقع اسلامی منہج ہے؟

جواب: میرے خیال میں پاکستان اور بھارت کے درمیان قومی سطح پر دشمنی کے جذبات کا ماحول برقرار رکھنا عالمی استعمار کی طے شدہ پالیسی اور ایجنڈے کا حصہ ہے جو دونوں ملکوں کی ترقی میں رکاوٹ ہے اور شاید عالمی ایجنڈے کا بنیادی ہدف بھی یہی ہے۔ سوال نمبر ا کے جواب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ماحول مصنوعی ہے۔ پاکستان میں قوم کی وحدت کی اصل بنیاد بھارت دشمنی نہیں، بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ محبت وعقیدت ہماری قومی وحدت کی اصل اساس ہے جس کا اظہار ابھی حال میں ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کے حوالے سے قوم کے کم وبیش تمام طبقات نے متحد ہو کر ایک بار پھر کر دیا ہے۔

سوال: پاکستان کے اسلامی گروپوں کی طرف سے بھارت اور ہندو مخالف جذبات کو ہوا دینے کی پالیسی کے مضمرات بھارت کی مشکلات کا شکار مسلم اقلیت کے حوالے سے کیا ہیں؟ کیا پاکستانی گروہوں نے اس بات پر کبھی غور کیا ہے کہ ان کے بھارت مخالف رویے کے یقینی طور پر منفی اثرات بھارتی مسلمانوں کی زندگیوں، تحفظ اور بھلائی پر پڑیں گے اور اس سے بھارت کے انتہا پسند ہندو گروپوں کو تقویت ملے گی؟

جواب: یہ بات درست ہے کہ پاکستان میں مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں اور بھارت کے خلاف شدت پسندانہ جذبات کے اظہار کے اثرات بھارت کی مسلمان اقلیت پر پڑتے ہیں، لیکن

یہ بات سوچنے کی ہے کہ بھارت میں اسلام اور پاکستان کے خلاف شدت پسندانہ جذبات کے اظہار کے اثرات پاکستان میں بسنے والی ہندو اقلیت پر کیوں نہیں پڑتے؟ اگر اس پہلو سے تقابل کیا جائے تو دونوں طرف کی صورتحال ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ میرے خیال میں بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کا بھارتی قومیت کے ساتھ مضبوط تعلق اور بھارت کے امن و ترقی کے لیے ان کا بھرپور کردار اس قدر مستحکم ہے کہ اس طرح کے اثرات سے ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ یہ بات اصولی طور پر درست ہے کہ کسی بھی معاملے میں شدت پسندانہ رویہ بہرحال ٹھیک نہیں ہوتا۔ اعتدال اور توازن کا راستہ ہی ہر دور میں بہتر اور مفید رہا ہے اور دونوں طرف سے اس کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔

میری علمی و مطالعاتی زندگی

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۲۰۱۱ء)

(مدیر ماہنامہ ''نوائے کسان'' لاہور جناب عرفان احمد کا سوالنامہ)

حالاتِ زندگی

سوال: کچھ ذاتی حالات زندگی کے بارے میں آگاہ فرمائیں۔

جواب: ہمارا تعلق ضلع مانسہرہ، ہزارہ میں آباد سواتی خاندان سے ہے جس کے آبا واجداد کسی زمانے میں سوات سے نقل مکانی کر کے ہزارہ میں آباد ہو گئے تھے۔ ہمارے دادا نور احمد خان مرحوم شنکیاری سے آگے کڑمنگ بالا کے قریب چیڑاں ڈھکی میں رہتے تھے اور زمینداری کرتے تھے۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتیؒ کی نوعمری میں ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ یہ دونوں حضرات دینی تعلیم کی طرف آ گئے۔ حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے مدرسہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر پنجاب کے مختلف مدارس، بالخصوص مدرسہ انوار العلوم، مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں درس نظامی کا بڑا حصہ پڑھا۔ ۱۹۴۱ء۔۱۹۴۲ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ وہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے شیخ الحدیث رہے ہیں اور کم و بیش ساٹھ سال تک تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں۔ دیوبندی مسلک کے علمی ترجمان سمجھے جاتے تھے اور کم و بیش پچاس کے لگ بھگ کتابوں کے مصنف تھے۔

میری ولادت ۱۹۴۸ء میں ۲۸ اکتوبر کو ہوئی۔ میری والدہ محترمہ کا تعلق راجپوت خاندان سے تھا اور ہمارے نانا مرحوم مولوی محمد اکبر صاحب گوجرانوالہ میں ریلوے اسٹیشن کے قریب تالاب دیوی والا، رام بستی کی ایک مسجد کے امام تھے۔ ان کا تعلق راجپوت جنجوعہ برادری سے بتایا جاتا ہے۔ میں

نے قرآن مجید گکھڑ کے مدرسہ تجوید القرآن میں مختلف اساتذہ سے حفظ کیا جس میں سب سے آخری اور بڑے استاد قاری محمد انور صاحب ہیں جو کہ آج کل مدینہ منورہ میں تحفیظ القرآن کے استاد ہیں۔ ۱۲۰ کتوبر ۱۹۶۰ء کو میرا حفظ مکمل ہونے پر گکھڑ کی جامع مسجد میں جو تقریب ہوئی، اس میں حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، حضرت مولانا قاری فضل کریمؒ اور حضرت مولانا قاری محمد حسن شاہؒ نے شرکت فرمائی تھی اور میں نے آخری سبق ان بزرگوں کو سنایا تھا۔ درسِ نظامی کے بڑے حصہ کی تعلیم میں نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں حاصل کی اور میرے اساتذہ میں حضرت والد محترم اور حضرت عم مکرم کے علاوہ حضرت مولانا عبد القیوم ہزاروی مدظلہ، حضرت مولانا قاضی محمد اسلم، حضرت مولانا قاضی عزیز اللہ اور حضرت مولانا جمال احمد بنوی مظاہری بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم سے میں نے فراغت حاصل کی۔

دورانِ زمانۂ طالب علمی مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کی معاونت کے لیے بطور نائب خطیب میرا تقرر ہو چکا تھا، جبکہ اس سے قبل کم وبیش دو سال تک گتہ مل راہوالی کی کالونی کی مسجد میں خطابت کے فرائض سرانجام دیتا رہا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں مولانا مفتی عبد الواحدؒ کی وفات کے بعد مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے مستقل خطیب کی حیثیت سے میں نے ذمہ داری سنبھال لی تھی جو کہ بحمد اللہ تعالیٰ اب تک حسب استطاعت نباہ رہا ہوں۔ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے مدرسہ انوار العلوم میں ہی ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک درسِ نظامی کی تدریس کے فرائض سرانجام دیتا رہا ہوں، جبکہ گزشتہ دس گیارہ سال سے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں تدریسی خدمات میرے سپرد ہیں اور والد محترم کے بعد صدارت تدریس اور نظامت تعلیمات کی ذمہ داری بھی میرے ناتواں کندھوں پر ہے۔

صحافتی زندگی میں طالب علمی کے دوران ۱۹۶۵ء میں روزنامہ وفاق لاہور کے نامہ نگار کی حیثیت سے داخل ہوا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں گکھڑ پر بھارتی فضائیہ کی بمباری کے حوالہ سے پہلا فیچر لکھا اور شہری دفاع کے رضا کار کے طور پر خدمات بھی سرانجام دیں۔ اس کے بعد جمعیت علماء اسلام کے آرگن ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کے ساتھ تعلق رہا اور متعدد بار کئی برس تک ایڈیٹر کے طور پر فرائض سرانجام دیے۔ روزنامہ پاکستان اسلام آباد اور روزنامہ اوصاف

اسلام آباد میں کئی سال مستقل کالم نگار کے طور پر وابستہ رہا اور ''نوائے قلم'' کے نام سے ہفتہ وار کالم لکھتا رہا۔ اب یہ کالم روزنامہ پاکستان لاہور میں لکھ رہا ہوں جبکہ روزنامہ اسلام میں بھی ''نوائے حق'' کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھتا ہوں۔ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے ترجمان ماہنامہ نصرۃ العلوم کا اداریہ بھی کئی برسوں سے تحریر کر رہا ہوں، اور میری ادارت میں ماہنامہ الشریعہ بھی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

بیرون ملک ختم نبوت کانفرنسوں اور ورلڈ اسلامک فورم کی سرگرمیوں کے علاوہ دیگر تعلیمی، دعوتی اور مطالعاتی مقاصد کے لیے کئی ممالک میں جانا ہوا جن میں سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مصر، جنوبی افریقہ، بھارت، بنگلہ دیش، ایران، افغانستان، ازبکستان، ترکی، ہانگ کانگ، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور کینیا شامل ہیں۔ مدرسہ نصرۃ العلوم کی سالانہ تعطیلات کے دوران شعبان المعظم اور اس کے ساتھ رمضان المبارک کا کچھ حصہ برطانیہ اور امریکہ میں تعلیمی سرگرمیوں میں مصروفیت رہتی ہے اور متعدد دینی اداروں سے مشاورت اور معاونت کا تعلق ہے۔

سیاسی وتحریکی ذوق طالب علمی کے دور سے چلا آ رہا ہے۔ جمعیت طلباء اسلام پاکستان کو منظّم کرنے میں حصہ لیا۔ گکھڑ میں انجمن نوجوانانِ اسلام کے نام سے نوجوانوں کی تنظیم بنائی اور جمعیت علماء اسلام میں بتدریج شہر، ضلع، صوبہ اور مرکز کی سطح پر سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے فرائض سرانجام دینے کا موقع ملا۔ مرکزی سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے میرا انتخاب حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی تجویز پر ۱۹۷۵ء میں ہوا اور پھر ان کی وفات تک ان کی معاون ٹیم کے ایک متحرک رکن کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۷۴ء اور ۱۹۸۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں عملی حصہ لینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۹۸۴ء کی تحریکِ ختمِ نبوت میں مرکزی مجلسِ عمل کے سیکرٹری اطلاعات کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد قائم ہوا تو اس کی دستورساز اور منشورساز کمیٹیوں اور پارلیمانی بورڈ میں جمعیت کی نمائندگی کی۔ پنجاب کا قومی اتحاد کا نائب صدر اور پھر سیکرٹری جنرل رہا۔ ۱۹۸۸ء میں اسلامی جمہوری اتحاد قائم ہوا تو اس میں بھی دستورساز اور منشورساز کمیٹیوں میں جمعیت علماء اسلام (درخواستی گروپ) کی نمائندگی کی اور صوبائی نائب صدر رہا۔ ۱۹۹۰ء میں جمعیت علماء اسلام پاکستان کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات کے منصب سے مستعفی ہو کر عملی سیاست سے

کنارہ کش ہوگیا۔

تحریکِ ختمِ نبوت، تحریکِ نظامِ مصطفٰی، گوجرانوالہ میں مسجد نور کو محکمہ اوقاف سے واگزار کرانے کی تحریک، اور دیگر متعدد تحریکات میں حصہ لینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ بھٹو دور میں کئی بار جیل یاترا کی۔ مسجد نور کی تحریک میں کم و بیش چار ماہ اور تحریکِ نظامِ مصطفٰی میں ایک ماہ جیل کاٹی۔ اس کے علاوہ بھی متعدد بار تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے جیل جانے کا موقع ملا۔

سیاسی طور پر جمعیت علماء اسلام پاکستان سے وابستہ رہا۔ کم و بیش پچیس برس تک صوبائی اور مرکزی سطح پر مختلف عہدوں پر متحرک کردار ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے رفیق کار اور اسسٹنٹ کے طور پر سالہا سال خدمات سرانجام دینے کا موقع ملا۔ اب ایک عام کارکن کے طور پر جمعیت علماء اسلام کے ساتھ شریک ہوں جبکہ انتخابی سیاسی سے ہٹ کر فکری اور علمی حوالہ سے اسلامائزیشن کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل کے طور پر کام کر رہا ہوں جس کے امیر مولانا فداء الرحمٰن درخواستی آف کراچی ہیں۔

گزشتہ عشرہ کے اوائل میں لندن میں مولانا محمد عیسٰی منصوری اور مفتی برکت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر عالمی سطح پر ایک فکری اور علمی فورم ''ورلڈ اسلامک فورم'' کے نام سے قائم کیا جو کہ علمی اور فکری میدان میں عصرِ حاضر کے تقاضوں کا احساس اجاگر کرنے میں مصروف ہے اور اس کی سرگرمیوں کا دائرہ برطانیہ، بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے دیگر شرکاء و معاونین میں ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ، ڈاکٹر سلمان ندوی الحسینی اور مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ شامل رہے ہیں۔

۱۹۸۹ء میں الشریعہ اکادمی قائم کی جس کا مقصد دعوتِ اسلام اور دینی تعلیم کے حوالے سے عصری تقاضوں کو اجاگر کرنا اور ان کی طرف دینی حلقوں کو توجہ دلانا تھا۔ یہاں ہم دینی تعلیم کے ساتھ عصری تقاضوں کے امتزاج کا تجربہ کر رہے ہیں اور اس ضمن میں مختلف کورسز ہر سال ہوتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء سے ماہنامہ الشریعہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جو اسلام اور ملتِ اسلامیہ کو درپیش معروضی مسائل کے حوالے سے اپنی بساط کے مطابق خدمت کر رہا ہے اور علمی حلقوں میں بحمد اللہ تعالٰی اسے توجہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ الشریعہ اکادمی کی باقاعدہ بلڈنگ ہاشمی

کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ میں تعمیر کی گئی ہے جس میں مسجد اور لائبریری بھی شامل ہے اور اس میں سال بھر فکری اور تعلیمی سرگرمیاں جاری رہتی ہے۔ دینی مدارس اور اسکول و کالج کے طلبہ کے لیے سال میں انگریزی بول چال، عربی بول چال، کمپیوٹر ٹریننگ وغیرہ کے مختصر دورانیے کے مختلف کورسز ہوتے ہیں اور علمی وفکری عنوانات پر محاضرات، سیمینارز اور ورکشاپس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ذوقِ مطالعہ، خاندانی تربیت اور ابتدائی سرگرمیاں

سوال: آپ کے اندر ذوقِ مطالعہ کب نمایاں طور پر پیدا ہوا؟ آغاز کیسے ہوا؟ اس کی نشوونما کس طرح ہوئی؟ خاندانی نظامِ تربیت کا اثر کہاں تک ہوا؟

جواب: کتاب کے ساتھ میرا تعارف بحمد اللہ تعالیٰ بہت پرانا ہے اور اس دور سے ہے جبکہ میں کتاب کے مفہوم اور مقصد تک سے آشنا نہیں تھا۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا گھر میں زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا اور ان کے اردگرد الماریوں میں کتابیں ہی کتابیں ہوتی تھیں۔ اس لیے کتاب کے چہرہ سے شناسائی تو تب سے ہے جب میں نے اردگرد کی چیزوں کو دیکھنا اور ان میں الگ الگ فرق کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد کتاب سے دوسرے مرحلے کا تعارف اس وقت ہوا جب میں نے دو چار حرف پڑھ لیے اور کم از کم کتاب کا نام پڑھ سکتا تھا۔ والد صاحب ایک چارپائی پر بیٹھ کر لکھا کرتے تھے اور حوالہ کے لیے کوئی کتاب دیکھنے کی ضرورت ہوتی تو خود اٹھ کر متعلقہ الماری سے وہ کتاب لے لیا کرتے تھے، مگر جب میں اور میری بڑی ہمشیرہ الفاظ کی شناخت کے قابل ہو گئے تو پھر اس کام میں ہماری شرکت بھی ہو گئی، اس حد تک کہ ہم میں سے کوئی موجود ہوتا تو والد صاحب کو کتاب کے لیے خود الماری تک نہیں جانا پڑتا تھا بلکہ وہ ہمیں آواز دیتے کہ فلاں کتاب کی فلاں جلد نکال لاؤ، اور ہم میں سے کوئی یہ خدمت سرانجام دے دیتا۔ ابتدا میں والد صاحب کو ہمیں یہ بتانا پڑتا تھا کہ فلاں الماری کے فلاں خانے میں اس نام کی کتاب ہے، اس کی اتنے نمبر کی جلد نکال لاؤ۔ بعد میں کتابوں سے ہمارا تعارف گہرا ہو گیا تو وہ صرف کتاب اور جلد نمبر کا کہتے اور ہم کتاب نکال لاتے اور اس کے لیے بسا اوقات ہم دونوں بہن بھائیوں میں مقابلہ بھی ہوتا کہ کون پہلے کتاب نکال کر لاتا ہے۔ اس وقت کی جن کتابوں کے نام ابھی تک ذہن

کے نقشے میں محفوظ ہیں، ان میں السنن الکبریٰ، لسان المیزان، تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب، تاریخ بغداد اور نیل الاوطار بطور خاص قابل ذکر ہیں جو علمِ حدیث اور اسماءِ رجال کی کتابیں ہیں اور یہ حضرت والد صاحب کے خصوصی ذوق کے علوم ہیں۔ ان کتابوں کے نام، ٹائٹل اور جلدیں بچپن میں ہی ذہن پر نقش ہو گئی تھیں اور یہ نقش ابھی تک اس طرح تازہ ہیں جیسے آج ہی ان کتابوں کو دیکھا ہو۔

پھر ایک قدم اور آگے بڑھا اور کتابوں کو خود پڑھنے کی منزل آ گئی۔ اس کے لیے میں گکھڑ کے ایک مرحوم بزرگ ماسٹر بشیر احمد صاحب کشمیری کا ممنون احسان ہوں کہ ان کی بدولت کتاب کے مطالعہ کی حدود میں قدم رکھا۔ ماسٹر بشیر احمد کشمیریؒ پرائمری سکول کے ٹیچر تھے اور حضرت والد محترم کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ ان کے خاندان سے ہمارا گہرا خاندانی تعلق تھا۔ انہیں ہم چاچا جی کہا کرتے تھے اور وہ بھی ہم سے بھتیجوں جیسا تعلق رکھتے تھے۔ ان کی والدہ محترمہ کو ہم بے جی کہتے تھے اور ان کی ہمشیرگان ہماری پھوپھیاں کہلاتی تھیں۔ انہی میں سے ایک پھوپھی اب میرے چھوٹے بھائی مولانا عبد القدوس قارن کی خوشدامن ہیں۔ والد محترم کو جب کسی جلسہ یا دوسرے کام کی وجہ سے رات گھر سے باہر رہنا پڑتا تو بے جی اس روز ہمارے ہاں رات گزارتی تھیں اور ہمیں چھوٹی چھوٹی کہانیاں سنایا کرتی تھیں جس کی وجہ سے ہم بہت خوش ہوتے تھے اور ہمیں ایسی رات کا انتظار رہتا تھا۔

ماسٹر بشیر احمد صاحب امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے شیدائی اور احرار کے سرگرم کارکن تھے۔ وہ حضرت شاہ جیؒ کی گکھڑ تشریف آوری اور جلسہ سے خطاب کا واقعہ اکثر سنایا کرتے تھے اور میرے بارے میں بتایا کرتے تھے کہ میں بالکل گود کا بچہ تھا اور مجھے حضرت شاہ جیؒ نے گود میں اٹھایا تھا۔ اس لیے مجھ سے اگر کوئی دوست پوچھتا ہے کہ کیا تم نے امیر شریعتؒ کی زیارت کی ہے تو میں کہا کرتا ہوں کہ مجھے تو یاد نہیں ہے، البتہ شاہ جیؒ نے مجھے دیکھا ہے۔ ماسٹر صاحب کے ہاں ہفت روزہ خدام الدین، ترجمان اسلام، ماہنامہ تبصرہ ہفت روزہ پیام اسلام ہفت روزہ چٹان اور دیگر دینی جرائد آیا کرتے تھے۔ میں ان جرائد سے انہی کے ہاں متعارف ہوا اور وہیں سے رسالے پڑھنے کی عادت شروع ہوئی۔ حضرت والد صاحب کے پاس دہلی سے ماہنامہ برہان، ملتان سے ماہنامہ

الصدیق، چوکیرہ (سرگودھا) سے ماہنامہ الفاروق اور فیصل آباد (تب لائل پور) سے ہفت روزہ پاکستانی آیا کرتے تھے جو میری نظر سے گزرا کرتے تھے۔ جامع مسجد بوہڑ والی گکھڑ کے حجرہ کی الماری میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی جس کے انچارج ماسٹر صاحب مرحوم تھے۔ اس میں زیادہ تر احرار راہنماؤں کی کتابیں تھیں۔ وہیں سے میں نے وہ کتابیں لیں جو میری زندگی میں مطالعہ کی سب سے پہلی کتابیں ہیں۔ چودھری افضل حق مرحوم کی کتاب ’’زندگی‘‘ اور ’’تاریخ احرار‘‘، مولانا مظہر علی اظہر کی ’’دنیا کی بساط سیاست‘‘ اور آغا شورش کاشمیری کی ’’خطباتِ احرار‘‘ پہلی کتابیں ہیں جن کا میں نے باقاعدہ مطالعہ کیا۔ کچھ سمجھ میں آئیں اور اکثر حصے ذہن کے اوپر سے ہی گزر گئے لیکن بہرحال میں نے اپنی مطالعاتی بلکہ فکری زندگی کا آغاز ان کتابوں سے کیا۔

ہماری والدہ مرحومہ گوجرانوالہ سے تھیں، شیرانوالہ باغ کے سامنے ریلوے پھاٹک سے دوسری طرف واقع پولیس تھانے کے عقب میں رام بستی نامی محلّہ کی مسجد میں ہمارے نانا مرحوم مولوی محمد اکبر صاحب امام مسجد تھے جو راجپوت جنجوعہ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑے باذوق بزرگ تھے، قرآن کریم معروف لہجے میں اور اچھے انداز میں پڑھا کرتے تھے جو اس زمانہ میں بہت کمیاب تھے۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن میں نے بہت سے معیاری علمی جرائد ان کے ہاں سے ڈاک میں باقاعدہ آتے دیکھے جن میں الفرقان، النجم، برہان، خدام الدین اور دروسِ قرآن جیسے رسالے بھی شامل تھے۔ وہ ان کا مطالعہ کرتے اور اہتمام سے ان کی جلدیں بنواتے تھے۔

اس کے بعد جب ۱۹۶۳ء میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں داخل ہوا اور مدرسہ کے دارالاقامہ میں ایک آزاد طالب علم کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کیا تو میں نے اس آزادی کا خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ گھومنا، پھرنا، جلسے سننا، لائبریری تلاش کرنا، رسالے ڈھونڈنا، کتابیں مہیا کرنا اور ان کا مطالعہ کرنا میرے روزمرہ معمولات میں شامل ہوگیا تھا۔ درسی کتابوں کے ساتھ میرا تعلق اتنا ہی تھا کہ سبق میں حاضر ہوتا تھا اور واجبی سے مطالعہ وتکرار کے ساتھ سبق کو کسی حد تک قابو میں رکھنے کی کوشش بھی بسا اوقات کر لیتا تھا، لیکن اس کے علاوہ میری مصروفیات کا دائرہ پھیل چکا تھا اور اس میں شب و روز کی کوئی قید باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس دور میں مدرسہ نصرۃ العلوم کے کتب خانے کے علاوہ عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کی ذاتی لائبریری میری دسترس میں تھی،

اور چوک نیائیں میں اہلحدیث دوستوں کا ''اسلامی دارالمطالعہ'' میری جولان گاہ میں شامل تھا جہاں میں اکثر عصر کے بعد جاتا، دینی جرائد اور رسالوں پر نظر ڈالتا اور مطالعہ کے لیے کوئی نہ کوئی کتاب وہاں سے لے آتا۔ طالب علمی کے دور میں سب سے زیادہ استفادہ میں نے ان تین لائبریریوں سے کیا ہے۔

کتاب کے ساتھ تعارف کا اس سے اگلا مرحلہ میرے طالب علمی کے آخری دور میں شروع ہوا۔ یہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد کے دور کی بات ہے۔ گوجرانوالہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے جہاں آج کل سفینہ مارکیٹ ہے، ان دنوں یہاں خیام ہوٹل ہوا کرتا تھا جہاں ہر اتوار کی شام کو ''مجلسِ فکر ونظر'' کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست جمتی تھی۔ ارشد میر ایڈووکیٹ مرحوم اس مجلس کے سیکرٹری تھے۔ ان سے اسی محفل میں تعارف ہوا جو بڑھتے بڑھتے بے تکلفانہ اور برادرانہ دوستی تک جا پہنچا۔ اس ادبی محفل میں کوئی نہ کوئی مقالہ ہوتا اور ایک آدھ نظم یا غزل ہوتی جس پر تنقید کا میدان گرم ہوتا اور ارباب شعر وادب اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے۔ پروفیسر اسرار احمد سہاروی، سید سبط الحسن ضیغم، ایزد مسعود ایڈووکیٹ، پروفیسر عبد اللہ جمال، پروفیسر افتخار ملک مرحوم، پروفیسر محمد صادق، پروفیسر رفیق چودھری، اثر لدھیانوی مرحوم اور ارشد میر ایڈووکیٹ مرحوم اس مجلس کے سرکردہ ارکان تھے۔ میں بھی ہفتہ وار ادبی نشست میں جاتا تھا اور ایک خاموش سامع کی حیثیت سے شریک ہوتا تھا۔ ایک روز اگلی محفل کا پروگرام طے ہو رہا تھا لیکن کوئی صاحب مقالہ کے لیے تیار نہیں ہو رہے تھے۔ میں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو کہا کہ اگر اجازت ہو تو اگلی محفل میں مضمون میں پڑھ دوں؟ دوستوں نے میری طرف دیکھا تو میری ہیئت کذائی دیکھ کر تذبذب کا شکار ہو گئے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تھوڑی خاموشی کے بعد ارشد میر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کس موضوع پر مضمون پڑھیں گے؟ میں نے جواب دیا کہ ''فلپ کے ہٹی کی کتاب ''عرب اور اسلام'' پر ایک تنقیدی نظر''۔ ہٹی کی اس کتاب کا ترجمہ انہی دنوں آیا تھا اور میں نے تازہ تازہ پڑھ کر اس کی بہت سی باتوں کو نشان زد کر رکھا تھا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ میں اگلے اتوار تک کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات کو قلم بند کر لوں گا۔ مگر میرا یہ کہنا ایک دھماکہ ثابت ہوا، میری پہلی بات ہی بعض دوستوں کو ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ دوسری بات نے تو ان کے چہروں کی کیفیات کو یکلخت تبدیل کر دیا

اور مجھے بعض چہروں پر خندۂ استہزا کی جھلک صاف دکھائی دینے لگی، مگر میں اپنے موقف پر قائم رہا جس پر ارشد میر صاحب نے اگلی محفل میں میرے مضمون کا اعلان کر دیا۔

میں نے اپنے مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے میں ان واقعاتی غلطیوں کی نشاندہی کی جو ہٹی سے تاریخی طور پر چند واقعات کو بیان کرنے میں ہوگئی تھی اور ان کی تعداد دس سے زیادہ تھی۔ دوسرے حصے میں اس اصولی بحث پر کچھ گزارشات پیش کیں کہ ہٹی اور دیگر مستشرقین اسلام کو ایک تحریک (Movement) کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ اسلام تحریک نہیں بلکہ دین ہے، اور پھر اس کے ساتھ ہی تحریک اور دین کے فرق کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا۔ اس مضمون کا پہلا حصہ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور میں اس دور میں شائع ہوگیا تھا مگر دوسرے حصے کے بارے میں ترجمان اسلام کے مدیر محترم ڈاکٹر احمد حسین صاحب کمال مرحوم نے مجھے بتایا کہ وہ کہیں گم ہوگیا ہے۔ بدقسمتی سے میرے پاس اس کی کاپی نہیں تھی اور مزید بدقسمتی یہ کہ اس کے بعد اس حصے کو لکھنے کی کئی بار کوشش کر چکا ہوں، مگر ابھی تک اس معیار پر نہیں لکھ پا رہا۔ کسی کتاب کے پوسٹ مارٹم اور آپریشن کے حوالے سے یہ میرا پہلا مضمون تھا جو میں نے ''مجلس فکر ونظر'' کی ہفتہ وار ادبی نشست میں پڑھا جسے بے حد پسند کیا گیا اور اس کے بعد مجلس میں میری شمولیت نے خاموش سامع کے بجائے متحرک رکن کی شکل اختیار کر لی۔ بلکہ ایک موقع پر ''اسلام میں اجتہاد کا تصور'' کے عنوان پر مجھ سے مضمون پڑھنے کی فرمائش کی گئی جس پر میں نے بڑی محنت سے ایک مقالہ مرتب کر کے پڑھا۔ یہ نشست پروفیسر اسرار احمد سہارویؒ کی صدارت میں تھی اور شیخ ایاز مسعود نے میرے مقالہ پر اپنی تنقید میں اس کی بعض خامیوں کی نشاندہی کی۔ بعد میں اسی مجلس کے ایک محترم دوست نے وہ مقالہ مجھ سے مطالعہ کے لیے لیا مگر ان کی وفات ہوگئی اور وہ مضمون پھر دستیاب نہ ہوسکا۔

راہنما شخصیات اور مطالعہ کے ادوار

سوال: کون سی شخصیتیں تھیں جنھوں نے آپ کے ذوق مطالعہ کو مہمیز کیا اور اس سفر میں آپ کی رہنمائی کی؟ آپ کے مطالعہ کے مختلف ادوار کیا رہے؟ پسندیدہ موضوعات، ذوق میں ارتقائی تبدیلیاں؟

جواب: حضرت والد محترم کے علاوہ چچا محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی اور ماسٹر بشیر احمد صاحب کشمیریؒ بنیادی شخصیات ہیں جنہوں نے مجھے مطالعہ کی طرف راغب کیا، مختلف موضوعات پر کتابیں مہیا کرتے رہے اور میرے مطالعہ کی حوصلہ افزائی اور نگرانی کرتے رہے۔ لکھنے پڑھنے کی عادت طالب علمی کے زمانہ میں ہی تھی۔ مضامین لکھنا، خبریں بنانا اور اخبارات میں پہنچانا اور پھر ان کی اشاعت پر خوش ہونا اسی دور سے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ اس میں گوجرانوالہ کے معروف صحافی صاحبزادہ سید جمیل الحسن مظلوم مرحوم اور راشد بزمی مرحوم کی حوصلہ افزائی کا بہت دخل رہا ہے۔ اس زمانہ میں پاکستان کے قومی اخبارات میں نسیم حجازی مرحوم کا روزنامہ کوہستان خاصی اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ ایک بار میرا ایک مضمون روزنامہ کوہستان میں ادارتی صفحہ پر شائع ہوا جس نے میرا دماغ ''خراب'' کر دیا اور میں نے دماغ کی اس خرابی میں ایک تعلیمی سال ضائع کر دیا۔ یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ میرے مضامین ہفت روزہ ترجمان اسلام میں شائع ہوتے تھے اور میں روزنامہ وفاق لاہور کا باقاعدہ نامہ نگار بن گیا تھا۔ ''کوہستان'' کے ادارتی صفحے پر مضمون کی اشاعت نے میرے ذہن میں یہ بات پیدا کر دی کہ میرا اصل میدان صحافت ہے، اس لیے تعلیم و تعلم میں میری توجہ کم ہوتی چلی گئی۔ حضرت والد صاحب نے یہ دیکھ کر مجھے مدرسہ سے اٹھا کر گکھڑ میں گھر لے آئے اور وہاں اپنی نگرانی میں تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی زمانے میں گکھڑ کے مدرسہ میں استاذ حضرت مولانا غلام علی صاحبؒ سے میں نے ''فصول اکبری'' اور ''گلستان'' کا کچھ حصہ پڑھا اور حضرت مولانا قاری عبدالحلیم سواتی مدظلہ سے قرآن کریم کے کچھ حصے کی مشق کی۔ حضرت والد صاحب کا انداز سختی کا ہوتا تھا اور سختی کے سارے حربے وہ اختیار کرتے تھے جس سے میں بے بسی کے عالم میں ایک روبوٹ کی طرح تعمیل حکم تو کر لیا کرتا تھا مگر سوچ سمجھ کے دروازے اکثر بند ہی رہتے تھے، اس لیے یہ سختی مجھ پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ ہو سکی۔

اس دوران ایک روز گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں آیا تو چچا محترم حضرت صوفی عبد الحمید سواتی صاحبؒ نے پاس بٹھا کر مجھے بڑی شفقت سے سمجھایا اور ان کی یہ بات میرے دل و دماغ میں نقش ہو گئی کہ بیٹا! صحافت اور خطابت لوگوں تک کوئی بات پہنچانے کا ذریعہ ہے، یہ ضرور آدمی کے پاس ہونا چاہیے، لیکن پہنچانے کے لیے کوئی چیز بھی پاس موجود ہونی چاہیے۔ اگر اپنے

پاس کچھ ہوگا تو دوسروں تک پہنچاؤ گے اور اگر اپنا سینہ علم سے خالی ہوگا تو دوسروں کو کیا دو گے؟ ٹونٹی کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، وہی چیز باہر نکالے گی جو ٹینکی میں ہوگی اور اگر ٹینکی میں کچھ نہیں ہوگا تو ''شاں شاں'' کرے گی۔ حضرت صوفی صاحبؒ کے اس محبت بھرے لہجے اور ''شاں شاں'' کی مثال نے ایک لمحے میں دل و دماغ کا کانٹا بدل دیا اور یہ جملے اب بھی میرے کانوں میں ''شاں شاں'' کرتے رہتے ہیں۔

میرے مطالعہ کا آغاز ''زندگی'' اور ''تاریخِ احرار'' سے ہوا۔ پھر تاریخی ناولوں کی طرف ذہن مڑ گیا اور نسیم حجازی مرحوم اور محمد اسلم مرحوم کا مطالعہ کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ ہفت روزہ خدام الدین، ہفت روزہ چٹان اور ہفت روزہ ترجمان اسلام میرے مستقل مطالعہ میں شامل ہو گئے۔ اخبارات بھی شوق سے پڑھتا تھا اور طالب علمی کے زمانے میں نوائے وقت، کوہستان اور امروز میرے روزمرہ مطالعہ کا حصہ ہوتے تھے۔ طالب علمی کے دور میں مطالعہ کے لیے مجھے جس نوعیت کی کوئی کتاب یا رسالہ میسر آ جاتا، سمجھ میں آتا یا نہ آتا، میں اس پر ایک نظر ڈالنے کی کوشش ضرور کرتا۔ البتہ ترجیحات میں بالترتیب مزاحیہ تحریریں، تاریخی ناول اور جاسوسی ادب سرفہرست رہے اور اب بھی اختیاری مطالعہ میں حتی الامکان ترجیحات کی یہ ترتیب قائم رہتی ہے۔ مگر یہ بات تفریحی مطالعہ کی ہے یعنی فارغ وقت گزارنے کے لیے ذہن کو دیگر مصروفیات سے فارغ کرنے کے لیے اور تھوڑی بہت ذہنی آسودگی حاصل کرنے کے لیے۔ ورنہ عملی وفکری ضرورت کے لیے میرے مطالعہ کی ترجیحات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو چکی ہیں اور اب حدیثِ نبوی اور اس سے متعلقہ علوم وفنون، تاریخ اور حقائق و واقعات کا پس منظر، اقوام وافکار کا تقابلی مطالعہ اسی ترتیب کے ساتھ میری دلچسپی کے موضوعات ہیں۔

شعروشاعری بھی میرے مطالعہ کا اہم موضوع رہی ہے اور کسی حد تک اب بھی ہے۔ ایک دور میں دیوانِ حافظ اور دیوان غالب میرے سرہانے کے نیچے مستقل پڑے رہتے تھے۔ دیوانِ حافظ کے بہت سے اشعار سمجھ میں نہیں آتے تھے اس لیے میں نے مترجم دیوان رکھا ہوا تھا اور اس کی مدد سے ضروری باتیں سمجھ لیا کرتا تھا۔ عربی ادب میں دیوانِ حماسہ مطالعہ اور تدریس دونوں کے لیے پسندیدہ کتاب ہے اور مصر کے قومی شاعر عبدالعزیز شوقی کی کوئی چیز مل جائے تو پڑھنے اور سمجھنے کی

کوشش کرتا ہوں۔ شعر گوئی میں کامیابی حاصل نہیں کر سکا، البتہ حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ، حضرت والد محترمؒ اور حضرت چچا محترمؒ کی وفات پر اپنے جذبات غم منظوم طور پر پیش کیے جو چھپ چکے ہیں اور دوستوں میں پسند کیے گئے ہیں۔

اردو ناول کی شاید ہی کوئی صنف میں نے چھوڑی ہو۔ جاسوسی، تاریخی اور رومانوی ہر قسم کے ناول میں نے پڑھے ہیں اور سیکڑوں ناول پڑھ ڈالے ہیں۔ نسیم حجازی سے لے کر ابن صفی تک کوئی ناول نگار میرے دائرے سے باہر نہیں رہا۔ جاسوسی ادب میں ابن صفی اور اکرم الہ آبادی میرے سب سے زیادہ پسندیدہ مصنف تھے اور جاسوسی کرداروں میں کرنل فریدی کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ ادبی جرائد میں چٹان، اردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ، حکایت اور قومی ڈائجسٹ اور علامت سالہا سال تک میرے مطالعہ کا حصہ رہے ہیں۔ معاشرتی، جاسوسی اور تاریخی افسانے بھی بہت پڑھے ہیں اور اب بھی میسر ہوں تو ضرور پڑھتا ہوں۔ کسی رسالہ کے مطالعہ کا آغاز عام طور پر لطائف کے صفحہ سے ہوتا ہے۔

طالب علمی کے دور میں تعلیم کچھ آگے بڑھی تو حدیثِ نبویؐ کے مطالعہ کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ تاریخ، سیرت اور حدیث نبوی کی کتابیں میرے مطالعہ میں اولین ترجیح تھیں اور اب بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ رومانوی ناول اور طنز و مزاح بھی مطالعہ میں میرے پسندیدہ موضوعات رہے۔ اخبارات کے مزاحیہ کالموں میں شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس اور احمد ندیم قاسمی کے کالم شوق سے پڑھتا تھا۔ ان موضوعات پر سیکڑوں کتابیں نظر سے گزری ہوں گی۔ اب جس مطالعہ کا تعلق درس و تدریس اور میری عملی زندگی سے ہے، وہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سے ہٹ کر تاریخی موضوعات، حدیثِ نبوی اور اس سے متعلقہ مباحث اور عالمی حالات کے سیاسی تجزیے اہتمام کے ساتھ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر اب وقت کم ملتا ہے اور جوں جوں ’’فرصتے و کتابے و گوشہ چمنے‘‘ کا ذوق بڑھتا جا رہا ہے اسی رفتار سے مصروفیات میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ خواہش بتدریج حسرت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔

میرے لکھنے پڑھنے کے ذوق کو دونوں بزرگوں یعنی والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کی عملی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ طالب علمی کے

زمانے میں حضرت والد صاحبؒ نے فاتحہ خلف الامام پر اپنی ضخیم کتاب ''احسن الکلام'' کی تلخیص مجھ سے اپنی نگرانی میں کرائی جو ''اطیب الکلام'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس پر دو تین صفحات کا پیش لفظ میں نے خود تحریر کیا جو کتابچہ میں موجود ہے اور مجھے یاد ہے کہ میرے لکھے ہوئے پیش لفظ میں حضرت والد صاحب نے صرف ایک جملہ کی اصلاح کی تھی۔ میں نے ایک جگہ ''بیک بندش چشم'' کی اصطلاح استعمال کی تھی جسے انہوں نے ''چشم زدن'' کے محاورہ سے بدل دیا۔ اس کا علاوہ انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی جس پر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میری خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے اپنی تصنیف ''فیوضات حسینی'' کی تسوید و ترتیب کے کام میں مجھے شریک کیا اور اس کا بیشتر حصہ حضرت صوفی صاحبؒ کی نگرانی میں ان کی ہدایات کے مطابق میں نے مرتب کیا، جس پر مجھے انہوں نے پارکر کا ایک خوبصورت قلم انعام میں دیا۔ دونوں بزرگوں کی یہ خواہش اور کوشش رہی کہ میں ان کے تصنیف و تحقیق کے کام میں معاون اور دست راست بنوں مگر کسی شخص کے لیے اپنے ''خون کا گروپ'' خود اختیار کرنے کی سہولت اللہ تعالیٰ نے نہیں رکھی اور میرے خون کے جراثیم قدرے مختلف تھے، اس لیے اس فطری تنوع نے میری تحریر و تقریر کا میدان کسی حد تک ان سے مختلف کر دیا۔ جمعیت طلباء اسلام اور جمعیت علماء اسلام کے پلیٹ فارم پر سیاسی سرگرمیوں میں متحرک ہو جانے کے بعد میرے فکر و نظر کا زاویہ قدرے مختلف ہو چکا تھا اور میرے لکھنے پڑھنے کے موضوعات میں اسلامی نظام کی اہمیت و ضرورت، مغربی فلسفہ و ثقافت کی یلغار، اسلام پر مغرب کی طرف سے کی جانب سے کیے جانے والے اعتراضات و شبہات، آج کے عالمی تناظر میں اسلامی احکام و قوانین کی تشریح، اسلامائزیشن کے علمی و فکری تقاضے، نفاذِ اسلام کے حوالے سے دینی حلقوں کی ضروریات اور ذمہ داریاں، اسلام دشمن لابیوں کی نشاندہی اور تعاقب، اور ان حوالوں سے طلبہ، دینی کارکنوں اور باشعور نوجوانوں کی راہنمائی اور تیاری کو اولین ترجیح کا درجہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ گزشتہ پینتالیس برس سے انہی موضوعات پر مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ بحمد اللہ تعالیٰ ہزاروں مضامین ان عنوانات پر شائع ہو چکے ہیں جن کا انتخاب الشریعہ اکادمی کی ویب سائٹ کے مقالات و مضامین کے سیکشن میں موجود ہے۔ کچھ اہم موضوعات پر چند کتابی مجموعے بھی الشریعہ اکادمی نے شائع کیے ہیں۔

مطالعہ کی زبانیں

سوال: آپ اُردو کے علاوہ اور کن زبانوں میں مطالعہ کرتے ہیں؟ انگریزی، عربی، فارسی، ہندی، پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، دیگر زبانیں؟

جواب: اردو میرے مطالعہ کا اصل دائرہ ہے۔ عربی میری تدریس کا حصہ ہے، اس لیے زیادہ تر مطالعہ انہی دو زبانوں میں ہوتا ہے۔ فارسی سے معمولی شدبد ہے۔ کتابی فارسی تھوڑی بہت سمجھ لیتا ہوں، اس لیے بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت اس کے مطالعہ کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ پنجابی میری مادری زبان ہے مگر پڑھنے کا موقع کم ہی ملتا ہے، اگر کوئی چیز مل جائے تو شوق پورا کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ اس کے سوا کوئی زبان نہیں جانتا اور ضروری امور میں تراجم کے ذریعے مقصد پورا کر لیتا ہوں۔

پسندیدہ مصنفین اور تصانیف

سوال: آپ کے پسندیدہ مصنفین؟ آپ کی پسندیدہ کتابیں؟ آپ کے پسندیدہ رسائل؟ پسندیدہ افسانہ نگار؟ کالم نگار؟ پسندیدہ مزاح نویس؟ طنز نگار؟

جواب: پسندیدہ مصنفین میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، چودھری افضل حقؒ، مولانا مودودیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ سرفہرست ہیں۔ حدیثِ نبوی، تاریخ اور سیاسی تجزیہ کی کوئی بھی قابل فہم کتاب میرے نزدیک قابل ترجیح ہوتی ہے۔ کالم نگاروں میں ارشاد احمد حقانی مرحوم، احسان بی اے مرحوم، جاوید چودھری، منو بھائی اور حامد میر کو زیادہ پڑھا ہے اور مزاح نگاروں میں شوکت تھانویؒ، احمد ندیم قاسمیؒ اور ابراہیم جلیس کو پڑھتا رہا ہوں اور اب یونس بٹ کو پڑھ لیتا ہوں۔

سوال: آپ اپنی دنیائے مطالعہ میں کس ایک مصنف کو بلند ترین مقام پر رکھتے ہیں جس کا آپ کی ذہنی نشوونما پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہو؟ (خصوصاً اردو لکھنے والوں میں سے؟)

جواب: علمی و تحقیقی دنیا میں متقدمین میں امام محمدؒ، امام بخاریؒ، ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ، جبکہ دورِ

حاضر میں والد محترم مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، عم مکرم مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ، مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور الاستاذ وہبہ زحیلی، اور فکری دنیا میں علامہ اقبالؒ، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور چودھری افضل حقؒ نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

سوال: کچھ ایسے مصنفین جن کو ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا ہو، ملاقات میں کامیاب ہوئے، ملنے کے بعد تاثرات؟

جواب: اقبالؒ اور چودھری افضل حقؒ تو میری ولادت سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے، البتہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور الاستاذ وہبہ زحیلیؒ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی زیارت پہلی بار ۱۹۸۴ء کے دوران مکہ مکرمہ میں کی جہاں وہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے ہمراہ غالباً رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے ساتھ بیٹھنے اور گفتگو کی سعادت حاصل کرنے کے علاوہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کو اپنے بازوؤں کے حصار میں بیت اللہ شریف کا طواف کرانے کا شرف بھی حاصل کیا۔ مولانا ندویؒ سے بعد میں میرا بیعت کا تعلق قائم ہوا اور انہوں نے تحریری طور پر اپنی تمام اسناد کے ساتھ روایتِ حدیثِ نبویؐ کی اجازت کے شرف سے بھی نوازا، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔ امریکی مصنف ''ڈیل کارینگی'' بھی میرے پسندیدہ مصنفین میں سے ہیں مگر ملاقات کا موقع نہیں مل سکا، شاید وہ بھی میری ہوش کی عمر سے پہلے ہی دنیا چھوڑ چکے ہوں۔ نسیم حجازی مرحوم سے ملاقات کر کے خوشی ہوئی۔ مولانا مودودیؒ سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے ساتھ برطانیہ میں گزرے ہوئے چند دن میری زندگی کے یادگار ایام میں سے ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کے ساتھ ملاقات بھی خوشی کا باعث بنی، جبکہ ڈاکٹر حمید اللہؒ کی زیارت وملاقات کی زندگی بھر حسرت رہی۔

مطالعہ کا دائرہ اور ذوق

سوال: کن کن اخبارات و رسائل کا روزانہ مطالعہ کرتے ہیں اور اس میں کتنا وقت صرف کرتے ہیں؟

جواب: کسی زمانے میں چار پانچ اخبارات کا روزانہ بالاستیعاب مطالعہ کیا کرتا تھا، اب وقت نہیں ملتا، اس لیے معمول یہ ہے کہ نوائے وقت، ایکسپریس، پاکستان اور اسلام پر ایک سرسری نظر

ڈال کر دلچسپی کی خبر اور کالم تفصیل سے پڑھ لیتا ہوں۔ ''الشریعۃ'' کے تبادلے میں درجنوں جرائد آتے ہیں، ان سب کو ایک نظر ضرور دیکھتا ہوں، فہرست پر نظر ڈال کر اگر کوئی مضمون دلچسپی یا ضرورت کا ہو تو وہ رسالہ مطالعہ کے لیے الگ کر لیتا ہوں اور اگر موقع مل جائے تو مطالعہ بھی کر لیتا ہوں، ورنہ اس طرح الگ کیے ہوئے رسالے اور کتابیں مہینوں پڑی رہتی ہیں۔

سوال: کیا دورانِ سفر میں بھی مطالعہ کرتے ہیں؟ اور کس طرح کی کتابوں کا انتخاب کرتے ہیں؟

جواب: دورانِ سفر پہلے مطالعہ کر لیا کرتا تھا اب نہیں ہوتا۔ مگر کوئی اخبار یا کتاب ضروری پڑھنی ہو تو اپنے اوپر تھوڑا جبر کر لیا کرتا ہوں۔ کسی سیمینار یا کانفرنس میں گفتگو کے لیے کوئی عنوان میں خود طے کروں یا میرے ذمہ لگ جائے تو خواہش یہ ہوتی ہے کہ باقاعدہ تیاری کروں، مگر اکثر اس کا موقع نہیں ملتا۔ وقتی طور پر انتہائی ضروری مطالعہ پر قناعت کرنا پڑتی ہے اور عام طور پر زبانی گفتگو کے بعد اسے قلمبند کرنے کی عادت سی بن گئی ہے۔

سوال: عام طور پر مطالعہ کے اوقات کیا ہوتے ہیں؟ پروگرام کس طرح چلتا ہے، نشست کس طرح کی پسند کرتے ہیں، رفتار مطالعہ کیا ہوتی ہے؟

جواب: اب کوئی وقت متعین نہیں ہے، مصروفیات میں جو وقت بھی نکل آئے اخبارات و جرائد پر نظر ڈال لیتا ہوں۔ تکیہ کے ساتھ فرشی نشست کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ عام طور پر سیدھا بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔ تھکاوٹ ہو تو نیم دراز ہو جاتا ہوں لیکن لیٹ کر پڑھنے کی عادت نہیں ہے۔

سوال: آپ کا حافظہ آپ کی وُسعتِ مطالعہ کا کہاں تک ساتھ دیتا ہے، کیا پڑھی گئی کتب کے نام، مضامین، مصنف، پوری طرح یاد رہتے ہیں؟

جواب: ضرورت اور دلچسپی کی بات اجمالاً یاد رہتی ہے اور بوقت ضرورت مراجعت میں فائدہ دیتی ہے، لیکن زیادہ تر باتیں ذہن سے عام طور پر محو ہو جاتی ہیں۔ دوبارہ کہیں دیکھنے پر یاد آتا ہے کہ پہلے بھی یہ بات کہیں پڑھی ہے۔ کسی لائبریری میں جاؤں تو ایک سرسری نظر سب کتابوں پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ کوئی نئی کتاب آئی ہو تو معلوم ہو جائے، اور کبھی کسی حوالہ سے کسی کتاب کی ضرورت محسوس ہو تو ذہن میں عام طور پر یہ بات محفوظ رہتی ہے کہ یہ کتاب فلاں

لائبریری میں دیکھی تھی۔

سوال : تنہائی اور خاموشی آپ کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے، یا آپ ہجوم اور شور و شغب میں بھی پڑھ لیتے ہیں؟

جواب: مطالعہ کے لیے تنہائی کی کوشش کرتا ہوں۔ بوقتِ ضرورت شور وشغب میں بھی کام چل جاتا ہے۔ ایک مرحوم دوست مولانا سعید الرحمٰن علوی میرے لیے ہمیشہ قابل رشک رہے ہیں جو مجلس میں بیٹھے ہوئے گپ شپ بھی کرتے تھے، مطالعہ بھی چلتا تھا اور ساتھ ساتھ لکھتے بھی رہتے تھے اور ان میں سے کوئی بات دوسری پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ ویسے گھر والے کہتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ میں کتاب یا رسالہ ہو تو آپ کو ارد گرد کا ہوش نہیں رہتا۔

سوال: کیا مطالعہ کے دوران آپ کتاب پر نشان لگاتے ہیں؟ یا آپ الگ نوٹ کر لیتے ہیں؟ کبھی خلاصہ لکھنے کا شوق رہا؟

جواب: کتاب پر نشان لگانے سے گریز کرتا ہوں اور کوئی بات پسند یا ضرورت کی ہو تو نوٹ بک پر درج کر لیتا ہوں۔ کسی کتاب پر حاشیہ لکھنے کا معمول بھی نہیں ہے، البتہ ضروری حوالہ یا عبارت نوٹ بک پر محفوظ کر لیتا ہوں۔ اس قسم کے نوٹس دو تین مختصر کاپیوں میں موجود ہیں جو کبھی کبھی پھر سے دیکھتا رہتا ہوں۔

سوال: آپ اپنے مطالعہ، حاصلِ مطالعہ اور ذوقِ مطالعہ میں کیا اپنے گھر کے لوگوں خصوصاً بچوں کو بھی حصہ دار بناتے ہیں؟ بچوں کی تربیت ذوق کے لیے آپ کے تجربات کیا ہیں؟

جواب: بچوں کو کتاب کی طرف متوجہ کرتا ہوں اور ان کے مطلب یا ذہنی سطح کی کوئی کتاب نظر آجائے تو مہیا کرتا ہوں اور انہیں مطالعہ کرتے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔

سوال : اگر آپ کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں آپ باقی دنیا سے کٹ گئے ہوں اور آپ کو باقی زندگی کے لیے (قرآن مجید کے علاوہ) صرف تین کتابوں کے انتخاب کا موقع دیا جائے تو کن کتابوں کا انتخاب کریں گے؟

جواب: اللہ نہ کرے ایسی کوئی صورت پیش آئے لیکن اگر خدانخواستہ کوئی ایسی صورت پیش

آ جائے تو قرآن کریم کے علاوہ احادیثِ نبویہ کے کسی اچھے سے مجموعہ، تاریخی واقعات کی کوئی ضخیم کتاب اور دیوان سنگھ مفتون کی ''ناقابلِ فراموش'' کا تقاضا کروں گا۔

ذاتی لائبریری کا حدود اربعہ

سوال: کیا آپ کی ذاتی لائبریری ہے؟ اس کا حدود اربعہ کیا ہے؟ اس میں اہم ترین کتابیں کون سی ہیں؟ کچھ خاص کتابوں کو حاصل کرنے کے لیے اگر آپ کو کوئی خاص معرکہ سر کرنا پڑا ہو تو درج فرمائیے؟ نمایاں شخصیتوں کی طرف سے ہدیہ میں آئی ہوئی کتابیں کون کون سی ہیں؟

جواب: زندگی میں اپنے جیب خرچ اور کمائی کا ایک بڑا حصہ میں نے کتاب پر صرف کیا ہے۔ ذاتی اور گھریلو اخراجات کے بعد سفر، کتاب، اسٹیشنری و ڈاک میری کمائی کے اہم ترین مصارف رہتے ہیں۔ مجھے جب بھی اپنے اخراجات میں کوئی گنجائش ملی ہے (بسا اوقات اس کے بغیر بھی) تو میری رقم کے مصارف میں یہی تین چیزیں شامل رہی ہیں اور اب بھی یہی صورتحال ہے۔ میں نے زندگی میں جتنی کتابیں خریدی ہیں اگر سب میرے پاس موجود ہوتیں تو انہیں سنبھالنے کے لیے ایک اچھی خاصی لائبریری درکار ہوتی، مگر میرے ساتھ المیہ یہ رہا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک کتاب خریدنے میں جس قدر ''فضول خرچ'' تھا اسی طرح کتاب دینے میں بھی فراخ دل رہا ہوں۔ مجھ سے جس دوست نے بھی کسی ضرورت کے لیے کوئی کتاب مانگی ہے میں انکار نہیں کر سکا، اور اس طرح دی ہوئی کتابوں میں شاید ہی چند کتابیں مجھے واپس ملی ہوں، ورنہ اکثر کتابیں دوستوں ہی کے کام آ رہی ہیں۔ یہ ''واردات'' میرے ساتھ انفرادی کے علاوہ اجتماعی بھی ہوئی ہے اور کئی بار ہوئی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ گکھڑ میں انجمنِ نوجوانانِ اسلام قائم ہوئی جس کے بانیوں میں میرا نام بھی شامل ہے۔ اس انجمن نے عوامی خدمت کے لیے دارالمطالعہ قائم کیا تو میں نے اپنی زیادہ تر کتابیں وہاں دے دیں کہ عمومی استفادہ ہوگا اور محفوظ بھی رہیں گی، مگر دو چار سال کے بعد انجمن بکھری تو کتابوں کا بھی کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کہاں گئیں۔

اس کے بعد گوجرانوالہ میں اسلامیہ کالج روڈ پر کچھ نوجوانوں نے انصار الاسلام لائبریری کے

نام سے ایک دینی دارالمطالعہ قائم کیا تو اس وقت جمع ہونے والی کتابوں کا بڑا حصہ ان کی نذر کر دیا۔ یہ دارالمطالعہ آٹھ دس سال چلتا رہا اور اب اس کا بھی کوئی سراغ موجود نہیں ہے۔ اس کے کافی عرصہ بعد شاہ ولی اللہ یونیورسٹی وجود میں آئی اور اس میں لائبریری قائم کی گئی تو میں نے ایک بار پھر کتابوں کی چھانٹی کی اور اچھا خاصا ذخیرہ شاہ ولی اللہ یونیورسٹی کی لائبریری میں منتقل کر دیا، مگر یونیورسٹی کا سلسلہ تعلیم چند سال بعد منقطع ہو گیا تو لائبریری بھی بند ہو گئی۔ خدا جانے کوئی کتاب اب وہاں موجود ہے یا نہیں۔ اب میری ساری توجہ الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی لائبریری کی طرف مبذول ہے اور کوشش کر رہا ہوں کہ ایک اچھی سی لائبریری اصحاب ذوق کو میسر آ جائے۔ اس کارِخیر میں عزیزم محمد عمار خان ناصر سلّمہٗ بھی میرے ساتھ شریک ہے جو کتابی ذوق سے بخوبی بہرہ ور ہے اور لکھنے پڑھنے کے سوا اس کی کوئی اور دلچسپی نہیں ہے۔ اس کا بڑا بیٹا طلال خان بھی کتابوں اور رسالوں میں ہی غرق رہتا ہے، حتیٰ کہ کھانا بھی ماشاءاللہ اس کیفیت میں کھاتا ہے کہ کتاب یا رسالہ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور پاس بیٹھی ماں یا دادی اس کے منہ میں لقمے ڈالتی رہتی ہے، اللہ پاک نظر بد سے بچائیں۔ مجھے اور عمار میں سے جس کو بھی کوئی کتاب میسر آ جائے اور وہ ہماری وقتی یا ذاتی ضرورت کے دائرہ کی نہ ہو تو الشریعہ اکادمی کی لائبریری کی نذر ہو جاتی ہے۔ الشریعہ اکادمی کی لائبریری کو بہت چھوٹی ہونے کے باوجود شہر کی اہم لائبریریوں میں بحمداللہ تعالیٰ شمار کیا جا سکتا ہے۔

بعض کتابوں کے حصول میں غیر معمولی صورتحال سے بھی واسطہ پڑا۔ میری طالب علمی کے زمانے میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ایک شاگرد مولانا محمد صدیق ولی اللّٰہی وقتاً فوقتاً آیا کرتے تھے۔ مجذوب طرز کے بزرگ تھے، مگر کتاب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور کوئی نہ کوئی نادر کتاب ان کے تھیلے میں موجود ہوتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے ان کے پاس ہندوستان کی زمینوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں مولانا محمد اعلیٰ تھانوی کا رسالہ دیکھ لیا جو ان دنوں نایاب تھا۔ مجھے اس کی تلاش تھی، میں نے ان سے درخواست کی کہ چند روز کے لیے مرحمت فرما دیں، میں نقل کر لوں گا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نے گزارش کی کہ رات آپ نے یہیں رہنا ہے اس لیے ایک رات کے لیے دے دیں صبح واپس کر دوں گا۔ انہوں نے وہ رسالہ مجھے اس شرط پر دے دیا۔ میں نے رات بھر جاگ کر وہ رسالہ نقل کر لیا اور صبح کو انہیں واپس کر دیا۔

صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں اسلامی نظریاتی کونسل نے سود کی حرمت اور اس کے متبادل شرعی نظام کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ مرتب کی تھی۔ ان دنوں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹوں کی اشاعت پر پابندی ہوا کرتی تھی۔ مجھے اس رپورٹ کی تلاش تھی اور معمول کے ذرائع سے دستیاب نہیں ہو رہی تھی، البتہ قومی اسمبلی کے ارکان میں وہ تقسیم کی گئی تھی۔ میں ایک دن بلوچستان سے تعلق رکھنے والے قومی اسمبلی کے ایک رکن سے، جو اَب مرحوم ہو چکے ہیں، ملنے کے لیے ایم این اے ہاسٹل میں ان کے کمرے میں گیا تو وہ رپورٹ ان کی میز پر پڑی دیکھی۔ میرا جی للچایا اور میں نے ان جانے سے انداز میں ان سے پوچھا کہ یہ کون سی کتاب ہے؟ انہوں نے بھی اسی انجانے سے لہجے میں کہا کہ پتہ نہیں، کوئی صاحب دے گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی ضرورت کی تو نہیں، کیا میں لے لوں؟ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے وہ کتاب اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ لی۔ اس رپورٹ کے اس طرح اچانک حصول پر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں وہ کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے محفوظ کر لیا کہ برطانیہ کے سفر کے دوران فراغت سے مطالعہ کر لوں گا، مگر ساؤتھال لندن کی ابوبکر مسجد میں ورلڈ اسلامک فورم کی ایک میٹنگ میں انڈیا کے محقق عالم دین حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ ہمارے ساتھ شریک تھے۔ میں نے کسی ضرورت کے تحت اپنا بیگ ان کے سامنے کھولا تو ان کی نظر اس رپورٹ پر پڑ گئی۔ انہوں نے مجھ سے مانگ لی اور فرمایا کہ میں تو ایک عرصہ سے اس کی تلاش میں تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے بھی بڑی مشکل سے حاصل کی ہے۔ انہوں نے یہ فرما کر بے تکلفی کے ساتھ وہ رپورٹ اپنے بیگ میں رکھ لی کہ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے، تم کوئی اور نسخہ تلاش کر لینا۔ مجھے کتاب کھو جانے کا افسوس تو ہوا، مگر اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی کہ وہ رپورٹ مجھ سے زیادہ اہل اور مستحق بزرگ کے پاس پہنچ گئی۔

لندن ہی میں ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل مولانا مفتی برکت اللہ کی ذاتی لائبریری میں ایک کتاب میری نظر سے گزری جو ایک عرب محقق الاستاذ عبد الحلیم ابوشقہؒ نے ''تحریر المراۃ فی عصر الرسالۃ'' کے عنوان سے چار جلدوں میں لکھی ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں عورتوں کو حاصل ہونے والی آزادیوں کے بارے میں انتہائی مستند مواد جمع کر دیا ہے۔

انسانی حقوق اور خاص طور پر عورتوں کے حقوق میرے مطالعہ اور گفتگو کا ہمیشہ سے اہم موضوع رہے ہیں، اس لیے یہ کتاب میری دلچسپی اور ضرورت کی تھی۔ میں نے مولانا مفتی برکت اللہ کے ساتھ وہی کیا جو میرے ساتھ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے کیا تھا۔ مفتی برکت اللہ صاحب کے نہ نہ کرتے بھی میں نے وہ کتاب اپنے بیگ میں رکھ لی اور ان سے کہا کہ آپ دوسرا نسخہ منگوالیں، یہ میں لے جا رہا ہوں۔ یہ نسخہ الشریعہ اکادمی کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس کتاب کا مکمل اردو ترجمہ اب اسلامی نظریاتی کونسل نے اسلام آباد سے شائع کر دیا ہے، جبکہ ایک جلد میں اس کی تلخیص بھی ’’عورت عہدِ رسالت میں‘‘ کے عنوان سے لاہور کے ایک اشاعتی ادارے نے شائع کی ہے۔

یہودیوں کی ایک اہم کتاب ’’تالمود‘‘ ہے جس کا وہ عام طور پر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل مجھے اس کی تلاش تھی کہ اس کا اردو یا عربی ترجمہ مل جائے تو یہ معلوم کرلوں کہ مواد کس نوعیت کا ہے۔ مختلف دوستوں سے پوچھتا رہا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ برطانیہ میں ایک کتاب شناس دوست سے ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ تالمود کے منتخب حصوں کا اردو ترجمہ تو آپ کے گوجرانوالہ سے شائع ہوا ہے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے اپنی لائبریری سے وہ کتاب نکال کر مجھے دکھائی تو اس پر ناشر کے طور پر ’’بیت المومنین سادھوکی گوجرانوالہ‘‘ لکھا تھا۔ واپسی پر میں نے سادھوکی کے قریب جی ٹی روڈ پر واقع جامعہ اسلامیہ کے مہتمم مولانا عبدالرؤف فاروقی کو بتایا تو انہیں بھی حیرانی ہوئی۔ ہم دونوں سادھوکی کے ریلوے پھاٹک کے ساتھ واقع ادارہ ’’بیت المومنین‘‘ پہنچے تو دیکھا کہ وہ کیتھولک مسیحیوں کا ایک عالمی سطح کا معیاری اشاعتی ادارہ ہے جہاں سے ویٹی کن سٹی کی مطبوعات کے معیاری اردو تراجم شائع ہوتے ہیں۔ عجیب اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ اس وقت جو انچارج پادری صاحب وہاں موجود تھے، ان کا تعلق بھی ہمارے آبائی شہر گکھڑ سے تھا۔ انہوں نے ہمیں پہچان لیا، خوب آؤ بھگت کی اور تالمود کے اردو ترجمے کے علاوہ کیتھولک بائبل اور چند دیگر کتابیں بھی ہمیں ہدیے کے طور پر پیش کیں۔

آج کل مطلب کی کسی کتاب کے حصول کے لیے مجھے عام طور پر تین ذرائع میسر ہیں۔ کسی صاحب علم دوست کے ہاں جاتا ہوں تو ان کی لائبریری پر ایک نظر ضرور ڈالتا ہوں۔ کوئی نئی کتاب دلچسپی کی نظر میں آئے تو اس کا نام اور مصنف و ناشر کا تعارف ذہن نشین کر لیتا ہوں اور بعد میں

موقع ملے تو حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ ہمارے دوستوں میں ایک کتاب دوست اور کتاب شناس ساتھی شبیر احمد میواتی ہیں۔ اچھی کتابوں کی تلاش، ان کا حصول اور متعلقہ دوستوں تک انہیں پہنچانا (اگرچہ بعض اوقات اس کے لیے مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے) میواتی صاحب کا خصوصی مشغلہ ہے۔ ہمارے ہاں اکثر آتے رہتے ہیں اور ہر مرتبہ ان کی زنبیل میں نئی اور پرانی کتابوں کا ایک اچھا انتخاب موجود ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی کتاب میرے مطلب کی ہو تو وہ دے دیتے ہیں یا میں مانگ لیتا ہوں، ورنہ مطالعہ کے لیے تو رکھ ہی لیتا ہوں جو زیادہ تر واپس بھی کر دیتا ہوں۔ ہمارے ایک اور دوست محمد رفیق صاحب ہیں۔ نادر عربی کتابوں کی خرید و فروخت ان کا مشغلہ ہے۔ کبھی کبھی آتے ہیں تو ان کا تھیلا کھلوا کر دیکھتا ہوں۔ کوئی دلچسپی یا ضرورت کی کتاب جیب کی گنجائش کے دائرے میں ہو تو خرید لیتا ہوں، یا عمار سے کہتا ہوں کہ الشریعہ اکادمی کے فنڈ میں گنجائش ہو تو لائبریری کے لیے خرید لو۔ بصورت دیگر کتاب خاموشی کے ساتھ واپس کر دیتا ہوں۔

سوال: کتابیں مستعار دینے اور لینے کے متعلق آپ کے تجربات کیا ہیں اور اس معاملے میں آپ کا نظریہ و مسلک کیا ہے؟ کیا کچھ واقعات ایسے ہیں کہ بعض اہم کتابوں سے آپ ہاتھ دھو بیٹھے ہوں؟

جواب: اس بارے میں بہت تلخ تجربہ رکھتا ہوں۔ بہت سی کتابیں ضائع کر چکا ہوں۔ ایک اہم کتاب جو مجھ سے کسی صاحب نے مطالعہ کے لیے لی، کئی برس بعد مجھے ایک فٹ پاتھ پر کتابیں بیچنے والے سے دوبارہ خریدنی پڑی۔ حتیٰ کہ فلپ کی ہٹی کی جس کتاب کا میں سطور بالا میں ذکر کر چکا ہوں، اس پر میرے لکھے ہوئے نوٹس بھی موجود تھے، وہ اور قاضی عیاضؒ کی ''الشفاء'' جو ایک دوست نے مجھ سے مطالعہ کے لیے لی تھیں، یہ دونوں ذاتی کتابیں میں نے فٹ پاتھ سے دوبارہ خریدیں۔

فکر و ذہن کے ارتقا کا تجربہ

سوال: کیا مطالعہ سے عمر کے ساتھ ساتھ کوئی ذہنی، فکری تبدیلی پیدا ہوئی؟

جواب: مطالعہ کے ارتقا سے فکر و ذہن کا ارتقا ایک فطری امر ہے، میں بھی اس تجربہ سے دوچار

ہوا ہوں۔ بہت سی باتیں جن پر ابتدائی دور میں لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے تھے، اب ہلکی پھلکی معلوم ہوتی ہیں اور مطالعہ نے رفتہ رفتہ فکر میں توسع اور تنوع پیدا کیا ہے۔ خاص طور پر یہ کہ آج کے حالات میں آزادانہ بحث و مباحثہ کے بغیر کسی بھی مسئلے میں منطقی نتیجے تک پہنچنا ممکن نہیں ہے، اور عالمی ذرائع ابلاغ اور تعلیمی مراکز نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مختلف اطراف سے شکوک وشبہات پیدا کرنے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے، اس کے اثرات سے نئی نسل کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمارا روایتی اسلوب کافی نہیں ہے۔ ماضی نے اپنا علمی خزانہ کتابوں اور سی ڈیز کی شکل میں اگل دیا ہے اور آج کوئی بھی ذی استعداد اور باصلاحیت نوجوان اپنے چودہ سوسالہ علمی ماضی کے کسی بھی حصہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے یا کسی بھی طبقے کا موقف اور دلائل معلوم کرنا چاہے تو اسے اس کے بھرپور مواقع اور وسائل ہر وقت میسر ہیں۔ اس ماحول میں یہ کوشش کرنا کہ نوجوان اہلِ علم صرف ہمارے مہیا کردہ علم اور معلومات پر قناعت کریں اور علم اور معلومات کے دیگر ذرائع سے آنکھیں اور کان بند کر لیں، نہ صرف یہ کہ ممکن نہیں بلکہ فطرت کے بھی منافی ہے۔ اس لیے آج کے دور میں ہماری ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے اور یہ بات ہمارے فرائض میں شامل ہو جاتی ہے کہ مطالعہ اور تحقیق کے اس سمندر سے نئی نسل کو روکنے کی بجائے خود بھی اس میں گھسیں اور ان متنوع اور مختلف الجہات ذرائع معلومات میں حق کی تلاش یا حق کے دائرے کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی راہنمائی کریں۔ چنانچہ علم وفکر کی دنیا میں میرا ذوق روکنے یا باز رکھنے کا نہیں بلکہ سمجھانے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہر ممکن مدد کرنے کا ہے۔ کسی دوست کو یہ طریقہ پسند ہو یا نہ ہو، لیکن میں اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اس کے لیے بحث و مباحثہ ضروری ہے، مسائل کا تجزیہ و تنقیح اور دلائل کی روشنی میں ان کا خالص علمی انداز میں تلاش کرنا ضروری ہے۔ ایک عرصہ تک میرا بھی یہ ذوق اور ذہن رہا ہے کہ تحقیق کا دائرہ صرف یہ ہوتا ہے کہ جو بات ہم اپنے ذہن میں پہلے سے طے کر چکے ہیں، اسے کسی نہ کسی طرح ثابت کر دیا جائے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ بات ذہن میں راسخ ہوتی گئی کہ خود اپنی بات کو دلائل اور حقائق کے معیار پر پرکھنا بھی تحقیق کا اہم ہدف ہوتا ہے۔ بہت سے مسائل میں اکابر اہلِ علم کا رجوع الی الحق بالخصوص حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف سے اس کا باقاعدہ اہتمام میرے ذوق میں اس تبدیلی کا باعث بنا۔

مطالعہ کے حوالے سے ناگوار احساس

سوال : کیا کبھی کسی تحریر کے مطالعے سے منفی احساس بھی ہوا، مایوسی یا غصے کی کیفیت؟

جواب: قرآن کریم، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات صحابہ کرامؓ واہل بیت عظامؓ اور بڑی دینی شخصیات کا کہیں توہین وتمسخر کے انداز میں ذکر ہو تو غصہ آتا ہے اور وہیں مطالعہ چھوڑ دیتا ہوں۔ اختلافِ رائے کا حق بلا جھجک استعمال کرتا ہوں اور بلا تأمل دوسروں کو اختلاف رائے کا حق دیتا ہوں۔ سنجیدہ علمی اختلاف کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا ہوں، مگر توہین، استہزا اور تمسخر میرے لیے ہمیشہ ناقابل برداشت رہا ہے اور استحقار واستخفاف کا لہجہ کسی بھی شخصیت کے بارے میں اختیار کیا جائے، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تنقید واعتراضات پر مشتمل پنڈت دیانند سرسوتی کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کے چودھویں باب کا کئی بار مطالعہ کیا ہے اور اب بھی ضرورت پڑنے پر اسے دیکھتا ہوں، مگر راج پال کی بدنام زمانہ کتاب ''رنگیلا رسول'' کو پڑھنے کا اپنے اندر کبھی حوصلہ نہیں پایا۔

دنیا سنڈے میگزین

(۱۷ جولائی ۲۰۱۶ء)

(دنیا نیوز کے انٹرویو نگار جناب رانا محمد آصف کا انٹرویو مولانا راشدی کی نظر ثانی کے ساتھ یہاں شائع کیا جا رہا ہے)

پیش لفظ از رانا محمد آصف

اب سے ربع صدی قبل کے زمانے کے ایک سرگرم سیاسی کارکن علامہ زاہد الراشدی نے عملی سیاسی سرگرمیوں سے رفتہ رفتہ کنارہ کشی اختیار کر لی ہے لیکن فکری اور تعلیمی سرگرمیوں کے لیے اب بھی کئی تنظیمات اور فورموں سے وابستہ ہیں۔ مولانا فداء الرحمٰن درخواستی کے ساتھ مل کر ''پاکستان شریعت کونسل'' کے نام سے ایک فکری فورم قائم کیا۔ اسی طرح لندن میں مولانا محمد عیسیٰ منصوری کے ساتھ مل کر عالمی سطح پر ''ورلڈ اسلامک فورم'' قائم کیا جو کہ علمی وفکری میدان میں عصرِ حاضر کے تقاضوں کا احساس اجاگر کرنے میں مصروف ہے اور اس کی سرگرمیوں کا دائرہ برطانیہ، بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور دیگر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ بیرون ملک ختمِ نبوت کانفرنسوں اور ورلڈ اسلامک فورم کی سرگرمیوں کے علاوہ دیگر تعلیمی، دعوتی اور مطالعاتی مقاصد کے لیے کئی ممالک کا سفر کر چکے ہیں۔ سادگی اور بے ساختگی ان کی شخصیت اور گفتگو کی خصوصیات ہیں۔ مولانا راشدی ملک کی قومی سیاست، دینی جدوجہد اور جہادِ افغانستان کے حوالے سے تاریخ کے کئی اہم ادوار کے عینی شاہد بلکہ شریکِ کار رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں کراچی میں ان سے ہونے والی گفتگو کی تفصیلات پیشِ خدمت ہیں۔

جناب جاوید احمد غامدی اور اسلام کی تعبیرِ نو

سوال: کیا مسلمانوں کو تجدیدِ فکر کی ضرورت نہیں؟

جواب: ہمیں فکر کی تجدید کی ضرورت ہے لیکن جدید فکر کی ضرورت نہیں۔ اپنے پیغام کو جدید انداز میں پیش کرنا ضروری ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دین میں کسی نئی فکر کو داخل کرنے کی کوشش کی جائے۔

سوال: جاوید احمد غامدی صاحب کی فکر کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

جواب: غامدی صاحب کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ وہ خود بھی کنفیوژ ہیں اور کئی معاملات میں وہ اپنی کنفیوژن میں پوری قوم کو شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ اسلام کی تعبیرِ نو کے لیے نئے اصول وضع کرنا چاہتے ہیں۔ امت کسی ایسی فکر کو قبول نہیں کرے گی۔ مسلّمہ اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے فکر کی تشکیلِ نو کی جا سکتی ہے لیکن غامدی صاحب اصول بھی نئے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن وحدیث سے استنباط کے بنیادی اصول طے شدہ ہیں لیکن وہ پورا فکری ڈھانچہ ہی تبدیل کرنا چاہتے جو کہ ممکن اور قابلِ قبول نہیں ہے۔

سوال: آپ کے صاحبزادے عمار خان ناصر بھی کیا اسی فکر سے تعلق رکھتے ہیں؟

جواب: نہیں، اس معاملے میں اس کا اصولی موقف وہی ہے جو میرا ہے۔ یعنی دینی فکر کو اخذ کرنے کے اصول تبدیل نہیں ہو سکتے۔ عمار کی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''فقہائے احناف اور فہمِ حدیث'' آپ پڑھیں گے تو یہ بات واضح ہو جائے گی۔

اسلامی ریاست اور معاشرہ

سوال: آپ کے خیال میں ایک اسلامی ریاست میں تمام مذہبی ادارے ریاست کے ماتحت ہونے چاہئیں؟

جواب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں یہ ادارے ریاست ہی کے پاس تھے۔ اور اسلامی ریاست سے مراد ویسی ہی ریاست ہے جیسی اس دور میں قائم ہوئی تھی۔ فوج اور انتظامیہ بھی اسی مذہبی ریاست کے کنٹرول میں تھے۔ اور بیت المال کا پورا نظام جسے آج ویلفیئر اسٹیٹ کی مثال قرار دیا جاتا ہے، وہ بھی ایک ریاستی ادارہ ہی تھا۔

سوال: اسلامی قوانین کے نفاذ اور مشاورت کے لیے

اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کی صورت میں جو آئینی ادارے موجود ہیں ان کے غیر مؤثر ہونے کی شکایت تو کی جاتی ہے لیکن انہیں مؤثر بنانے کے لیے کیوں کچھ نہیں کیا جاتا؟

جواب: ہمارے پاس تو یہی راستہ تھا کہ عوامی دباؤ کے ذریعے ان فیصلوں کو نافذ کروایا جائے۔ لیکن اس آپشن کو بھی ہتھیار اٹھانے والوں نے مسدود کر دیا ہے۔ ہم پُر اَمن جدوجہد کرتے تھے، سڑکوں پر نکلتے تھے اور ہلکا پھلکا ہنگامہ بھی ہو جاتا تھا جس کے نتیجے میں کوئی نہ کوئی نتیجہ نکل آتا تھا۔ اب اس کی جگہ کلاشنکوف نے لے لی ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری وہ عوامی مزاحمتی قوت کمزور ہو گئی ہے۔

سوال: گزشتہ دنوں خواتین کے تحفظ کے لیے قانون سازی ہوئی اور اس کے حوالے سے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات بھی سامنے آئیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے میں اس تاثر نے زور پکڑا ہے کہ مذہبی طبقہ خواتین کے بارے میں جاگیردارانہ رویہ رکھتا ہے۔ اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب: ان معاملات میں مذہبی ردعمل کی بات تو کی جاتی ہے لیکن مثبت باتوں کو عوام تک نہیں آنے دیا جاتا۔ اسلامی معاشرے میں خواتین کا کردار کم از کم وہ نہیں ہو سکتا جو مغرب چاہتا ہے۔ کیونکہ اسلام عورت کو ایک فطری دائرے میں رکھتا ہے جسے نظر انداز کرنے کی وجہ سے مغرب کا اپنا خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے اور اب وہ خواتین کے حقوق کے نام پر ہمارے خاندانی نظام کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ مغرب کے دانشور خود خاندانی نظام کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں مگر ہمیں اس نظام سے محروم کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سوال: ہماری سوسائٹی جو مذہبی معاملات میں تو حساس ہے لیکن تشدد کے بڑھتے ہوئے واقعات پر اس کا ردعمل سامنے نہیں آتا۔ کیا اس حوالے سے مذہبی راہنما اپنا کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب: ہمارے معاشرے پر مذہبی ہونے کا ’’الزام‘‘ تو ہے لیکن قومی سطح پر مذہب کی تعلیم، روایتی میڈیا، اور اسلامی تعلیمات کے نفاذ کی قوت مذہبی لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ البتہ صرف

مولوی کو ''گالی'' دینے کے لیے سوسائٹی کو مذہبی کہا جاتا ہے اور تشدد کے واقعات کو جزوی اور مشروط مذہبی تعلیمات کی طرف منسوب کر کے غلط تاثر قائم کیا جاتا ہے۔

سوال: بعض حلقوں کے نزدیک مذہبی فکر کی جانب سے قومی ریاست کو مسترد کرنے اور عالمی سطح پر خلافت کے قیام کو دینی تقاضا قرار دینے کی وجہ سے شدت پسندی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ خیال کہاں تک درست ہے؟

جواب: عمومی دینی حلقے تو قومی ریاست کو قبول کر چکے ہیں۔ کچھ نے اگر نہیں کیا تو اس کے لیے سب کو یکساں طور پر ذمہ دار قرار دینا درست نہیں ہے۔ دنیا میں جتنی بھی ریاستیں ہیں وہ اپنے دائرہ کار میں رہ کر کام کر رہی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس بات کو اس طرح بھی واضح کر دیا تھا کہ خلافت کسی علاقائی حکومت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ آج کی اصطلاح میں ایک کنفیڈریشن کا نام ہے۔ یعنی امارات اپنی اپنی جگہ قائم ہوں اور خودمختار ہوں جبکہ ان کا ایک مرکز ہو جو کنفیڈریشن کی طرح کا ایک نظام ہو۔

اسی لیے میں اسے افغان طالبان کی عقل مندی کے فیصلوں میں شمار کرتا ہوں کہ انہوں نے افغانستان میں حکومت کے قیام کے بعد ''خلافت'' کا نہیں بلکہ ''امارت'' کا اعلان کیا۔ جبکہ داعش کی سب سے بڑی بے وقوفی یہی تھی کہ انہوں نے بات ہی خلافت سے شروع کی ہے۔ حالانکہ خلافت جب بھی بنے گی ایک کنفیڈریشن کی طرز پر بنے گی جس میں امارات کو پوری داخلی خودمختاری حاصل ہوگی۔ خلافتِ راشدہ کے دور کا اگر درست تجزیہ کیا جائے تو وہ نظام کنفیڈریشن ہی کا تھا جس میں صوبوں کو خودمختاری حاصل تھی اور مرکزی حکومت ہر معاملے میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

سوال: دینی مدارس کے طلباء اس معاملے میں یکسو نظر نہیں آتے، شدت پسندانہ کاروائیوں کو رد عمل قرار دے دیا جاتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اس معاملے میں ہونے والی کوششوں کو منظّم نہیں کیا گیا اور اسے ایک تحریک کی شکل نہیں دی گئی۔ میں اس کے لیے دینی جماعتوں کو بھی ذمہ دار سمجھتا ہوں لیکن سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کے بالادست طبقے بھی یہی چاہتے ہیں کہ لوگ اس معاملے میں کنفیوژن کا شکار رہیں۔

سوال: لیکن ہمارے ہاں مدارس کا متوازی نظام اور مساجد میں جمعہ پر تو سرکار کی عملداری نہیں۔ ان اداروں کو ریاست سے کیوں الگ رکھا جا رہا ہے؟

جواب: ریاست اگر ساری ذمہ داریاں قبول کر لے تو اس کے بعد مسجد بھی سنبھال لے۔ باقی سارے کام امریکہ کے ایجنڈے کے ماتحت ہوں اور پھر آپ مسجد کنٹرول کرنے آجائیں تو ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ریاست پہلے قومی سطح پر دین کی تعلیم اور نفاذِ اسلام کے دستوری تقاضے پورے کرے پھر مدارس سے سوال کرے کہ تمہاری کیا ضرورت ہے؟ خود اپنی ذمہ داریاں قبول کر کے انہیں پورا نہیں کرتے لیکن مدارس یہ کام کر رہے ہیں تو ان پر ملامت کی جاتی ہے۔

دینی مدارس کا نظامِ تعلیم

سوال: مدارس میں آپ کے دورِ طالب علمی اور آج کے ماحول میں کوئی فرق ہے؟

جواب: بہت فرق ہے۔ اس وقت تعلیم کے ساتھ ساتھ ذہن سازی اور فکری تربیت کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ وہ جمعیت علماء اسلام کا دور تھا اور آج جیسے کئی مسائل اس وقت نہیں تھے۔ ہماری فکری تربیت خالصتاً تحریکِ ختمِ نبوت کے دور میں ہوئی، پھر ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں جمعیت کے لیے کام کیا، جمعیت طلباء اسلام کا حصہ بھی رہا۔ اس دور میں سیاسی، تحریکی اور اجتماعی سطح پر کام کرنے کی تربیت کا ماحول تھا۔ اس کی وجہ سے تمام مکاتبِ فکر کے ساتھ مل کر کام کرنے کا تجربہ بھی رہا۔

سوال: مدارس کے معیارِ تعلیم کے بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب: ماضی کے مقابلے میں طلباء اور اداروں کی تعداد بڑھی ہے لیکن معیار وہ نہیں رہا۔ وسعت پیدا ہوئی ہے لیکن استعداد اور قابلیت میں کمزوری آئی ہے۔

سوال: اس صورتحال کے اسباب کیا ہیں؟

جواب: مدارس میں تعلیمی معیار کی کمی کے اسباب بھی وہی ہیں جو دیگر تعلیمی اداروں میں ہیں۔ جس طرح اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں طلباء کی بڑی تعداد صرف ڈگری لینے کے لیے جاتی ہے، یہ رجحان مدارس میں بھی آ گیا ہے اور اب بہت سے طلباء صرف حصولِ سند کے لیے پڑھتے ہیں۔ اگرچہ صورتحال بالکل خراب نہیں ہوئی لیکن پہلے کے مقابلے میں تبدیل ضرور ہوئی ہے۔

سوال: ادب سے دوری طبیعت پر اثر ڈالتی ہے؟

جواب: بالکل ایسا ہوتا ہے۔ میں تو ایک بات اور کہتا ہوں، جب بھی ہمارے ہاں مدارس میں انگریزی پڑھانے کی بات ہوتی ہے تو میرا کہنا یہ ہوتا ہے کہ پہلے انہیں اردو تو پڑھائی جائے۔ ہمیں انگریزی پڑھانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن عربی کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ فارسی تو مدارس سے ختم ہی ہوگئی ہے اور اس کا اثر ہماری اردو پر بھی پڑا ہے۔ اس کے علاوہ ہم ماضی کے لٹریچر سے کٹ گئے ہیں اور تراجم پر انحصار بڑھ گیا ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ آج کا مدرس اور خطیب صحیح اردو تک بولنا اور لکھنا نہیں سیکھ پاتا۔

سوال: ماضی میں علمائے دین میں شعری ذوق بھی پایا جاتا تھا اور ادب سے تعلق بھی۔ اب صورتحال کیا ہے؟

جواب: اب یہ ذوق نہیں رہا۔ جبکہ پہلے بھی یہ مضامین باقاعدہ نصاب کا حصہ نہیں ہوتے تھے لیکن علمی وادبی حلقوں سے میل جول کی وجہ سے لوگ اس طرف مائل ہو جاتے تھے۔ میں اپنی مثال اس لیے نہیں دیتا کہ میرے والد حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ اہلِ قلم تھے اور ان کا ادبی ذوق ٹھیک ٹھاک تھا۔ یہ معاملہ میرے چچا محترم حضرت صوفی عبدالحمید سواتیؒ کا بھی تھا۔ میں نوجوانی ہی سے کسی نہ کسی ادبی فورم کا رکن رہا۔ مشاعروں میں شرکت، مقالہ نگاری اور تنقید نگاری وغیرہ، میں ان مراحل سے طالب علمی کے دور میں گزر چکا ہوں۔ والد اور چچا کی وجہ سے مجھے تو یہ موقع ملا لیکن عام طور پر ہمارے دینی حلقوں میں یہ ماحول نہیں ہے اور نہ ہی اس پر توجہ دی جا رہی ہے۔

جماعتِ اسلامی سے اختلاف

سوال: آپ کا تعلق جس دینی و سیاسی مکتبِ فکر سے ہے، اس کے اور ملک کی ایک اور دینی سیاسی قوت جماعتِ اسلامی کے مابین اختلافات پائے جاتے ہیں جنہیں ختم کرنے کی ایک کوشش کا آپ بھی حصہ رہے ہیں۔ اس بارے میں کیا بتانا چاہیں گے؟

جواب: قاضی حسین احمد مرحوم جس زمانے میں جماعت اسلامی کے قیم (جنرل سیکرٹری) تھے، اس سلسلہ میں گفتگو کا آغاز ہوا تھا۔ میں ان مذاکرات کا حصہ تھا لیکن ہم کسی فارمولے پر نہیں پہنچ

سکے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ قاضی صاحب کی وفات کے بعد وہ سلسلہ ختم ہوگیا، لیکن رک ضرور گیا ہے۔اس کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ قاضی صاحب جماعت کے فکری ونظریاتی پہلو پر قناعت کی بجائے اسے عملی سیاست کی جانب زیادہ لے گئے اور آج جماعتِ اسلامی ایک فکری تحریک کی بجائے سیاسی جماعت ہی تصور کی جاتی ہے۔ جماعتِ اسلامی کے نظریاتی عنصر کے مغلوب ہو جانے کی وجہ سے کئی اہم افراد اس سے الگ بھی ہوئے۔قاضی صاحب کے دور میں چونکہ جماعتِ اسلامی خالصتاً ایک متحرک سیاسی جماعت بن گئی، اس لیے وہ پرانے جھگڑے اس وجہ سے بھی پس منظر میں چلے گئے۔اور سراج الحق صاحب کا رخ بھی اسی جانب دکھائی دیتا ہے۔

سوال: جماعتِ اسلامی کے ساتھ یہ اختلافات ختم کرنے کے سلسلے میں کوئی پیشرفت کیوں نہیں ہو سکی؟

جواب: اصل میں اختلاف تو مولانا مودودیؒ کی بعض عبارات سے شروع ہوا تھا۔ قاضی صاحب مرحوم نے جمعیت علماء اسلام کے اکابر مولانا سید حامد میاںؒ اور مولانا محمد اجمل خانؒ کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر جماعتِ اسلامی کی شوریٰ یہ قرارداد منظور کر لے کہ ہم متنازعہ فکری معاملات میں مولانا مودودیؒ کی بجائے جمہور علماء کے ساتھ ہیں تو سارا جھگڑا ختم ہوسکتا ہے۔ ہماری اسی پر بحث چل رہی تھی اور والد گرامی حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی رائے بھی یہی تھی کہ اس کے بعد معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔لیکن پھر اس کے بعد چلتے چلتے بات یہاں پہنچی کہ اصل اختلاف تو جماعتِ اسلامی کے دستور کی اس شق پر ہے کہ

”رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اسی معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو، اس کو اسی درجے میں رکھے“۔

اس پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کا اعتراض یہ تھا کہ یہ اہلِ سنت کے مسلّمات کے خلاف ہے (کیونکہ اہلِ سنت کے ہاں صحابہ کرامؓ بھی معیارِ حق اور تنقید سے بالاتر ہیں)۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی کے ساتھ تنازعہ بھی یہیں سے شروع ہوا تھا۔تو اس سلسلہ میں بات یہاں آ کر رکی کہ

جماعتِ اسلامی کو دستور میں ترمیم کرنی ہوگی۔ اس کے بعد مذاکرات تو نہیں ہوئے لیکن ایک کمیٹی اب بھی کاغذوں میں ہے اور جماعتِ اسلامی کے مولانا عبدالمالک اس کے سربراہ ہیں، میں نے جب اس سلسلہ میں ان سے پوچھا تو وہ طرح دے گئے۔

اتحادِ امت اور فرقہ واریت

سوال: فرقہ واریت کے خاتمے اور اتحادِ امت کے عنوان سے کئی کوششیں کی گئیں لیکن یہ نتیجہ خیز کیوں ثابت نہیں ہوتیں؟

جواب: نتیجہ خیز ثابت ہونے سے مراد اگر یہ ہے کہ فرقوں کا وجود ہی ختم ہو جائے تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ فکر کا اختلاف کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟ جب ذہن مختلف ہیں تو اختلاف بھی رہے گا۔ البتہ ان اختلافات کو حدود میں لانے اور مشترکات پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: فرقہ واریت کی بنیاد پر اسلحہ اٹھانے والوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

جواب: ایسے کسی گروہ کی ہم نے کبھی حمایت نہیں کی اور نہ آج کرتے ہیں۔ مسلم ریاست میں ہتھیار اٹھا کر بات کرنے والے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

قومی و دینی سیاست اور تحریکات

سوال: کیا پاکستان کی انتخابی سیاسی تاریخ سے یہ بات واضح نہیں ہو گئی کہ عوام کوئی مذہبی ریاست نہیں چاہتے؟

جواب: عوام اگر ٹھیٹھ مذہبی ریاست نہیں چاہتے تو مذہب سے باغی ریاست کے حق میں بھی نہیں ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں شاید کسی خالص مذہبی ریاست کا نقشہ نہ ہو لیکن گزشتہ برسوں میں جو سروے ہوئے ہیں ان کے نتائج اس بات کو واضح کرتے ہیں۔ چند ماہ پہلے ایک امریکی ادارے کے سروے میں ۸۷ فیصد پاکستانی عوام نے سختی کے ساتھ اسلام کے نفاذ کی حمایت کی، ۱۷ فیصد کچھ نرم روی کے ساتھ اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں، جبکہ صرف ۲ فیصد ہیں جنہوں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر میں یہ کہتا ہوں کہ ہم پر یہی ۲ فیصد مسلط ہیں۔ شدت یا تشدد پسندی کو پاکستان

کے عوام مجموعی طور پر مسترد کرتے ہیں لیکن اس ملک کی غالب اکثریت ملک میں اسلام کی عملداری چاہتی ہے جبکہ ہماری اسٹیبلشمنٹ اس طرف نہیں جا رہی یا بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ اس طرف جانے نہیں دے رہی۔

سوال: پھر لوگ مذہبی جماعتوں کو ووٹ کیوں نہیں دیتے؟

جواب: کوئی بھی جماعت بطور مذہبی جماعت انتخابات میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ عوامی سطح پر آ کر اتحاد تشکیل دیے جائیں یا پاکستان کی تمام مذہبی جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو لوگ اب بھی ساتھ دینے کو تیار ہیں لیکن مسلکی بنیاد پر لوگ ووٹ نہیں دیں گے۔ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی مختلف مکاتبِ فکر نے متحد ہو کر دینی کاز کے لیے جدوجہد کی ہے عوام نے اس کا ساتھ دیا ہے۔

سوال: جس طرح آپ نے جماعتِ اسلامی کے بارے میں کہا، کیا اسی طرح جمعیت علماء اسلام بھی محض ایک سیاسی جماعت بن کر نہیں رہ گئی؟

جواب: جمعیت علماء اسلام ایک تحریکی قوت تھی لیکن اب نہیں رہی۔ اس بارے میں میرا ہمیشہ سے نقطۂ نظر رہا ہے کہ پارلیمانی سیاست ہماری تحریکی قوت کی نمائندگی کے لیے تھی۔ اب ہم صرف پارلیمانی ہی رہ گئے ہیں اور ساری تگ و دو اسی سمت میں کی جا رہی ہے جس کا نقصان ہو رہا ہے۔

سوال: تحریکِ ختمِ نبوت اور بعد کی مختلف تحریکوں میں دینی اور سیاسی جماعتوں کے قائدین نے مل کر کام کیا۔ اب اس تعلق کو کس سطح پر دیکھتے ہیں؟

جواب: درمیانی اور نچلی سطح پر کارکنوں کا یہ رابطہ اب بالکل ختم ہو گیا ہے اور صرف اعلیٰ قیادت کی حد تک رہ گیا ہے۔ ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۴ء کے ادوار میں جس طرح مڈل کلاس کے سیاسی ورکرز اور دینی تحریکوں کے کارکنان شانہ بہ شانہ رہے اور ان کے آپس میں روابط تھے، وہ بات اب نظر نہیں آتی۔

سوال: اس صورتحال کے کیا اثرات ہوئے؟

جواب: گوجرانوالہ میں آج بھی ہم میل جول کا پرانا ماحول قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں،

سیاسی و مذہبی حوالے سے دوسری جماعتوں کے ساتھ رابطے اور مشترکہ پروگرام کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے شہر کی سطح تک تو حالات بہتر معلوم ہوتے ہیں لیکن مجموعی سطح پر دوریاں بڑھ رہی ہیں اور سماجی تقسیم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نچلی سطح پر مشترکہ سرگرمیوں کے ماحول کو بحال کرنے کی ضرورت ہے ورنہ دینی کاز کو بہت نقصان پہنچے گا۔

سوال: عوامی سطح پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مذہبی طبقے کی جانب سے شدت پسندی کے رجحانات اور قتل و غارت کی واضح اور غیر مشروط مذمت نہیں کی جاتی۔ کیا ایسی تنظیموں اور فکر کے لیے نرم گوشہ پایا جاتا ہے؟

جواب: شدت پسندی کی مذمت کرنے میں مذہبی طبقے نے کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ لیکن میڈیا کا رویہ اس معاملے میں انتہائی جانبدارانہ رہا ہے۔ ہمارے ملک اور عالمی میڈیا دونوں کی پالیسی یہ ہے کہ شدت پسندی کو تو اجاگر کیا جائے لیکن سنجیدہ مذہبی قیادت کی جانب سے جب اس کی مخالفت ہو تو اسے دبا دیا جائے۔ میں خود اس رویے کا شاہد ہوں۔ جامعہ اشرفیہ لاہور میں دیوبندی مکتبِ فکر کی پوری قیادت نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر شدت پسندی کی مخالفت کی اور اس کی مذمت میں باقاعدہ قرارداد منظور کی گئی۔ وہ قرارداد میں نے اور مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے لکھی تھی لیکن تمام کوششوں کے باوجود میڈیا نے اسے کسی عام مدرسے میں ہونے والے جلسے کی طرح نظر انداز کر دیا۔

سوال: کیا آپ کے نزدیک مذہبی جماعتوں کی جانب سے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک، اور بعد ازاں اسلامی جمہوری اتحاد کے قیام کے فیصلے درست تھے؟

جواب: تمام اتحاد اور سبھی فیصلے غلط نہیں تھے۔ البتہ میں آئی جے آئی (اسلامی جمہوری اتحاد) پنجاب کا نائب صدر رہا۔ آئی جے آئی کا تجربہ ٹھیک نہیں تھا اور کامیاب بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک ریموٹ کنٹرول تحریک تھی۔ مذہبی جماعتیں حالات کا صحیح جائزہ نہیں لے سکیں جس کی وجہ سے دوسروں نے تو فائدہ اٹھایا لیکن خود مذہبی جماعتوں کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

سوال: ضیاء دور کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: جنرل ضیاء الحق مرحوم نے بعض اچھے اقدامات بھی کیے لیکن ان کی اپروچ ذاتی سطح

تک ہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ادارے ان کے اقدامات کو سپورٹ نہیں کر سکے۔ دوسری جانب ایک رجحان یہ ہے کہ ان کے کھاتے میں کئی ایسے کام بھی ڈال دیے جاتے ہیں جو ان کی حکومت سے کئی برس پہلے شروع ہوئے تھے۔ مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۷۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ انہوں نے بعض اچھے کام کیے لیکن کئی کام دستور کی سطح پر پہلے طے ہو چکے تھے۔ ہماری افغان پالیسی کی تشکیل بھٹو دور میں ہوئی۔ عالمی میڈیا میں اس حوالے سے تفصیلات سامنے آئی ہیں۔ بھٹو کی بلوچستان میں فوج کشی کا ردعمل افغانستان میں ظاہر ہوا۔ اب چونکہ افغانستان میں مزاحمت مذہبی لوگ کر رہے تھے تو ان کا ساتھ یہاں کے مذہبی لوگوں ہی نے دینا تھا، لیکن اس کا سارا الزام جنرل ضیاء الحق پر ڈال دیا جاتا ہے۔

سوال: آپ کو جن سیاسی قائدین کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ان کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب: سیاسی قیادت میں جن لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ان میں تین بڑی شخصیات نوابزادہ نصر اللہ خان مرحوم، مولانا مفتی محمودؒ، اور مولانا شاہ احمد نورانیؒ نمایاں ہیں۔ ان تینوں راہنماؤں کی قیادت کا خلا پُر نہیں ہوا۔ مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا شاہ احمد نورانی میں اختلاف بھی ہوا لیکن وہ ہمیشہ اہم قومی معاملات میں مشاورت ضرورت کرتے تھے۔

سوال: مولانا نورانیؒ کو دیگر مسالک سے اتحاد کی وجہ سے اپنے ہم مسلک حلقوں میں مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیا مفتی محمودؒ کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا؟

جواب: مولانا مفتی محمودؒ کی مخالفت کی سطح ویسی تو نہیں تھی جس کا سامنا مولانا نورانیؒ کو رہا۔ بلکہ مفتی صاحب سے جب اس معاملے میں بحث ہوتی تھی تو ان کا موقف یہی رہا کہ قومی مشترکہ امور اور سیاست کا مسلک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض اوقات تو بحث کرنے والوں کو چپ کرانے کے لیے وہ یوں بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ ”میں اس طرح کا دیوبندی نہیں ہوں“۔

جہادِ افغانستان اور افغان طالبان

سوال: بعض حلقوں کی جانب سے پاکستان میں شدت پسندی کو سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا تسلسل کہا جاتا

ہے اور ان میں سے اکثر گروپ دیوبندی مکتبِ فکر ہی سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب: یہ تاثر بظاہر تو درست دکھائی دیتا ہے کیونکہ جہادی تحریکیں فکری طور پر خود کو اسی کے ساتھ منسوب کرتی ہیں، اس کا بنیادی سبب میرے خیال میں جہادِ افغانستان ہے۔ روس کی واپسی اور افغان جہاد کی کامیابی کے بعد عالمی طاقتوں نے اس پوری تحریک کو اس کے منطقی نتائج سے محروم کیا، اسی کا ردعمل ہمیں بعد میں شدت پسندی کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ البتہ سید احمد شہیدؒ کے بعد شیخ الہندؒ کے زمانے میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ دیوبند کی تحریک ایک نئی تشکیل کے تحت تعلیمی و تدریسی محنت اور پُرامن سیاسی جدوجہد کے دور سے گزری۔ اس کے بعد ایک محدود دائرہ میں اس کی تشکیلِ نو جہادِ افغانستان کے زمانے میں ہوئی کہ روس کی جارحیت کی وجہ سے وہی پرانے جذبات پھر آ گئے، لیکن جہادِ افغانستان سے ہٹ کر دوسرے معاملات میں مجموعی طور پر دیوبندی حلقوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

سوال: جہادِ افغانستان کو اگر عالمی قوتوں نے منطقی انجام تک نہیں پہنچنے دیا تو کیا مذہبی تحریکوں کا داخلی نظام اتنا کمزور تھا کہ اس کے نتیجے میں ایسے عناصر پیدا ہوگئے جنہوں نے مسلمانوں اور عام شہریوں کی قتل و غارت سے بھی گریز نہیں کیا؟

جواب: یہ لمحہ فکریہ ہے۔ جب جہادِ افغانستان ختم ہوا تو اس وقت میرے اندازے کے مطابق پینتالیس پچاس ہزار پاکستانی مسلح افراد وہاں سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ اس وقت میں نے بہت سی اہم شخصیات بالخصوص مولانا فضل الرحمان، جنرل حمید گل اور مولانا سمیع الحق سے یہ بات کہی تھی کہ یہ قوت اگر کھلی چھوڑ دی گئی تو مسائل پیدا ہوں گے، اس لیے اس قوت کا کوئی مصرف تلاش کریں۔ میں نے مثال بھی دی کہ سندھ میں قیامِ پاکستان کے وقت کوئی سات آٹھ ہزار مسلح حُر موجود تھے جنہیں اس نظام میں ایڈجسٹ کر لیا گیا تھا، ورنہ وہ بھی آج ایک مسئلہ ہوتا۔ جہادِ افغانستان کے موقع پر بھی میرا کہنا یہی تھا کہ اگر اس بے پناہ قوت نے اپنا راستہ خود بنایا تو تباہی آئے گی۔ یہی بات کافی عرصہ بعد ہیلری کلنٹن نے بطور امریکی وزیر خارجہ تسلیم کی کہ ہم سے اس معاملے میں غلطی ہوئی کہ افغان جہاد کے بعد مجاہدین کے گروپوں کو آزاد اور تنہا چھوڑ دیا جس کی وجہ

سے معاملہ بگڑ گیا۔

سوال: افغانستان کے طالبان کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہے؟

جواب: افغانستان کے طالبان سادہ و مخلص لوگ ہیں اور ان کا تعلق نچلے طبقے کے افراد سے ہے۔ انہوں نے افغانستان کی آزادی اور اسلامی تشخص کے لیے مخلصانہ جنگ لڑی ہے لیکن انہیں مناسب سیاسی راہنمائی میسر نہیں آئی۔ جبکہ ان کے قیام کے فوراً بعد القاعدہ کے عنصر کی وجہ سے خرابی بہت تیزی سے بڑھی۔ میں نے اس وقت بہت سے دوستوں سے یہ کہا تھا کہ خدا کے لیے طالبان کو مستحکم ہونے دو اور انہیں کام کے لیے وقت دو، کوئی دوسری لڑائی مت چھیڑو، مگر یہ بات نہیں سنی گئی۔ القاعدہ کی بے وقت تشکیل اور فوری متحرک ہو جانے کی وجہ سے طالبان حکومت مسائل کا شکار ہوئی۔ اُدھر القاعدہ کی سرگرمیوں اور اِدھر پاکستان میں تحریکِ طالبان کی تشکیل نے افغان طالبان کا مشن خراب کر دیا۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ افغانستان میں اگر کوئی پرو پاکستان طبقہ ہے تو وہ طالبان ہے۔ لیکن ہم نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے جس کی وجہ سے تعلقات میں دراڑیں پیدا ہوئیں۔ اور آج افغانستان میں ایسے لوگ برسر اقتدار ہیں جو بھارت کو اپنے ملک میں کھلی چھٹی دے رہے ہیں۔

سوال: مکالمے کے فورم تبدیل ہو رہے ہیں لیکن مذہبی لوگ آج بھی روایتی مناظرانہ انداز میں اپنا موقف پیش کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب: میں یہی کہتا ہوں کہ یہ مکالمے کا دور ہے، مناظرے اور فتوے کی زبان کا نہیں۔ ہمارے دینی حلقے آج بھی سو سال پہلے کی زبان بول رہے ہیں۔ اب فتوے اور مناظرے کی بجائے باہمی مکالمے کو فروغ دینے کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کی صورتحال

سوال: مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ صورتحال کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: ایران نے انقلاب کے بعد اسے اپنی ملکی حدود میں رکھنے کی بجائے اس کے اثرات کو

دیگر ممالک تک پہنچانے اور پورے مشرق وسطیٰ کو کنٹرول کرنے کی کوششیں کیں، آج کے حالات اسی کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے ہاں پاکستان میں بھی جب یہ کوششیں شروع ہوئیں تو ردعمل میں تنظیمیں بنیں۔ یہی ردعمل بحرین، کویت اور عراق میں سامنے آیا۔

سوال: یہی الزام سعودی عرب پر بھی تو لگایا جاتا ہے۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب: سعودی عرب نے سلفی فکر کو حنفیوں اور اخوانیوں کے مقابلے میں آگے بڑھایا، ایران کے مقابلے پر نہیں۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ مالی امداد ہی دیتے ہیں، جبکہ یہ تو سب کچھ ہی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ سعودی عرب کے پاس صرف پیسے ہی ہیں، انہوں نے پورے عالمِ اسلام کو سنبھالنے کے لیے کئی ایسے اقدامات کیے جن کے مثبت اثرات مرتب نہیں ہوئے، لیکن اب وہ کچھ پالیسیوں پر نظر ثانی کر رہے ہیں مگر بہت تاخیر سے ایسا ہو رہا ہے۔

سوال: مشرقِ وسطیٰ کے حالات کے تناظر میں فرقہ وارانہ انتشار کو روکنے کے لیے کیا اقدامات کرنے کی ضرورت ہے؟

جواب: او آئی سی (اسلامی تعاون تنظیم) کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اسے اب گہری نیند سے جاگنا ہوگا۔ اس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ ایک شیعہ سنی لڑائی جبکہ دوسرا عالمی استعمار کے مفادات۔ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے او آئی سی کے پلیٹ فارم سے سعودیہ اور ایران کو اپنی اپنی حدود میں لانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہم تو صرف اپیل ہی کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

دعوت و تبلیغ

سوال: کیا آپ کے نزدیک عبادات کی جانب راغب کرنے اور معاشرتی اصطلاحات کے لیے کام کرنے والی تبلیغی جماعت اور دعوتِ اسلامی جیسی تنظیموں کی کوششیں کامیاب ہو رہی ہیں؟

جواب: دین کے ساتھ فرد کا تعلق قائم کرنے کی حد تک تو یہ لوگ کامیاب ہیں۔ اس لیے کہ جو فرد بھی ان کے ماحول میں آجاتا ہے اس کا تعلق نماز، روزے اور مسجد سے جڑ جاتا ہے اور وہ کئی برائیوں سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اجتماعیت کی فکر دینے کی طرف متوجہ نہیں ہیں اور میرے

خیال میں یہ ان کا کام بھی نہیں ہے۔ یہ دراصل علماء اور مراکز کا کام ہے۔ دعوتِ اسلامی ہو یا تبلیغی جماعت، یہ ایک شخص کو مسجد میں لے آتے ہیں اور اس کے لیے بڑی محنت کرتے ہیں، لیکن آگے سنبھالنا تو امام صاحب کا کام ہے کہ وہ اس شخص کی مزید تربیت کریں لیکن ایسا نہیں ہو پاتا، بہرحال وہ لوگ تو اپنا کام کر ہی رہے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کی اہمیت وضرورت

سوال: دینی حلقے میڈیا کو کئی مسائل کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ کیا علماء کا طبقہ میڈیا کی آزادی اور اس کے بڑھتے ہوئے رسوخ کے حوالے سے اپنی تیاری مکمل نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں؟

جواب: اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ مذہبی طبقات کو میڈیا میں اپنی نمائندگی اور موقف پیش کرنے کے لیے منصوبہ بندی اور تربیت کی ضرورت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں اسے آزاد میڈیا نہیں مانتا۔ اسے بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کنٹرول کر رہی ہے اور یہ اسی کی پالیسی کے مطابق چلتا ہے۔ مثلاً یہ پالیسی کے تحت کیا گیا ہے کہ کسی خالص مذہبی اور قومی مسئلے پر ایک جانب سے تیاری کر کے لوگوں کو بلایا جاتا ہے جبکہ مذہبی طبقے کی نمائندگی کے لیے جان بوجھ کر ایسے لوگ بلائے جاتے ہیں جو اپنا موقف بیان نہیں کر پاتے۔ یہاں کراچی میں میرے سامنے ایک مرتبہ ایسا ہوا۔ ایک چینل میں اس موضوع پر بحث رکھی گئی کہ اسلامائزیشن کا کوئی ہوم ورک بھی ہے یا نہیں، یا صرف اسلامی نظام کے نفاذ کا شور ہی مچا رکھا ہے؟ اس گفتگو میں مجھے بھی بلایا گیا لیکن سوال وہاں بیٹھے ایک ایسے صاحب سے کیا گیا جنہیں اسلامائزیشن کی الف بے بھی معلوم نہیں تھی۔ میں نے میزبان سے کہا کہ اس کا جواب میں دوں گا لیکن وہ ٹالنے کی کوشش کرتے رہے۔ پروگرام لائیو تھا، میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ عرض یہ ہے کہ ایسا باقاعدہ پالیسی کے تحت ہوتا ہے کہ مذہبی فکر کو یا تو بالکل دبا دیا جائے یا جان بوجھ کر ایسے انداز میں پیش کیا جائے کہ قابلِ قبول نہ رہے۔

جمعیت طلباء اسلام اور جمعیت علماء اسلام سے میرا تعلق

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۲۰۱۶ء)

(جمعیت طلباء اسلام پاکستان کے سابق راہنما رانا شمشاد علی خان کا سوالنامہ)

سوال: کیا آپ کبھی جمعیت طلباء اسلام کے ساتھ منسلک رہے؟ آپ کا جمعیت طلباء اسلام سے کیا تعلق تھا؟

سوال: جمعیت طلباء اسلام سے آپ کی وابستگی کے خدوخال کیا تھے؟

جواب: جمعیت طلباء اسلام کے ساتھ میرا تعلق طالب علمی کے زمانے سے ہوگیا تھا۔ میں اس سے قبل جمعیت علماء اسلام کے ساتھ ۱۹۶۲ء سے وابستہ تھا، گوجرانوالہ شہر کا سیکرٹری اطلاعات اور سرگرم کارکن تھا۔ جمعیت طلباء اسلام قائم ہوئی تو میں اس کے گوجرانوالہ یونٹ کا نائب صدر بنا۔ مولانا حافظ عزیز الرحمٰنؒ صدر تھے اور میاں محمد عارف ایڈووکیٹ مرحوم سیکرٹری تھے۔ جمعیت طلباء اسلام میں باقاعدہ شامل ہونے پر میں نے جمعیت علماء اسلام کے سیکرٹری اطلاعات کے عہدہ سے استعفٰی دے دیا اور اس کا اخبارات میں اعلان بھی کیا۔ اس کی اخباری خبر پر حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ نے غالباً قصور میں ایک ملاقات کے موقع پر ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ یہ ایک تنظیمی سی بات تھی اس کا اخبارات میں اعلان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے اس پر خاموشی اختیار کر لی اور مثبت یا منفی کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا۔ البتہ طالب علمی کے دور میں جمعیت طلباء اسلام کے ساتھ ہی کام کرتا رہا جبکہ ۱۹۶۹ء میں دورۂ حدیث سے فراغت اور مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ کی نیابت کا منصب سنبھالنے کے بعد پھر سے جمعیت علماء اسلام میں متحرک ہوگیا اور ضلعی سیکرٹری اطلاعات بنا دیا گیا۔ اس دوران لاہور

جامعہ رحمانیہ قلعہ گوجرسنگھ میں حضرت مولانا محمد اجمل خانؒ کی سرپرستی میں منعقد ہونے والی جے ٹی آئی کے بھرپور اجلاس میں شریک ہوا، گوجرانوالہ کے متعدد اجتماعات کے انتظام میں شریک رہا اور مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیا جن کی تفصیلات اس وقت ذہن میں نہیں ہیں۔

سوال: جمعیت طلباء اسلام کا تحریک نظام مصطفیؐ، تحریک جمہوریت، تحریک ختم نبوت میں کیا کردار رہا؟

جواب: ۱۹۷۲ء میں گورنر پنجاب غلام مصطفیٰ کھر کے بعض اقدامات کے خلاف چلائی گئی تحریک جمہوریت بلکہ اس سے قبل ایوب خان اور یحییٰ خان کے خلاف مختلف مواقع پر جمہوری اقدار کی بحالی کے لیے جدوجہد میں جے ٹی آئی کا سرگرم کردار تھا۔ اور اس کے کارکنوں نے جلسوں اور جلوسوں کے انتظامات کے علاوہ پولیس تشدد اور گرفتاریوں کا بھی سامنا کیا۔ ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت اور ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰ میں بھی جے ٹی آئی کا نمایاں کردار تھا۔ جلوسوں، جلسوں، گرفتاریوں اور رائے عامہ کو منظم کرنے کے لیے مختلف زاویوں سے اس نے محنت کی اور قربانیاں دیں۔

سوال: کیا جمعیت طلباء اسلام کی قیادت نے کالجز اور مدارس کے طلبہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ملاں اور مسٹر کے فرق کو ختم کیا، اور کہاں تک کامیاب رہی؟

جواب: میرے نزدیک جی ٹی آئی کی جدوجہد کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ اس نے کالجز اور مدارس کے طلبہ کو ایک فورم پر مجتمع کر کے مسٹر اور ملا کے فرق کو ختم کرنے کی اپنے وقت میں کامیاب کوشش کی۔ اور کالج و یونیورسٹی کے ماحول میں طلبہ کی سیاست پر اسلامی جمعیت طلباء اور اس کے مقابلہ میں بائیں بازو کی طالب علم تنظیموں کی شدت کے ساتھ بڑھتی ہوئی کشمکش بلکہ تصادم میں تیسرے اور متوازن گروپ کا کردار ادا کیا۔ اس سے اسلام کی ترجمانی کے حوالہ سے اسلامی جمعیت طلباء کی عام طور پر سمجھی جانے والی اجارہ داری کو بریک لگی اور بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں اور گروپوں کی آزاد خیالی بلکہ آزادروی کا راستہ بھی روکا جا سکا۔ دائیں بازو اور بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں میں اس وقت کشمکش اور تصادم کی جو فضا قائم ہو گئی تھی، جے ٹی آئی نے اس میں ''بیلنس پاور'' کا کردار ادا کیا جسے خدا جانے کس کی نظر لگی کہ وہ اپنا یہ کردار زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکی۔

سوال: جمعیت طلباء اسلام اور جمعیت علماء اسلام کا آپس میں کیا تعلق تھا؟

سوال: جمعیت طلباء اسلام غیر سیاسی طلبہ تنظیم تھی اور اپنے فیصلے اپنی شوریٰ میں کرنے کی مجاز تھی تو پھر جمعیت علماء اسلام کی مداخلت کیوں ہوئی؟

سوال: جمعیت علماء اسلام کی مداخلت سے جمعیت طلباء اسلام کا شیرازہ بکھرا، ملاں اور مسٹر کی تفریق از سر نو پروان چڑھی؟

جواب: جمعیت طلباء اسلام دستوری اور تنظیمی طور پر ایک الگ اور غیر سیاسی تنظیم تھی جس کا دائرہ کار بھی مستقل اور امتیازی تھا۔ البتہ اس کے لیے جمعیت علماء اسلام کی قیادت کی سر پرستی ضروری سمجھی گئی جو عملاً قائم بھی ہوگئی لیکن مسلسل تحریکات میں باہمی میل جول اور مشترکہ اقدامات کی وجہ سے یہ دستوری امتیاز نمایاں نہ رہا اور ''من تو شدم تو من شدی'' کا ماحول قائم ہوگیا۔ اصولی طور پر یہ تعلق سر پرستی کا ہی تھا اور بظاہر استاد شاگرد جیسا تھا مگر عملی ماحول ۔۔۔ سیاسی و دینی تحریکات میں جے ٹی آئی کی مسلسل شرکت اور قربانیوں کے باعث یہ تاثر قائم نہ رہ سکا جس سے اس غلط فہمی نے جنم لیا کہ جے ٹی آئی کی قیادت جے یو آئی کی قیادت کو محض سر پرست سمجھنے لگی، جبکہ جے یو آئی کی قیادت نے اسے اپنی ذیلی جماعت تصور کرلیا۔ اس بنیاد پر باہمی بُعد بڑھتا گیا جسے کم کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی اور جے ٹی آئی خلفشار کا شکار ہوگئی۔

جے ٹی آئی کے فکری اور تحریکی رخ کو اپنے مجموعی ماحول اور مفاد کے منافی تصور کرتے ہوئے جے یو آئی کی قیادت نے مداخلت کی۔ میں بھی جمعیت علماء اسلام کا ایک سرگرم کردار تھا، اس لیے ظاہر بات ہے کہ میں بھی اس اقدام کا حصہ تھا۔ اسے تنظیمی اور دستوری طور پر محل نظر کہا جا سکتا ہے لیکن ملک بھر کے عمومی ماحول اور جمعیت علماء اسلام کے فورم پر دینی و سیاسی تحریکات میں جے ٹی آئی کی مسلسل اور بھرپور شرکت سے قائم ہونے والا تاثر دستوری اور تنظیمی معاملات پر غالب رہا اور

اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا

جہاں تک مسٹر اور ملا کی تفریق کے عود کر آنے کی بات ہے یہاں تک درست ہے کہ اس تفریق کو مٹانے کے لیے جو ایک سنجیدہ کوشش ہوئی تھی اور جس کے اثرات بھی دکھائی دینے لگے تھے، اس

کا راستہ رک گیا۔ اس کی ذمہ داری کسی پر بھی ہو بہرحال یہ ایک دینی اور قومی نقصان ہے جس کی تلافی کے لیے اس کے بعد کوئی راستہ بھی اختیار نہیں کیا گیا جو دوہرے نقصان کے مترادف ہے۔

سوال: مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت درخواستیؒ کے مولانا ہزارویؒ سے کیا اختلافات تھے؟ مولانا ہزارویؒ کے اخراج کے وقت دو مختلف قراردادیں لکھی گئیں، اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب: مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، مولانا مفتی محمودؒ، اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ کے مابین اختلافات کو میرے مطالعہ ومشاہدہ کی رو سے دو تین الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ حضرت مولانا ہزارویؒ دوسری سیاسی پارٹیوں بالخصوص جماعت اسلامی کے ساتھ میل جول کو ایک حد سے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ جبکہ مولانا مفتی محمودؒ دینی وقومی مقاصد کے لیے دینی وسیاسی جماعتوں کے متحدہ محاذ کے قیام کے ہر دور میں خواہاں رہے ہیں۔ اس کا آغاز ایوب خان مرحوم کے دور میں جمہوری مجلس عمل سے ہوا اور ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد تک پہنچا۔ اس دوران دوسری سیاسی ودینی جماعتوں کے ساتھ نصف درجن سے زیادہ مشترکہ فورم بنے جن میں سے بعض میں حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ بھی وقتی ضرورت سمجھ کر شریک ہوئے مگر یہ بات ایک مستقل پالیسی کے طور پر ان کے لیے قابل قبول نہیں تھی اس لیے وہ اس رخ پر زیادہ دیر تک ساتھ نہیں چل سکے۔

تنظیمی ماحول میں جب مشرقی پاکستان میں حضرت مولانا پیر محسن الدین احمدؒ کی سربراہی میں جمعیت علماء اسلام کے قیام کے بعد مرکزی سطح پر ''کل پاکستان جمعیت علماء اسلام'' تشکیل پائی تو اس کا ناظم عمومی حضرت مولانا مفتی محمودؒ کو منتخب کیا گیا۔ جبکہ یہ حیثیت اس سے قبل جمعیت علماء اسلام مغربی پاکستان میں حضرت مولانا ہزارویؒ کو حاصل تھی اور مولانا مفتی محمودؒ مرکزی نائب امیر تھے۔ ون یونٹ کے خاتمہ کے بعد مغربی پاکستان کی سطح پر جمعیت علماء اسلام کا وجود ختم ہو گیا اور وہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان میں تقسیم ہو گئی تو حضرت مولانا ہزارویؒ کی پوزیشن کل پاکستان جمعیۃ میں مولانا مفتی محمودؒ کے نائب کے طور پر ایک مرکزی ناظم کی بن گئی۔ چونکہ دونوں بزرگوں کے سیاسی مزاج اور ترجیحات میں ایک فرق موجود تھا جس کا سطور بالا میں تذکرہ کیا گیا ہے تو عام

جماعتی حلقوں میں اس فرق کے اثرات محسوس کیے جانے لگے۔

اسی تسلسل میں جب حضرت مولانا مفتی محمودؒ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تو جمعیۃ کے اندر یہ رجحان سامنے آیا کہ مفتی صاحبؒ کو جماعتی عہدہ چھوڑ دینا چاہیے جوانہوں نے مجلس شوریٰ کے ایک اجلاس کے بعد چھوڑ دیا۔ اور حضرت مولانا ہزارویؒ کو مرکزی ناظم عمومی چن لیا گیا جس پر جمعیۃ کے اندرونی حلقوں میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ حضرت مفتی صاحبؒ اور حضرت مولانا ہزارویؒ کے رجحانات میں فرق کی وجہ سے اس طرح جمعیۃ خلفشار کا شکار ہو جائے گی۔ چنانچہ مجلس عمومی کے اجلاس میں مفتی صاحبؒ کو دوبارہ ناظم بنا دیا گیا، میرے خیال میں یہ بات بھی باہمی بُعد میں اضافہ کا باعث بنی اور پھر فاصلے بڑھتے چلے گئے۔

تیسرا سبب میرے خیال میں یہ ہے کہ صوبہ سرحد میں وزارت اعلیٰ کے حوالہ سے جس طرح بات آگے بڑھی وہ بھی ان اختلافات میں توسیع کی وجہ بن گئی۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں جمعیت علماء اسلام نے صوبہ سرحد کی اسمبلی میں چند سیٹیں حاصل کیں مگر خان عبدالولی خان اور خان عبدالقیوم خان کے مابین سیاسی اختلاف کی شدت کے ماحول میں وہ چار یا پانچ سیٹیں صوبائی حکومت کی تشکیل کے لیے بیلنس پاور اور بادشاہ گر کی حیثیت اختیار کر گئیں۔ خان عبدالقیوم خان کی مسلم لیگ اور خان عبدالولی خان کی نیشنل پارٹی دونوں کی یکساں کوشش تھی کہ جمعیت علماء اسلام ان کا ساتھ دے تاکہ ان کی حکومت بن جائے یا کم ازکم ان کی حریف پارٹی کی حکومت نہ بن سکے۔ دونوں ایک دوسرے سے خائف تھیں جس کی وجہ سے دونوں پارٹیاں ساتھ دینے کی صورت میں جمعیۃ کی ہر شرط ماننے کو تیار تھیں۔ اس کشمکش میں مفتی صاحبؒ کا رجحان واضح طور پر خان عبدالولی خان کی طرف تھا جبکہ مولانا ہزارویؒ خان عبدالقیوم خان کے ساتھ کولیشن کے خواہاں تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بات کو شامل کر لیں کہ مفتی صاحبؒ کی پالیسی صوبہ میں حکومت بنانے اور مرکز میں بھٹو حکومت کے مقابلہ میں اپوزیشن کا کردار ادا کرنے کی تھی۔ جبکہ مولانا ہزارویؒ مرکز میں بھٹو حکومت کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے اور اپوزیشن بالخصوص جماعت اسلامی کے ساتھ کسی قسم کی کولیشن کے حق میں نہیں تھے۔ اس میں ایک اور بات کا اضافہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اس وقت افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف افغان مجاہدین کی عسکری مزاحمت منظّم نہیں ہوئی تھی مگر اس کی

شروعات ہو چکی تھی اور اس کے مسلسل آگے بڑھنے کے رجحانات نمایاں تھے۔ اس کے بارے میں مولانا مفتی محمودؒ اور حضرت درخواستیؒ کا رجحان بالکل واضح تھا کہ وہ اس مزاحمت کے حق میں تھے اور اسے شرعی جہاد سمجھتے تھے۔ جبکہ مولانا ہزارویؒ اس جہاد اور مزاحمت کو سپورٹ کرنے کے حق میں نہیں تھے اور اسے خطہ میں امریکی عزائم کی تکمیل میں معاونت تصور کرتے تھے۔

اس مسئلہ پر حضرت مولانا ہزاروی کے ساتھ میری طویل خط و کتابت ہوئی تھی جس کی میں نے ایک عرصہ تک تاریخی دستاویز سمجھ کر حفاظت کی مگر بدقسمتی سے گزشتہ تین چار سال سے تلاش بسیار اور بار بار تگ و دو کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے؟ فیا اسفاہ۔

حضرت مولانا مفتی صاحبؒ اور حضرت مولانا ہزارویؒ کے درمیان اختلافات کی خلیج کو وسیع ہوتے ہوئے میں نے خود دیکھا اور میں نے حضرت مولانا ہزارویؒ کی تمام تر محبت وعقیدت اور ادب واحترام کے باوجود میں اس معاملہ میں حضرت درخواستیؒ اور مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ تھا۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خود میرے ذہنی رجحانات بھی یہی تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے چند بزرگوں مثلاً حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ، حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ، اور حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتیؒ کا ذہنی جھکاؤ بھی اسی طرف تھا۔

> سوال: کیا یہ درست ہے کہ حضرت مولانا درخواستیؒ غیر سیاسی شخصیت تھے، انہوں نے جمعیت علماء اسلام کے پلیٹ فارم کو استعمال کرکے پیری مریدی کو زیادہ پروان چڑھایا؟

جواب: حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ کو میں غیر سیاسی شخصیت نہیں سمجھتا اس لیے کہ میں نے ان کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارا ہے اور بعض اہم قومی مسائل پر ان کی رائے کو ٹھوس اور دو ٹوک پایا ہے جو بعد میں بھی درست ثابت ہوئی۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ صدر ضیاء الحق مرحوم کی کابینہ میں شمولیت کے حق میں نہیں تھے جس کا انہوں نے برملا اظہار کیا تھا لیکن چونکہ یہ فیصلہ ان کی غیر موجودگی میں مرکزی شوریٰ کر چکی تھی اس لیے انہوں نے ناراضگی کے اظہار کے باوجود خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اسی طرح کا تاثر مولانا عبید اللہ انورؒ کے بارے میں بھی دیا جاتا ہے

جو درست نہیں ہے۔ وہ وسیع سیاسی مطالعہ رکھتے تھے اور رائے کا اظہار بھی کرتے تھے۔ مثلاً جب جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے صدر فضل الٰہی چودھری مرحوم کو سبکدوش کر کے خود صدارت سنبھال لی تو شیرانوالہ لاہور میں ایک صحافی نے حضرت مولانا مفتی محمودؒ سے جو اس وقت پاکستان قومی اتحاد کے صدر تھے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ مفتی صاحبؒ نے اس پر ایک مختصر جملہ کہا کہ ''یہ روٹین کی کاروائی ہے''۔ اس صحافی کے چلے جانے کے بعد حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ نے مفتی صاحبؒ سے کہا کہ یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے؟ یہ روٹین کی کاروائی نہیں ہے بلکہ ایسا معاملہ ہو گیا ہے کہ ہاتھوں سے دی ہوئیں گرہیں اب دانتوں سے بھی نہیں کھلیں گی۔

حضرت درخواستیؒ کو حضرت لاہوریؒ کے بعد علماء کرام نے متفقہ طور پر اپنا امیر چنا تھا، ان کا مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا لیکن ان کے ہاں پیری مریدی کو فروغ دینے یا اسے ایک خانقاہی نظام کے طور پر منظّم کرنے کا کوئی نظم اس طرح کا موجود نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان کی طرف سے یا ان کے قریبی ساتھیوں کی طرف سے لوگوں کو مرید بنانے کی کوئی مہم چلائی جاتی تھی جیسی کیمپین اور اہتمام ان کے بعض معاصر حلقوں میں صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا کہ حضرت درخواستیؒ نے جمعیۃ کی امارت کو اپنے مریدوں کا حلقہ وسیع کرنے کے لیے استعمال کیا، ایک نیک دل بزرگ کے بارے میں بدگمانی پیدا کرنے کے ساتھ حقائق کے بھی منافی ہے۔ جبکہ میرے خیال میں اگر حضرت درخواستیؒ پر جماعتی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو ان کے مریدوں کا حلقہ اس سے کہیں زیادہ وسیع اور ان کا خانقاہی سلسلہ بہت منظّم اور مربوط ہوتا۔

سوال: کیا یہ درست ہے کہ مفتی محمودؒ مذہبی حلقوں کے ہاتھوں یرغمال تھے کیونکہ مذہبی حلقوں پر درخواستی صاحبؒ اثر رکھتے تھے۔ مفتی صاحبؒ کے قریب آکر جماعت اسلامی نے اپنی...... کر دی۔

جواب: میرے خیال میں یہ تصور ہی مضحکہ خیز ہے کہ ''مولانا مفتی محمودؒ مذہبی حلقوں کے ہاتھوں یرغمال بنے''۔ مفتی صاحبؒ خود ایک ممتاز مذہبی راہنما، شیخ الحدیث، استاذ العلماء اور شب زندہ دار بزرگ تھے۔ وہ علمی و دینی معاملات میں علماء کے لیے راہنما کی حیثیت رکھتے تھے اور بہت سے مذہبی مسائل میں ان کی رائے کو ایک معتمد علمی شخصیت کی رائے کے طور پر لیا جاتا تھا۔ اس کی بجائے

اگر یہ کہا جائے تو زیادہ قرین قیاس بات ہوگی کہ مولانا مفتی محمودؒ نے اپنی بھاری بھرکم علمی اور مذہبی شخصیت کے باعث ملک کے مذہبی ماحول کو بہت سی تبدیلیوں سے روشناس کرایا۔

حضرت درخواستیؒ کے بارے میں یہ کہنا سراسر زیادتی ہے کہ ان کا مذہبی اثر ورسوخ مولانا مفتی محمودؒ کو جماعت اسلامی کے قریب لانے کا باعث بنا۔ اس لیے کہ جماعت اسلامی کے ساتھ بہت سے اہم اتحادوں میں شمولیت کے باوجود حضرت درخواستیؒ نے جماعت اسلامی کے ساتھ ہمیشہ اپنا فاصلہ قائم رکھا اور ان کا یہ طرز عمل آخر دم تک سب کے سامنے رہا۔

سوال: ایسی صورتحال میں حضرت لاہوریؒ کے جانشین حضرت عبید اللہ انورؒ نے اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال کر کے اس خلفشار کو کہاں تک کم کیا یا ان کا کیا کردار رہا؟

جواب: حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ میرے شیخ ومربی تھے اور مجھے ان کی شفقت اور اعتماد ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ وہ جماعتی معاملات میں حضرت درخواستیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ تھے اور ہر موقع پر انہیں سپورٹ کرتے تھے۔ البتہ اختلافات میں شدت پسندی کے حق میں نہیں تھے اور بزرگوں کا ادب واحترام نہ صرف قائم رکھتے تھے بلکہ اس کی تلقین کیا کرتے تھے۔

سوال: جمعیت طلباء اسلام کی انتہائی اہم شخصیت میاں محمد عارف اور آپ کے درمیان گہرے تعلقات تھے۔ ۱۹۷۶ء میں آپ کے درمیان اہم رابطے ہوئے اور مشاورت ہوئی، آپ کس قسم کی تبدیلی جمعیت طلباء اسلام میں چاہتے تھے؟

جواب: میاں محمد عارف ایڈووکیٹ مرحوم میرے طالب علمی کے دور کے ساتھی اور دوست تھے۔ میرا ان کے ساتھ یہ تعلق کم وبیش سبھی مراحل میں قائم رہا۔ اکثر وبیشتر معاملات میں ہم باہمی مشورہ کے ساتھ اپنا موقف اور لائحہ عمل طے کرتے تھے جبکہ بعض معاملات میں ہمارے درمیان اختلاف بھی ہوا۔ ۱۹۷۶ء کے معاملات میں ہم دونوں جمعیت علماء اسلام کی مرکزی قیادت کے ساتھ تھے اور حضرت درخواستیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے موقف اور پالیسی پر عملدرآمد میں ہم دونوں نے بھرپور کوشش کی تھی۔ ہمارا اپنا کوئی ایجنڈا نہیں تھا، جو کچھ بزرگ طے کرتے تھے ہم اسی پر

عمل کرتے تھے۔

سوال: جمعیت علماء اسلام اور مولانا سعید احمد رائے پوریؒ جمعیت طلباء اسلام کی سرپرستی کے دعوے دار تھے، حقیقت کیا تھی؟

جواب: جمعیت علماء اسلام کے اکابر اور حضرت مولانا سعید احمد رائے پوریؒ ایک دور میں دونوں ہی جمعیت طلباء اسلام کے سرپرست تھے اور دونوں کی سرپرستی میں جے ٹی آئی کچھ عرصہ کام کرتی رہی ہے۔ حضرت مولانا رائے پوریؒ کی سرپرستی عملی اور متحرک تھی اس لیے اس کی چھاپ نمایاں تھی لیکن بعض فکری مسائل میں ان کی انفرادی آرا جب سامنے آنا شروع ہوئیں تو فرق وامتیاز نظر آنے لگا۔ وہی معاملات بعد میں فکری اختلافات کا رنگ اختیار کر گئے اور یہ فرق وامتیاز باقاعدہ تفریق میں بدل گیا جو آج سب کے سامنے ہے۔

سوال: مولانا سعید احمد رائے پوریؒ اور حضرت درخواستیؒ کے درمیان وجہ تنازعہ کیا تھی؟

جواب: میرے خیال میں حضرت درخواستیؒ اور مولانا رائے پوریؒ کے درمیان کوئی ایسا تنازعہ موجود نہیں تھا جسے ان کے درمیان شخصی تنازعہ کا عنوان دیا جا سکے۔ حضرت درخواستیؒ اور ان کے رفقاء کی پالیسی ترجیحات سے مولانا رائے پوریؒ کی پالیسی ترجیحات مختلف تھیں جسے حضرت درخواستی کے ساتھ ان کے تنازعہ کا عنوان دینا درست نہیں ہوگا۔

سوال: مرکزی صدر محمد اسلوب قریشی کی آپ کی نظر میں کیا کارکردگی تھی، کیا انہوں نے اپنی جماعتی ذمہ داریاں دستور کے مطابق ادا کیں؟

جواب: جناب محمد اسلوب قریشی کو میں ایک مخلص، مدبر اور سنجیدہ راہنما سمجھتا ہوں، ان کے بارے میں ہر مرحلہ پر میری رائے یہی رہی ہے۔ اور کسی بھی اختلاف کے باوجود مجھے ان کے خلوص، محنت اور للّٰہیت کے بارے میں بحمد اللہ کبھی تردد نہیں ہوا۔

سوال: آپ نے پہلے مفتی محمودؒ اور حضرت درخواستیؒ کے اختلاف پر مفتی محمودؒ کا ساتھ دیا، بعد ازاں مولانا سمیع الحق گروپ میں فعال کردار ادا کیا، اب پاکستان شریعت کونسل بنا لی، کیوں؟

جواب: کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولانا درخواستیؒ اور مولانا مفتی محمودؒ کے درمیان کوئی ایسا اختلاف ہوا ہو کہ ان میں سے کسی کا الگ طور پر ساتھ دینے کی ضرورت پڑی ہو۔ دونوں بزرگ ہمیشہ اکٹھے رہے ہیں۔ البتہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد جمعیت علماء اسلام جب درخواستی اور فضل الرحمٰن گروپ میں تقسیم ہوئی تو میں درخواستیؒ گروپ میں تھا اور اس کا ایک فعال کردار تھا۔ لیکن جب ان دونوں گروپوں میں صلح ہوئی اور متفقہ طور پر حضرت درخواستیؒ کو امیر اور مولانا فضل الرحمٰن کو سیکرٹری جنرل چنا گیا تو میں متحدہ جمعیۃ میں تھا اور اس کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات رہا۔ اور اب بھی ایک عام رکن کے طور پر اسی جمعیۃ میں ہوں۔ مولانا درخواستیؒ اور مولانا فضل الرحمٰن کے درمیان اتحاد کے بعد مولانا سمیع الحق نے سمیع الحق گروپ کے نام سے جمعیت علماء اسلام کا جو گروپ قائم کیا میں کبھی اس کا حصہ نہیں رہا۔ پاکستان شریعت کونسل کوئی مستقل جماعت نہیں بلکہ محض ایک علمی و فکری فورم ہے جس میں علمی، نظریاتی اور فکری جدوجہد سے دلچسپی رکھنے والے حضرات شامل ہیں اور ان کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق ہونا شرط نہیں ہے۔

سوال: آپ ''ترجمان اسلام'' کے ایڈیٹر تھے جسے آپ سے لے کر جمعیت طلباء اسلام کے حوالے کیا گیا، کیوں؟ تفصیلات کیا تھیں؟

جواب: میں ہفت روزہ ترجمان اسلام کا مدیر رہا مگر اس کے انتظامات کو پورا وقت نہ دے سکنے کی وجہ سے بہتر طور پر نہیں چلا سکا تھا اس لیے یہ انتظام جے ٹی آئی کے حوالہ کر دیا گیا تھا جس پر نہ اس وقت مجھے کوئی اشکال تھا اور نہ ہی اب اس کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔

سوال: ۱۹۷۶ء میں جمعیت طلباء اسلام کے انتشار کے بعد آپ کے خیال میں جمعیت طلباء اسلام کا ماضی، حال اور مستقبل کیا ہے؟

سوال: کیا مستقبل میں کوئی ایسی کوشش ہو سکتی ہے کہ جمعیت طلباء اسلام کے حالات پر ۱۹۷۶ء پر چلے جائیں؟

سوال: کیا آج بھی کوئی ایسی صورت بنتی ہے کہ پرانے اور نئے ساتھیوں کو کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جا سکے؟

جواب: جمعیت طلباء اسلام میں خلفشار اور باہمی کشمکش کے باعث ہم دینی مدارس اور کالجوں کے طلبہ کے ایک مشترکہ فورم سے محروم ہوگئے ہیں اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ایک خواب کی جو تعبیر عملاً دکھائی دینے لگی تھی وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی ہے جسے میں **"کالتی نقضت غزلها من بعد قوة انکاثا"** سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اس کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالنے کی بجائے اس کے وسیع تر نقصانات کو مشترکہ طور پر محسوس کر کے اس کی تلافی کی کوئی صورت نکالنی چاہیے۔ میری رائے یہ ہے کہ پرانے نظریاتی ساتھی کسی وقت اکٹھے ہوں، سر جوڑ کر بیٹھیں اور ماضی کو ضرورت سے زیادہ کریدتے رہنے کی بجائے موجودہ صورتحال کا جائزہ لیں اور شیخ الہندؒ کے افکار و پروگرام کو بنیاد بنا کر مستقبل کی صورت گری کا کوئی بنیادی خاکہ ضرور تجویز کر دیں۔ خود تو ظاہر ہے کہ وہ اب کچھ نہیں کر سکیں گے مگر نئی نسل کو اپنی راہ متعین کرنے میں کچھ نہ کچھ معاونت مل ہی جائے گی۔

سوال: کیا یہ درست ہے کہ جمعیت علماء اسلام اور مدارس عربیہ میں موروثیت عروج پر ہے؟

جواب: خاندانی موروثیت ہمارے برصغیر کے علمی و روحانی حلقوں میں روایتی طور پر چلی آرہی ہے اور اگر اہلیت ہو تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ البتہ محض خاندانی نسب کو موروثیت کی بنیاد بنانا درست نہیں ہے جو آج کل عام ہو رہی ہے اور اس کے منفی اثرات بھی سامنے آرہے ہیں۔ اس کی وجہ پاکستان میں کسی علمی و روحانی مرکزیت کا فقدان ہے جو نگرانی اور راہنمائی کا کردار ادا کر سکے۔ نفسا نفسی کا دور ہے اور کسی مرکزیت کو تسلیم کرنے کی بجائے اپنی اپنی مرکزیت قائم کرنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے، آمین یارب العالمین۔

سوال: آپ کی تصانیف کون کون سی ہیں، ان میں اہم موضوعات کونسے ہیں؟

جواب: میرا تصنیف و تالیف کا سرے سے ذوق ہی نہیں ہے۔ شروع سے ہی مضمون نویسی کی عادت ہے، مختلف جرائد اور اخبارات میں گزشتہ نصف صدی کے دوران بحمد اللہ تعالیٰ ہزاروں مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں سے بہت سے مضامین اور کالم کتابی مجموعوں کی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جبکہ میرا چھوٹا بیٹا حافظ ناصر الدین ان دنوں ایک مستقل ویب سائٹ

zahidrashdi.org پر میرے مضامین مرتب صورت میں پیش کرنے کے لیے محنت کر رہا ہے اور بہت سے مضامین اس ویب سائٹ پر شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر باغبانپورہ لاہور نے میرے منتخب خطبات ’’خطبات راشدی‘‘ کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیے ہیں جنہیں دوستوں نے خاصا پسند کیا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

سوال: آپ مرکزی ناظم انتخابات تھے، رحیمیہ والوں کا اعتراض (ہے کہ) آپ (کی) نگرانی (میں) ۱۰۰ کے قریب ووٹ جعلی تھے۔ قاری نور الحق قریشی کو دانستہ طور پر ناظم چنوایا گیا۔

جواب: میں اس قسم کے اعتراضات والزامات خاموشی کے ساتھ سہہ جانے کا عادی ہوں اس لیے اس پر بھی صرف اتنا ہی عرض کر سکوں گا کہ

کریدتے ہو جو اَب خاک جستجو کیا ہے؟

تحریکِ آزادی، قائداعظم اور علماء کرام

(یوٹیوب چینل ''کے ٹی وی آفیشل'' کا انٹرویو)

سوال: زاہد الراشدی صاحب! ہمیں یہ بتائیے کہ قیام پاکستان کے حوالے سے یہ جو ہمارا مذہبی طبقہ ہے خصوصاً علماء، ان کی کیا خدمات رہی ہیں؟

جواب: پاکستان کے قیام میں علماء کا کردار دو مرحلوں میں ہے۔

(۱) ایک مرحلہ تو یہ ہے کہ جب یہاں مسلم سلطنت کا خاتمہ ہوا اور انگریزوں نے قبضہ کیا، ایک سو سال تقریباً ایسٹ انڈیا کمپنی اور نوے سال تاجِ برطانیہ، اس انگریزوں کے قبضے کے خلاف آزادی کی جنگ کی قیادت علماء نے کی ہے۔ دوسرے طبقات بھی تھے، سب طبقات نے آزادی کی جنگ لڑی ہے علماء نے بھی اور دوسرے طبقات نے بھی۔ سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، شہدائے بالاکوٹ، سردار احمد خان کھرل شہید پنجاب کے تھے، فقیر ایپی، حاجی صاحب ترنگزئی، حاجی شریعت اللہ، بیسیوں تحریکات ہیں جنہوں نے مسلح بھی اور پھر سیاسی بھی، ایک دور مسلح تحریکات کا تھا، بیسیوں تحریکات ہیں جنہوں نے انگریزی اقتدار کے خاتمے کے لیے جنگ لڑی، اور اس کے بعد سیاسی جدوجہد، آپ دونوں تحریکوں میں علماء کو صفِ اول میں دیکھیں گے۔

(۲) سیاسی جدوجہد کا آغاز تحریکِ خلافت سے ہوا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر احمد، حکیم اجمل خان، شیخ الہند مولانا محمود حسن، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ اور پھر تحریک پاکستان میں جب آپ آئیں گے تو آپ کو قائداعظم کے پیچھے مولانا اشرف علی تھانوی کھڑے نظر آئیں گے اور ان کے ساتھ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبد الحامد بدایونی، مولانا غلام مرشد، مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی دکھائی دیں گے جو صف اول کی قیادت میں شریک تھے اور انہوں نے پاکستان کے قیام کے لیے اس درجے

کی جدوجہد کی، اس وقت میں دو تاریخی حقائق کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔

سلہٹ بنگال کی تقسیم کا جب فیصلہ ہوا اور مشرقی بنگال کو پاکستان میں شامل کرنے کا فیصلہ ہوا تو سلہٹ آسام کا حصہ تھا اور بہت بڑی آبادی ہے۔ تو سلہٹ میں ریفرنڈم کروایا گیا کہ انہوں نے آسام کے ساتھ رہنا ہے یا پاکستان میں شامل ہونا ہے؟ سلہٹ کے اس ریفرنڈم میں عوام کو پاکستان کے حق میں ہموار کرنے میں مولانا ظفر احمد عثمانی اور ان کی ٹیم کا بنیادی کردار ہے جس کو تاریخ آج بھی تسلیم کرتی ہے۔

پھر یہ ہمارا کے پی کے (خیبر پختونخوا) جس کو صوبہ سرحد کہتے تھے، اس وقت یہاں ڈاکٹر خان صاحب کی گورنمنٹ تھی، پاکستان میں شامل ہونے کے لیے وہاں بھی ریفرنڈم کا تقاضا ہوا کہ عوام کی رائے پوچھی جائے وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا کسی دوسری طرف جانا چاہتے ہیں، وہاں پر باقاعدہ ریفرنڈم ہوا اور تاریخ اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ صوبہ سرحد کا ریفرنڈم جیتنے میں بنیادی کردار مولانا شبیر احمد عثمانی اور پیر صاحب آف مانکی شریف کا تھا، یہ دو شخصیتیں ہیں جنہوں نے سرحد کے عوام کو پاکستان کے حق میں تیار کیا اور یہ پاکستان میں شامل ہوئے۔

سوال: یہ بتائیے کہ یہ کلکتہ میں جمعیت علماء اسلام کے نام سے یہ جو جماعت بنی تھی، اس کے بننے کا کیا مقصد تھا؟

جواب: پاکستان کے قیام کے مسئلہ پر تحریک پاکستان کی حمایت کے لیے ’’جمعیت علماء اسلام‘‘ کے نام سے یہ جماعت کلکتہ میں بنی، یہ اس لیے بنی تا کہ علماء کو تحریک پاکستان کے لیے منظّم کیا جائے اور جمعیت علماء اسلام نے بطور پارٹی کے مسلم لیگ کے ساتھ حصہ لیا اور سارے کام میں شریک ہوئے۔

تحریک آزادی میں بھی اور تحریک پاکستان میں بھی علماء کا بنیادی کردار ہے اور تاریخی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم نے کراچی میں پاکستان کا پرچم لہرانے کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی سے کہا اور ڈھاکہ میں پرچم لہرانے کے لیے مولانا ظفر علی عثمانی سے کہا جو ان کی خدمات کا اعتراف تھا۔ تو جس طرح دوسرے طبقات تھے، کسی طبقے کی قربانیوں کا

انکار نہیں ہے، کسی جماعت کی خدمات کا انکار نہیں ہے، لیکن دوسری جماعتوں اور طبقات کے شانہ بشانہ علماء بھی تحریک آزادی میں اور تحریک پاکستان میں قائدانہ کردار کا حصہ رہے ہیں اور یہ تاریخی حقیقت ہے۔

سوال: یہ بتائیے کہ یہ جو لبرل طبقے کی طرف سے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ قائد اعظم پاکستان کو ایک لبرل اور سیکولر کنٹری بنانا چاہتے تھے اور وہ کوئی مذہبی ریاست کا قیام نہیں چاہتے تھے، اس بارے میں کیا کہتے ہیں آپ؟

جواب: پاکستان کے قیام کی بنیاد کیا ہے، بیس کیا ہے؟ کہ ہم مسلمان ہیں، ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے، ہندوؤں کے غلبے کا خطرہ ہے، اس لیے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ بیس مذہبی ہے یا کیا ہے؟ ہم مسلمان ہیں، ایک الگ قوم ہیں، بحیثیت مسلمان ہندو اکثریت کے سائے میں نہیں رہ سکتے، ہماری تہذیب متاثر ہوتی ہے، ہمارا کلچر متاثر ہوتا ہے، تو یہ بیس کیا ہے، اس کو آپ مذہب کے سوا کیا قرار دیں گے؟ پاکستان کے تو قیام کی بیس ہی مذہب ہے کہ وہ ہندو ہیں ہم مسلمان ہیں اور اس بنیاد پر پاکستان کے قیام کا اور ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ ہوا۔

پھر اس کے بعد قائداعظم کی وہ تقاریر (ان کے بارے میں) آپ کیا کہیں گے؟ پاکستان بننے سے پہلے بھی قائداعظم مرحوم نے، لیاقت علی خان مرحوم نے، سردار نشتر نے اور باقی لیڈروں نے جو تقریریں کی ہیں تاریخ کے ریکارڈ پر ہیں کہ ہم پاکستان اسلامی تہذیب کے تحفظ کے لیے، مسلم تہذیب کے بچاؤ کے لیے، اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے، قرآن کریم کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے بنا رہے ہیں، میرا سوال یہ ہے کہ یہ جو تقریریں تحریک پاکستان کے دوران اور پاکستان سے پہلے تھیں آپ اسے کیا کہہ رہے ہیں؟ قائداعظم نے یہ تقریریں سیاسی ووٹ لینے کے لیے کی تھیں؟ میرا بڑا بنیادی سوال ہوتا ہے کہ اگر قائداعظم کے بارے میں آپ یہ تصور رکھتے ہیں کہ انہوں نے مذہب کا نام، قرآن کا نام، سنت کا نام، اور ریاست مدینہ کا نام سب سے پہلے قائداعظم نے استعمال کیا ہے، تو یہ ووٹ حاصل کرنے کے لیے تھا؟ اور اگر قائداعظم نے بھی ووٹ حاصل کرنے کے لیے مذہب کا نام استعمال کیا ہے تو آپ قائداعظم کے بارے میں کیا تاثر دے رہے ہیں کہ وہ

کس کیٹیگری کے لیڈر تھے؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قائداعظم کی توہین ہے، قائداعظم پر اتہام ہے، اور قائداعظم کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی فضا ہے۔

سوال: یہ جو آج کل پاکستان کے معاشی حالات ہیں اس کے تناظر میں ایک اہم سوال ہے کہ قائد اعظم پاکستان میں کس قسم کا معاشی نظام چاہتے تھے؟

جواب: دیکھیے! قائداعظم نے خود اپنی زندگی میں وفات سے ایک مہینہ پہلے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کیا، (ان کی) تقریر اسٹیٹ بینک کے ریکارڈ میں بھی موجود ہے، قومی پریس کے ریکارڈ میں بھی موجود ہے، اور آج بھی چھپتی ہے میرے پاس اس کا متن موجود ہے۔ قائد اعظم نے اسٹیٹ بینک کے افتتاح میں یہ کہا کہ میں پاکستان کے معاشی نظام کو مغرب کے اصولوں پر نہیں اسلام کے اصولوں پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور ساتھ یہ کہا کہ مغرب کے معاشی نظام نے دنیا کو لڑائیوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اور قائداعظم نے یہ کہا کہ میں پاکستان میں اپنے ماہرینِ معیشت سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ مغرب کے اصولوں پر نہیں، اسلام کے اصولوں پر پاکستان میں معیشت کے نظام کو استوار کریں، اور میں آپ کی تحقیقات کے نتائج کا انتظار کرتا رہوں گا۔

یہ کیا ہے؟ یہ قیام پاکستان سے پہلے کی نہیں بعد کی بات ہے اور قائداعظم کی وفات سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ اور بحیثیت گورنر جنرل آف پاکستان اسٹیٹ بینک کے افتتاح کی تقریب کے دوران کی بات ہے، اس کو آپ کہاں لے جائیں گے؟

’’خبرِ واحد‘‘: ایک نوجوان کا سوال

(روزنامہ انصاف، لاہور۔ ۱۵فروری ۲۰۱۸ء)

گزشتہ روز ایک نوجوان نے مجھ سے سوال کیا کہ

کیا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ’’خبرِ واحد‘‘ کی حفاظت کا اہتمام کیا تھا؟

میں نے پوچھا کہ بیٹا آپ کی تعلیم کیا ہے؟ بتایا کہ تھرڈ ایئر کا سٹوڈنٹ ہوں۔ پھر پوچھا کہ دینی تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟ جواب دیا کہ ایک مکتب میں ناظرہ قرآن کریم اور نماز وغیرہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ علمِ حدیث کی کوئی کتاب اردو میں مطالعہ کی ہے؟ جواب دیا کہ نہیں۔ میں نے سوال کیا کہ بیٹا خبرِ واحد کے بارے میں آپ کو کس نے بتایا ہے کہ یہ کیا ہوتی ہے؟ کہنے لگا کہ ٹی وی چینل کے ایک پروگرام میں یہ کہا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبرِ واحد کی حفاظت کا کوئی اہتمام نہیں کیا تھا۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ ایک نوجوان نہیں ہے، اس جیسے ہزاروں نوجوانوں نے یہ بات سنی ہوگی اور الجھن کا شکار ہوئے ہوں گے۔ اس بے چارے نے تو سوال کرنے کی ہمت کر لی ہے ورنہ اس قسم کے کئی نوجوان اسی طرح کی الجھنوں کا شکار ہو کر اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں اور بالآخر ایمان و یقین سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ آج کے دور کی مخصوص تکنیک ہے کہ وہ جدید تعلیم یافتہ حضرات جو دین کی بنیادی تعلیمات سے بے خبر ہوتے ہیں بلکہ انہیں ریاستی نظام تعلیم میں پورے اہتمام کے ساتھ قرآن وسنت کے بارے میں بنیادی معلومات تک سے بے خبر رکھا جاتا ہے، ان کے سامنے علمی نوعیت کے سوالات رکھ کر انہیں کنفیوژ کیا جائے اور پھر انہیں آہستہ آہستہ دین و مذہب کے ٹریک سے اتار دیا جائے۔ یہ تکنیک اور طریق واردات آج کے دور کا ایک بڑا فتنہ ہے جو پوری پلاننگ کے ساتھ نئی نسل کو گھیرے میں لے رہا ہے۔ میرے نزدیک ایسے نوجوان قابل رحم ہوتے ہیں اور کوشش کرتا ہوں کہ محبت پیار کے ساتھ ان کو ان کی ذہنی سطح کے مطابق اصل بات سمجھا

دی جائے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ ''خبرِ واحد'' کیا ہوتی ہے؟

میں نے نوجوان کو بتایا کہ بیٹا خبرِ واحد کا مطلب یہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد یا عمل روایت کرنے والا صرف ایک ہی صحابی ہو۔ تو کیا ایسی روایت قبول کی جائے گی اور وہ شرعاً حجت ہوگی یا نہیں؟ اس پر علمی اور فنی سطح پر محدثین کرام اور فقہاء عظام نے تفصیلی بحث کی ہے اور اس کے مختلف مدارج اور شرائط کا ذکر کیا ہے۔ مگر تمہارے لیے اتنی بات سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ اگر آنحضرتؐ کا کوئی حکم، ارشاد یا عمل صرف ایک صحابی کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا ہے تو کیا ہمارے لیے اس کو مان لینا ضروری ہے یا کسی ''دانشور'' کی بات سن کر اسے نظرانداز کر دیا جائے گا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا جناب نبی کریمؐ نے ایسی باتوں کی حفاظت کا کوئی اہتمام کیا تھا؟

اس سوال کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ جب آنحضرتؐ نے خود اس کا اہتمام نہیں فرمایا تھا تو پھر ہمیں اس کے تردد میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سوال کے دو پہلو ہیں جنہیں الگ الگ دیکھنا ہوگا:

(۱) جہاں تک ''حفاظت کے اہتمام'' کا تعلق ہے وہ تو جناب رسول اللہؐ نے قرآن کریم کے بارے میں بھی نہیں کیا تھا۔ آپؐ مسلسل تئیس سال تک نازل ہونے والے قرآن کریم کی آیات اور سورتیں صحابہ کرامؓ کو سناتے رہے جو ہزاروں لوگوں نے یاد کر لیں، جبکہ رسول اللہؐ نے ان کی ترتیب اور دیگر ضروری امور بھی انہیں سمجھا دیے جس سے سینکڑوں صحابہ کرامؓ قرآن کریم کے حافظ بن گئے۔ مگر قرآن کریم کو کتابی شکل میں جمع کرنے اور تحریری صورت میں محفوظ کرنے کا کام آنحضرتؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے دور میں مکمل کیا گیا۔ اب اگر کوئی صاحب یہ سوال اٹھا دیں کہ کیا نبی کریمؐ نے قرآن کریم کو ایک جگہ جمع کرنے، لکھوانے اور محفوظ کرنے کا اہتمام کیا تھا؟ تو اس کا واقعاتی جواب تو یہی ہوگا کہ جس کو ''جمع و حفاظت کا اہتمام'' کہا جاتا ہے وہ آپؐ کے وصال کے بعد ہوا تھا۔ مگر یہ جواب قرآن کریم کی جمع و حفاظت کے پراسیس سے بے خبر لوگوں کے لیے کس قدر الجھن اور کنفیوژن کا باعث بن سکتا ہے، اس کا اندازہ سوال اٹھانے والے صاحب کو

شاید پوری طرح نہیں ہوگا۔

''خبرِ واحد'' حدیث نبویؐ کی ایک قسم ہے جبکہ احادیث نبویہؐ کی جمع وترتیب اور حفظ و روایت کا بیشتر کام صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور اتباعِ تابعینؒ کے دور میں ہوا تھا جسے امت نے مجموعی طور پر قبول کیا اور محدثین کرام کے اس کام کو ہر دور میں پوری امت کا اعتماد حاصل رہا ہے۔ اس لیے الگ سے یہ سوال اٹھانا کہ کیا نبی اکرمؐ نے خبرِ واحد کی حفاظت کا اہتمام کیا تھا، حدیث وسنت کی حفاظت وروایت کے مجموعی نظام کے بارے میں بے اعتمادی کی فضا پیدا کرنے کے مترادف ہوگا۔

(۲) سوال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا کسی ایک صحابی کی روایت قابل قبول ہے اور شرعاً دلیل بنتی ہے؟

اس پر تفصیل میں جانے کی بجائے بخاری شریف کے ایک مستقل باب کا حوالہ دے دینا کافی ہے جو ''اخبار الآحاد'' کے عنوان سے ہے۔ امام بخاریؒ نے اس میں ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ ایسی احادیث بیان کی ہیں جن سے انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق اس بات پر استدلال کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں کسی ایک صحابی کی روایت بھی قبول کی جاتی تھی اور اسے شرعی دلیل سمجھ کر اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ان میں سے دو تین کا تذکرہ کر دیتا ہوں:

☆ جب قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا اور بیت المقدس کی بجائے مکہ مکرمہ کی طرف نماز میں رخ کرنے کا حکم صادر ہوا تو ایک مسجد میں لوگ سابقہ حکم کے مطابق بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک شخص نے باہر سے دیکھ کر آواز دی کہ قبلہ کا رخ تبدیل کر دیا گیا ہے اور اب ہمارا قبلہ مکہ مکرمہ میں بیت اللہ شریف ہے۔ یہ بات سن کر سب نمازیوں نے نماز کے دوران ہی اپنا رخ مکہ مکرمہ کی طرف موڑ دیا اور اس ایک آدمی کی خبر پر یقین کر کے اس کے مطابق عمل کیا۔

☆ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنے سوتیلے باپ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے گھر میں شراب کی محفل میں لوگوں کو شراب پلا رہا تھا کہ باہر کسی اعلان کی آواز

سنائی دی۔ مجھے کہا گیا کہ باہر جا کر سنو کہ کیا آواز ہے؟ میں نے واپس آ کر بتایا کہ ایک صاحب بتا رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے حرام ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس پر سب لوگوں نے شراب کے پیالے نیچے رکھ دیے اور مجھے ابوطلحہؓ نے کہا کہ یہ ساری شراب باہر گلی میں پھینک دو چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شراب کے حرام ہونے کے بارے میں صرف ایک صاحب کی یہ بات کافی سمجھی گئی اور اس کا اعلان شرعی دلیل قرار پایا۔

☆ جناب نبی اکرمؐ کے سامنے ایک موقع پر دستر خوان پر کھانے کی کچھ اشیاء رکھی گئیں، آپؐ نے ایک چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اندر سے کسی خاتون نے آواز دی کہ یا رسول اللہ! یہ صحرائی جانور گوہ کا گوشت ہے۔ حضورؐ نے یہ سنتے ہی ہاتھ پیچھے کر لیا۔ پوچھا گیا کہ کیا یہ جانور حرام ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ حرام نہیں ہے مگر میں اسے کھانا پسند نہیں کرتا۔ گویا نبی کریمؐ نے ایک عورت کی خبر پر یقین کر کے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ ایک شخص کی خبر بھی دلیل بن جاتی ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔

امام بخاریؒ نے اس قسم کی اور بھی مثالیں دی ہیں اور بتایا ہے کہ بہت سے شرعی معاملات میں ’’خبرِ واحد‘‘ حجت ہے اور اس پر آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کے دور میں عمل ہوتا رہا ہے۔ بلکہ امام بخاریؒ کا اپنا ذوق تو پوری بخاری شریف میں یہ نظر آتا ہے کہ وہ اعتقادات، فرائض، عبادات، حلال و حرام، معاملات اور معاشرت کے دیگر تمام شعبوں میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ احادیث اور آثارِ صحابہؓ کو بھی بطور دلیل پیش کرتے ہیں جن میں سے بیشتر روایات خبرِ واحد ہی کے درجہ کی ہوتی ہیں۔

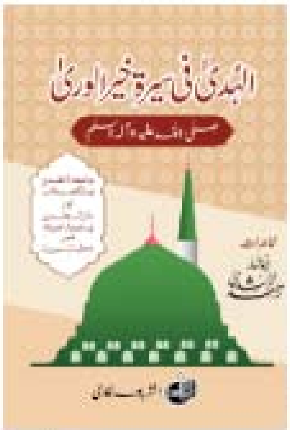
الہدیٰ فی سیرۃ خیر الوریٰ

امام اعظم
ابو حنیفہ
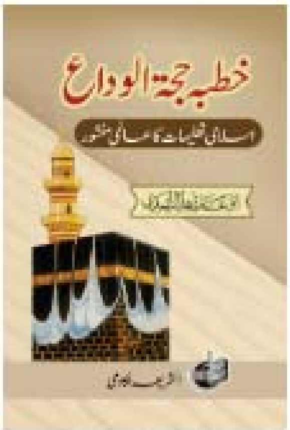
خطبہ حجۃ الوداع
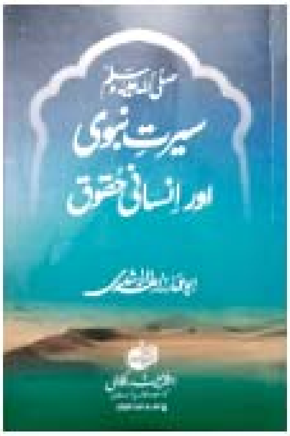
سیرت نبوی
اور انسانی حقوق
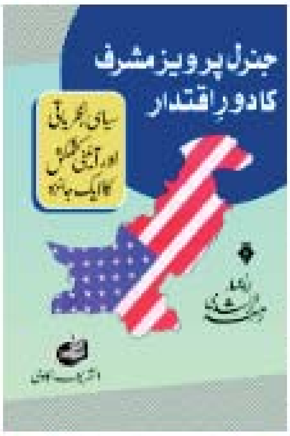
جنرل پرویز مشرف
کا دور اقتدار
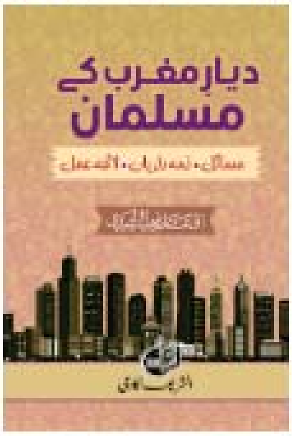
دیار مغرب کے
مسلمان
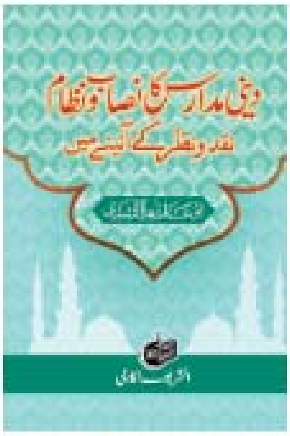
دینی مدارس کا نصاب و نظام
نقد و نظر کے آئینے میں
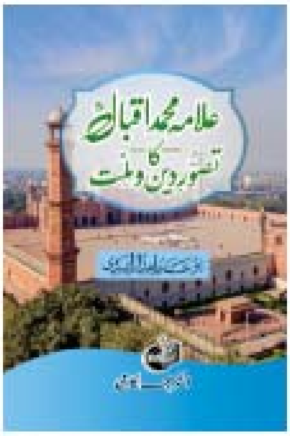
علامہ محمد اقبال
کا
تصور دین و ملت
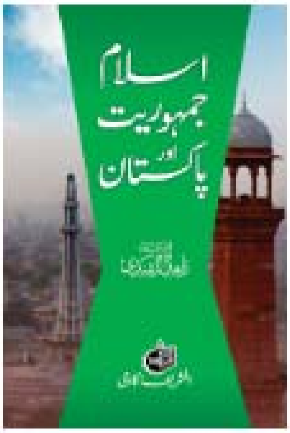
اسلام
جمہوریت
اور
پاکستان
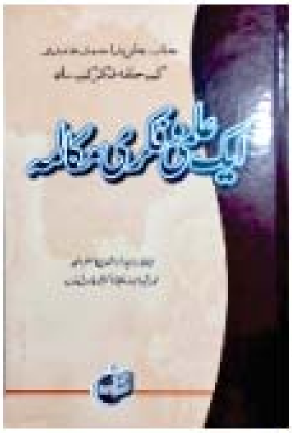
ایک علمی و فکری مکالمہ
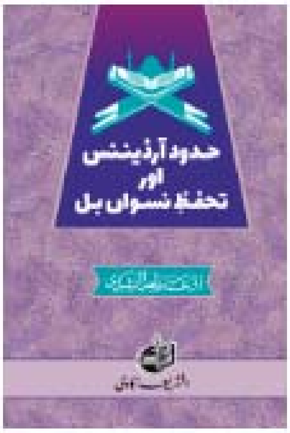
حدود آرڈیننس
اور
تحفظ نسواں بل
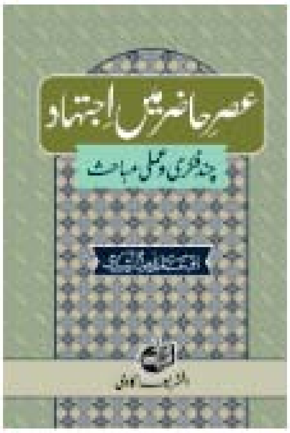
عصر حاضر میں اجتہاد
چند فکری و عملی مباحث
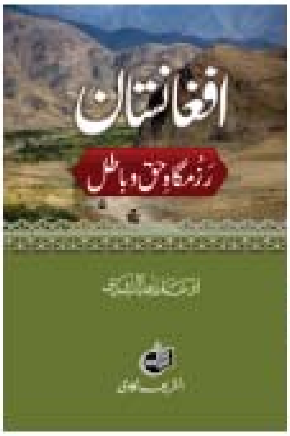
افغانستان
رزمگاہ حق و باطل
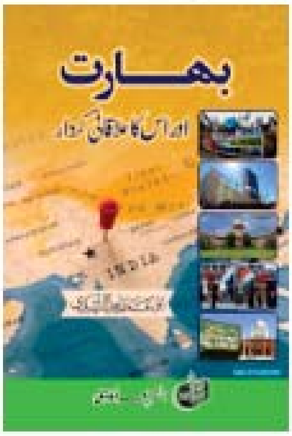
بھارت
اور اس کا علاقائی کردار
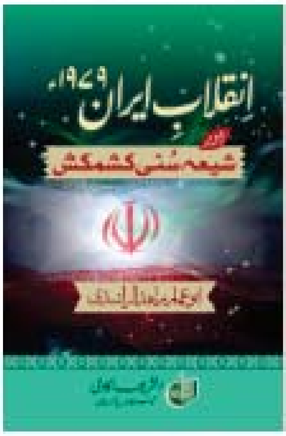
انقلاب ایران ۱۹۷۹ء
اور
شیعہ سنی کشمکش
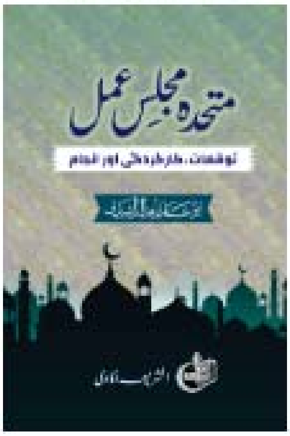
متحدہ مجلس عمل